

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سلسلہ معارف القرآن کی آخری کڑی

جہانِ فردا

جَنِّمِیْن

مکافاتِ عمل۔ موت۔ قبر۔ برزخ۔ حشر۔ نشر۔ قیامت۔ دوزخ اور جنت سے متعلق
قرآنی حقائق کو سامنے لایا گیا ہے!

پیش

شائع کردہ

طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) ۴۵۔ بی۔ گلبرگ۔ لاہور

ب

جُمْلہ حقوق محفوظ

نام کتاب	_____	جہان فردا
مصنف	_____	علامہ غلام احمد پرویز
ناشر	_____	طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)
	_____	۲۵-بی، گلبرگ ۲ لاہور (۵۳۶۶۰)
طالع	_____	دوست ایسوسی ایٹس
مطبع	_____	ایچ۔ وائی پرنٹرز، لاہور
ایڈیشن	_____	اول، اکتوبر ۱۹۶۰ء
	_____	دوم، اگست ۱۹۷۵ء
	_____	سوم، دسمبر ۱۹۸۷ء
	_____	چہارم، نومبر ۱۹۹۲ء

طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)، بی ۲۵، گلبرگ ۲ لاہور

طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) کی شائع کردہ کتب کی
جُمْلہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صرف ہوتی ہے

فہرست مضمولات جہاں فردا

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
	جاسکتا۔		۱۔ فہرست
۱۲	۴۔ دوسروں کو گمراہ کرنے والوں کو دُہرا عذاب ہوگا۔		۲۔ پیش لفظ
۱۳	۵۔ اس قانون سے خدا کا رسول بھی مستثنیٰ نہیں۔		پہلا باب
۱۴	۶۔ عدل کے ترازو۔		قانونِ مکافاتِ عمل
۱۷	۷۔ دوسروں کے اعمال کی ٹوہ میں لگے رہنے کی بجائے		۱۔ ہر عمل کا ایک نتیجہ مرتب ہوتا ہے
	اپنے اعمال کا محاسبہ کرو۔	۱	اور یہ قانون اٹل ہے۔
	۸۔ اسلاف کے اعمال کے متعلق بھی بحث میں نہ اُجھو		۲۔ دو نظریاتِ حیات۔
۲۰	۹۔ آگے صرف "میں" جائے گی۔ "میرا" سب پیچھے	۲	محض طبعی زندگی اور انسانی زندگی۔
	رہ جائے گا۔		۳۔ انسانی زندگی کے لئے قانونِ مکافات
	تیسرا باب	۵	۴۔ اس دنیا میں جنت اور جہنم کی زندگی
	حسابِ کتاب	۸	دوسرا باب
۲۱	۱۔ ہر ایک سے اس کے اعمال کی باز پرس		ہر ایک کو اس کے عمل کا نتیجہ ملتا ہے
	ہوگی۔		۱۔ ہر شخص کو اس کے اپنے کام کا بدلہ ملے گا۔
۲۲	۲۔ انسان اپنا محاسب آپ ہے۔	۹	۲۔ غلط کار اپنے ظلم کرتا ہے۔
	۳۔ جب عمل کا نتیجہ سامنے آجائے	۱۰	۳۔ کسی کام کا نتیجہ دوسرے کی طرف منتقل نہیں کیا
	وہ یوم الحساب ہے۔	۱۱	

۴۷	مہلت کا وقفہ۔	۲۴	۴. اجر "بغیر حساب" کا مفہوم کیا ہے۔
۴۸	۲. مہلت کے وقفہ میں باز آفرینی کا امکان ہوتا ہے۔	۲۵	۵. قوموں کا حساب
	۳. اسی وقفہ کو اجل بھی کہا گیا ہے۔	۲۶	۶. "خدا ذو انتقام ہے" کا مفہوم
۴۹	۴. اسی سے انسان خود فریبی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔		چوتھا باب
۵۰	۵. اس وقفہ کی مدت کا علم کسی کو نہیں ہوتا۔	۲۷	اعمال نامہ
۵۱	۶. اس مدت میں بڑے صبر و استقامت کی ضرورت ہوتی ہے۔	۲۹	۱. پہلا گواہ خود خدا ہے۔
۵۲	۷. یہ چیز "ایمان بالغیب" سے پیدا ہوتی ہے۔	۳۱	۲. تحریری ریکارڈ۔
	۸. قوموں کی صورت میں یہ وقفہ صدیوں کا ہوتا ہے۔		۳. سب کے سامنے کھول دیا جائے گا
			پانچواں باب
۵۳	۹. توبہ سے مفہوم		لقاء رب
۵۴	۱۰. توبہ اسی کی ہے جو اپنی غلطی کا اعتراف کرے۔	۳۳	۱. ملزم کا عدالت خداوندی میں حاضر ہونا۔
	ابلیس و آدم میں فرق۔	۳۴	۲. "الینہ راجعون" کے معنی بھی یہی ہیں۔
۵۶	۱۱. توبہ مایوسی کا علاج ہے۔	۳۶	۳. قانون مکافات سے انکار کرنے والا اپنی باز آفرینی کی طرف مایوس ہوتا ہے۔
۵۷	۱۲. مغفرت کا مفہوم۔	۳۹	۴. یوم التلاق بھی اسی کو کہتے ہیں۔
۵۸	۱۳. پلٹوں کا ہلکا اور بھاری ہونا۔	۴۰	۵. رجعت الی اللہ کے متعلق مزید بحث۔
۵۹	۱۴. عیسائیوں کا "اولین گناہ" کا عقیدہ۔	۴۲	۶. وحدت وجود کا نظریہ غیر شرعی ہے۔
۶۰	۱۵. جہاں اعمال کا مفہوم۔		۷. اِنَّا لِلّٰہِ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ کا مطلب
	۱۶. شرک کسے کہتے ہیں؟		چھٹا باب
۶۲	۱۷. پھر دنیا میں واپسی نہیں ہوگی۔	۴۶	توبہ ————— مغفرت
			۱. عمل اور اس کے نتیجہ کے سامنے آنے میں

۸۳	خواہ مومن ہو خواہ کافر۔ اس کی کوششوں کے نتائج دنیا میں سامنے آجاتے ہیں۔		ساتواں باب
۸۴	۲۔ ایمان و اعمال صالحہ کا لازمی نتیجہ اس دنیا کی سرفرازیاں اور خوشحالیاں ہیں۔	۴۷	یوم الدین
۸۵	۳۔ یہ اس دنیا میں "جنت کی زندگی" ہے۔	۵۰	۱۔ جب نتائج اعمال محسوس طور پر سامنے آجائیں۔
۸۶	۴۔ منافقین کو چیلنج کہ تم ناکام ہو گے اور ہم کامیاب ہوں گے۔	۵۲	۲۔ یہ امتحان کے بعد نتیجہ برآمد ہونے کا دن ہے۔
۸۸	۵۔ ضابطہ قوانین کے صرف ایک حصہ پر عمل کرنے والی قومیں۔ ان کے جھٹے ہیں ذلت و خواری ہوتی ہے۔		۳۔ حسن عمل کے نتائج انسانی آرزوں سے بھی زیادہ۔
۸۹	۶۔ قوموں کی تباہی کی مختلف شکلیں۔		آٹھواں باب
۹۰	۷۔ اقوامِ سابقہ کی تباہی کی شکلیں اور اس کی وجوہات۔	۷۵	عذاب۔ یعنی ہلاکت و تباہی
۹۱	۸۔ قومِ نوح کی تباہی۔	۷۶	۱۔ دنیا میں دو قسم کے معاشرے ایک معاشرہ مستقل اقدار خداوندی کے مطابق دوسرا وہ جو ان اقدار کے مطابق تشکل نہیں ہوتا۔
۹۲	قوم عاد		اس معاشرہ کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔
۹۳	قوم ثمود		(i) جو فطرت کی قوتوں کو مسخر کرتا ہے۔
۹۴	قوم لوط	۷۷	(ii) جو فطرت کی قوتوں کو مسخر نہیں کرتا۔
۹۵	قوم شعیب		ان کی یہاں کی زندگی۔
۹۶	قوم سبا		۲۔ ان کی تباہی کو عذاب کہہ کر پکارا گیا ہے
۹۷	۹۔ تباہی کی دوسری شکل۔	۸۱	نواں باب
			دنیاوی زندگی میں اعمال کی جزا اور سزا
			۱۔ فطرت کی قوتوں کو مسخر کرنے والی قوم۔

	<p style="text-align: center;">گیارہواں باب</p> <p style="text-align: center;">ثواب ————— نجات</p> <p>۱۲۱ ۱۔ ثواب کے معنی کیا ہیں۔</p> <p>۱۲۲ ۲۔ دنیا میں ثواب — زندگی کی خوشگواریاں</p> <p>۱۲۳ ۳۔ ایصالِ ثواب کا نظریہ غلط ہے۔</p> <p>۱۲۳ ۴۔ نجات کا تصور مختلف مذاہب میں۔</p> <p>۱۲۵ ۵۔ قرآنی تصور۔ انسان کا زندگی کی ارتقائی منازل طے کر کے آگے بڑھتے جانا۔</p> <p style="text-align: center;">بارہواں باب</p> <p style="text-align: center;">آخرت کا تصور</p> <p>۱۲۶ ۱۔ لفظ آخرت کے معانی</p> <p>۱۲۷ ۲۔ ”آخرت“ کے مختلف مفہام۔</p> <p style="text-align: center;">ایمان بالآخرت</p> <p>۱۲۹ ۱۔ پانچ اجزائے ایمان</p> <p>ان میں ایمان بالآخرت کی اہمیت</p> <p style="text-align: center;">قیامت</p> <p>۱۳۱ ۱۔ اس لفظ کے معانی۔</p> <p>۱۳۲ ۲۔ کائنات کا ایک دن خاتمہ ہو جانا ہے۔</p> <p>۳۔ لیکن قیامت سے صرف یہی مراد نہیں</p> <p>۴۔ اس زندگی میں بھی قیامت ہے اور مرنے کے بعد بھی۔</p>	<p>کوئی اور مستبد قوم اگر تباہ کر دے۔</p> <p>(بنی اسرائیل کی داستان)</p> <p>۹۸ ۱۰۔ تیسری شکل۔ حق پرست قوم</p> <p>مقابلہ کے لئے اٹھ کھڑی ہو۔</p> <p>۹۹ حق و باطل کا ٹکراؤ۔</p> <p>جماعتِ مومنین کی مثال۔</p> <p>۱۰۳ ۱۱۔ جنت اور جہنم کی زندگی یہیں سے شروع ہو جاتی ہے۔</p> <p>۱۰۴ ۱۲۔ قوموں کی اجل۔</p> <p>۱۰۵ کسی قوم کی تباہی کا وقت الساعۃ کہلاتا ہے یعنی انقلاب کی گھڑی۔</p> <p>۱۰۸ سیروانی الارض۔ اور دیکھو کہ اقوام سابقہ کا انجام کیا ہوا۔</p> <p style="text-align: center;">دسواں باب</p> <p style="text-align: center;">دنیا اور آخرت دونوں میں عذاب</p> <p>۱۱۱ ۱۔ صحیح اعمال سے دنیاوی زندگی کی خوشگواریاں</p> <p>۱۱۲ ۲۔ صرف دنیاوی مفاد چاہنے والے۔</p> <p>۱۱۵ ۳۔ دنیا اور آخرت دونوں میں تباہی۔</p> <p>۴۔ دنیا میں بھوک اور خوف کا عذاب</p> <p>۱۱۶ ۵۔ جس کی دنیاوی زندگی عذاب میں گزرے گی</p> <p>اس کی آخرت بھی خراب ہوگی۔</p> <p>۱۱۸ ۶۔ یَغْفِرُ لِمَن يَشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَن يَشَاءُ کا مفہوم</p>
--	--	--

۱۵۵	۵۔ ینخرج الحی من البیت سے مراد	۱۳۲	۵۔ دنیاوی قیامت (انقلاب) کی خصوصیات
۱۵۶	۶۔ انسانوں کی طبعی موت	۱۳۳	۶۔ رسول اللہ کا عہد ہمایوں قیامت تھا۔
۱۵۷	۷۔ سکرات موت کی ہچکیاں۔	۱۳۵	۷۔ مرنے کے بعد کی قیامت۔
		۱۳۹	۸۔ الی یوم القیامت سے مراد مدت مدید ہے۔
	چودھواں باب		حشر
	مردوں کا زندہ ہونا	۱۴۱	۱۔ حشر کے معنی
۱۵۸	۱۔ انسانی پیدائش کا نظام۔		۲۔ اس دنیا میں حشر۔
۱۶۱	۲۔ انسان، موت کے بعد اس دنیا میں دوبارہ نہیں آسکتا۔	۱۴۲	۳۔ مرنے کے بعد حشر۔
			بعث
۱۶۲	۳۔ موت سے انسانی شعور واپس نہیں آتا۔	۱۴۵	۱۔ اس لفظ کے معانی۔
۱۶۳	۴۔ موت کے بعد کی زندگی کو کس طرح سمجھایا گیا ہے۔	۱۴۶	۲۔ اس دنیا میں بعث
			۳۔ مرنے کے بعد بعث
۱۶۵	۵۔ انسان اپنے شعور و خویش یا انفرادیت کو لے کر آگے جائے گا۔	۱۴۸	نفع صُور
۱۶۶	۶۔ اُس وقت ایک دوسرے کو پہچانیں گے۔		۱۔ اس اصطلاح کے دو معانی
۱۶۸	۷۔ حیاتِ آخرت، قانونِ مکافاتِ عمل کی لازمی کڑی ہے۔		۲۔ جنگ کے بگل
		۱۴۹	۳۔ موت کے بعد نفع صُور
۱۷۰	۸۔ منکرینِ حیاتِ آخری کے اعتراضات اور ان کے جوابات		تیرہواں باب
			حیاتِ نو
۱۷۲	۹۔ انسانی نظام تمدن میں ایمان بالآخرت کا اہم حصہ	۱۵۱	۱۔ مردہ کون ہیں۔ حیاتِ نو سے کیا مراد ہے
۱۷۴	۱۰۔ جن لوگوں میں سمجھنے سوچنے کی صلاحیت نہ ہو یا جن تک خدا کا پیغام نہ پہنچا ہو وہ قابلِ مواخذہ نہیں۔	۱۵۲	۲۔ حیاتِ تازہ کے لئے زراعت کی مثال۔
		۱۵۴	۳۔ اقوامِ مردہ کو حیاتِ نو ملنا۔
			۴۔ جو عقل و فکر سے کام نہ لیں وہ مردہ ہیں۔

۱۹۳	۵۔ لیڈروں اور ان کے متبعین کے جھگڑے۔		
۱۹۴	۶۔ مذہبی پیشواؤں کے ساتھ جھگڑے۔		
۱۹۵	۷۔ اہل جنت اور اہل جہنم کی باہمی گفتگو۔		
	۸۔ اہل جہنم کا تائیف۔	۱۷۷	
۱۹۶	۹۔ لیکن یہ تائیف لا حاصل ہوگا کیونکہ وہاں سے واپسی نہیں ہو سکے گی۔		
۱۹۷	۱۰۔ وہاں موت نہیں آئے گی۔	۱۷۹	
۱۹۸	۱۱۔ "اقوام" سے کیا مراد ہے جو جہنم میں جائیں گی۔	۱۸۲	
	ستر ہواں باب		
	شفاعت		
۱۹۹	۱۔ شفاعت کا نظریہ، قانون مکافاتِ عمل میں فٹ بیٹھ ہی نہیں سکتا۔	۱۸۲	
۲۰۱	۲۔ کسی کی سفارش کام نہیں دے گی۔	۱۸۴	
۲۰۲	۳۔ شفاعت کا صحیح مفہوم		
	اٹھارہواں باب		
	آخری عذاب کا تعارف		
۲۱۰	۱۔ عذاب کے معنی	۱۸۷	
	عذاب الجحیم		
۲۱۱	زندگی کی ترقی کا رک جانا۔ جمود طاری ہو جانا۔		
	عذاب مہین	۱۹۱	
۲۱۲	ذلت آمیز تباہی	۱۹۳	
	پندرہواں باب		
	برزخ		
	۱۔ دوبارہ زندگی قیامت کے دن ہوگی۔		
	اس لئے مرنے اور قیامت کو دوبارہ زندہ ہونے کے درمیان زندگی نہیں۔		
	۲۔ شعورِ خویش ہی کا نام زندگی ہے۔		
	۳۔ مردے کو اس دنیا سے کوئی تعلق نہیں رہتا۔		
	۴۔ مردہ ہماری کوئی بات سن نہیں سکتا، نہ ہی جواب دے سکتا ہے۔		
	۵۔ مقتولین فی سبیل اللہ (شہداء) کی حیات سے مطلب۔		
	۶۔ اخروی زندگی میں شعور کی سطح موجودہ سطح سے مختلف ہوگی۔		
	سولہواں باب		
	انقلاب عظیم کی تفصیلات		
	۱۔ الفاظ کے حقیقی اور مجازی معانی		
	۲۔ عظیم تغیرات کی تفصیل (اشیائے کائنات سے متعلق)۔		
	۳۔ خود انسانوں سے متعلق		
	۴۔ اقوام سے متعلق۔		

۲۳۵	جہنم کی تفصیل	۲۱۳	عذابِ عظیم
۲۳۹	اس جہنم سے کوئی کسی کو بچا نہیں سکے گا۔		اس دنیا کے عذاب کے مقابلہ میں وہاں کا
۲۴۱	جہنم کس کے لئے ہے		عذاب بہت زیادہ ہوگا۔
	وہ جرائم جن کی وجہ سے انسان جہنم میں جاتا ہے۔	۲۱۳	عذابِ مقیم
۲۴۳	۱۔ عقل و فکر سے کام نہ لینے والے۔		وہ عذاب وقتی یا ہنگامی نہیں ہوگا۔
۲۴۵	۲۔ جذبات کو خدا بنا لینے والے۔	۲۱۴	عذابِ النار
۲۴۶	۳۔ تقلیدِ آباء کرنے والے۔		وہ آگ جس کے شعلے دلوں کو پیٹ لیتے ہیں
	۴۔ باطل پرست مذہبی پیشوا۔	۲۱۵	عذابِ الیم
	۵۔ حیاتِ آخروی کے منکر۔		کرب و اذیت کا درد انگیز عذاب
۲۴۸	۶۔ دیگر اقسام		انیسواں باب
۲۵۰	کفار۔ مرتدین۔ مشرکین۔ کاذبین۔ منافقین		جہنم
	اسلامی نظام سے سرکشی برتنے والے ہجرین	۲۱۶	۱۔ لفظ جہنم کے معنی
	باطل پرست علماء اور مشائخ۔ سرمایہ دار۔	۲۱۸	۲۔ جہنم ان لوگوں کے لئے ہے جن میں
	دین فروش۔ دوسروں کے رزق کا سامان نہ		غلط اور صحیح کے امتیازی خطوط کو
	کرنے والے۔ صلوٰۃ کی حقیقت سے غافل		سمجھنے کی صلاحیت ہو اور وحی کی تعلیم
	نمازی۔ رزق کے چشموں کو روک کر بیٹھ رہنے		ان کے سامنے آچکی ہو۔
	والے۔ میدانِ جہاد سے پیٹھ دکھا کر بھاگ	۲۲۱	۳۔ دنیا میں جہنم اور اس کی مختلف شکلیں۔
	جانے والے۔ مومن کو عمدۂ اقل کرنے والا۔	۲۳۱	۴۔ جہنم قلبی کیفیت کا نام ہے۔
۲۵۶	۷۔ جہنم میں لیڈروں اور ان کے متبعین کی گفتگو۔	۲۳۲	انسان خود جہنم کا ایندھن ہیں۔
۲۶۱	۸۔ اہل جنت اور اہل جہنم کی گفتگو۔	۲۳۳	۵۔ اس وقت جہنم نگاہوں سے پوشیدہ
۲۶۲	۹۔ اہل اعراف۔		ہے اُس وقت بے نقاب
۲۶۳	۱۰۔ عذابِ جہنم ابدی ہے۔		ہو جائے گی۔

۲۹۰	۹. مختلف علوم و فنون کی مرقع	۲۹۶	۱۱. ابدیت کا مفہوم کیا ہے ؟
۲۹۱	آرٹ اور موسیقی کے شاہکار		
۲۹۱	۱۰. نہ خوف نہ حسرت		
۲۹۳	۱۱. یہ صرف اعمال کے بدلے میں ملے گی۔	۲۹۹	جنت
	<u>جنت کس کے لئے ہے ؟</u>	۲۶۰	۱. جنتِ آدم۔ جنتِ ارضی۔ جنتِ اخروی۔
		۲۶۱	۲. جنت کا بیان تمثیلی ہے۔
۲۹۵	۱. اعمالِ صالحہ کا نتیجہ۔	۲۶۳	۳. جنتِ آدم
۲۹۶	متقین۔ محسنین کے لئے	۲۶۶	۴. جنتِ ارضی
۲۹۶	۲. جہادِ مسلسل سے۔		ایمان و اعمالِ صالح کے نتیجے میں اس
۳۰۱	<u>ابدی جنت</u>		دنیا میں جنت کی زندگی۔
۳۰۲	۱. جنت کی ابدیت سے مراد	۲۸۰	۵. جس کی یہاں روزی تنگ ہے وہ قیامت میں
۳۰۳	۲. جنت مقامِ راہ ہے۔ آخری منزل	۲۸۲	بھی اندھائی اٹھے گا " اس کا مفہوم
	نہیں۔	۲۸۳	۶. جنت کی تفصیل۔
۳۰۴	۳. اخروی جنت اس کے لئے جس کی موجودہ	۲۸۵	چند اصطلاحات کا مفہوم۔
	زندگی بھی جنت کی ہو۔	۲۸۶	۷. جنتِ نگاہ و فردوسِ گوش
		۲۸۹	ہر قسم کا سامانِ آرائش و آسائش
			۸. ازواجِ مطہرات

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

پیش لفظ

میری زندگی کا مقصد و غنہی قرآن کریم کو سمجھنا اور جو کچھ میں سمجھ سکوں اُسے دوسروں تک پہنچانا ہے۔
سلسلہ ”معارف القرآن“ میری اسی کوشش کا ایک گوشہ ہے جسے میں نے آج سے تیس سال پہلے شروع کیا تھا۔ اس سلسلہ کی اس وقت تک حسب ذیل تصانیف شائع ہو چکی ہیں۔

(۱) من ویزداں — خدا کا قرآنی تصور۔ خدا اور بندے کا تعلق۔

(۲) ابلیس و آدم — آدم، انسان، ابلیس، ملائکہ، وحی و رسالت کے متعلق قرآنی تصورات۔

(۳) جوئے نور — حضرت نوح سے حضرت شعیب تک کے انبیاء کرام کا تذکرہ جلیلہ۔

(۴) برقی طور — صاحب ضرب کلیم اور مستبد قوتوں کے نمائندوں کی آویزش۔ داستان بنی اسرائیل۔

(۵) شعلہ مستور — حضرت عیسیٰ کے کوائف حیات۔

(۶) معراج انسانیت — صاحب قرآن علیہ التحیۃ والسلام کی سیرت طیبہ قرآن کے آئینے میں۔

(۷) انسان نے کیا سوچا؟ — وحی کی روشنی کے بغیر تنہا عقل انسانی نے زندگی کے اہم مسائل کے متعلق

کیا سوچا اور اس کا نتیجہ کیا نکلا؟

(۸) اسلام کیا ہے — قرآن کریم کے تجویز کردہ دین کا عملی نظام۔

ان کے علاوہ کتاب التقدیر لغات القرآن اور مفہوم القرآن کو بھی اسی سلسلہ کی کڑیاں سمجھنا چاہیے جو میرے

نزدیک، مطالب فرقان کو براہ راست سمجھنے کے سلسلہ میں بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔

اس سلسلہ کی آخری کڑی کا تعلق حیاتِ آخرت سے تھا۔ اس کی اہمیت کا مجھے خود بھی احساس تھا اور

میری قرآنی فکر سے دبستگی رکھنے والے احباب کے پیہم تقاضے اس احساس کو اور بھی شدید کئے جاتے تھے۔

لِلّٰهِ الْحُكْمُ کہ میں اس فریضہ کی ادائیگی سے بھی سبکدوش ہو رہا ہوں۔ وَذَٰلِكَ فَعَلُوْا اللّٰهُ يُؤْتِيْهِ مَن يَّشَاءُ !

جیسا کہ ظاہر ہے، اخروی زندگی اور اس کے تضمینات کا تعلق مابعد الطبیعیات سے ہے اس کی کتب و حقیقت کو ہم اپنے شعور کی موجودہ سطح پر عالم محسوسات کے مظاہر کی طرح سمجھ نہیں سکتے۔ قرآن کریم نے ان حقائق کو تشبیہات و استعارات کے رنگ میں بیان کیا ہے۔ اور اسی انداز سے یہ بیان بھی کئے جاسکتے تھے۔ تشبیہات کو انسانی علم کی عام سطح اور ان پر غور کرنے والے کی فکری صلاحیت کے مطابق سمجھا جاسکتا ہے اور ظاہر ہے کہ جن حقائق کو اس طرح سمجھا جاتے ان کے مفہوم کو نہ تو حرف آخر قرار دیا جاسکتا ہے اور نہ ہی وہ کسی کے لئے سند و حجت بن سکتے ہیں۔ میں نے قرآن کریم میں بیان کردہ مجرد حقائق کو اسی انداز سے سمجھا ہے اور میری قرآنی فکر کی وہی حیثیت ہے جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اپنی قرآنی فکر کو دوسروں کے سامنے پیش کرنے سے میرا مقصد یہ ہے کہ وہ قرآن کریم کے قریب آئیں اور اس پر از خود غور و فکر کریں۔ وہ اس طرح تدبیر فی القرآن سے اگر کسی ایسے نتیجہ پر پہنچیں جو میری فکر سے مختلف ہے تو نہ صرف یہ کہ مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا بلکہ میں ان حقائق پر دوبارہ غور کروں گا۔

مبداء فطرت کی فیض گسٹری نے قرآنی فکر کے عام کرنے میں میری کوششوں کو جس قدر بار آور کیا ہے اس کے لئے میں ہر سانس میں بدرگاہ رب العزت سجدہ ریز ہوں۔ جب میں نے اس آواز کو پہلے پہل بلند کیا ہے تو مجھے کہیں کوئی اپنا ہم نوا دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اور آج بفضل ایزدی شاید ہی کوئی قریہ یا دیار ایسا ہو جہاں اس فکر کے ہمنوا موجود نہ ہوں۔ اسی کا اثر ہے کہ ہمارا مذہب گزیدہ نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ، علی الصغر قرآنی حقائق کے قریب تر آ رہا ہے۔ یہ سب خدا کی اس کتاب عظیم کا اعجاز ہے۔

میں اب زندگی کی ندی میں اس مقام پر پہنچ رہا ہوں جہاں اگلا کنارہ نزدیک تر نظر آ رہا ہے۔ میری دلی آرزو ہے کہ زندگی کے باقی دن بھی اسی مقصد کی تکمیل میں گزر جائیں جسے میں نے اپنا مقصود و حیات قرار دے رکھا ہے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ

وَالسَّلَامُ

پروریز

۲۵ بی، گلبرگ ۲، لاہور

اکتوبر ۱۹۶۹ء

باب اول

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

قانون مکافات عمل

دین کا سارا نظام 'قانون مکافات عمل' کی بنیادوں پر استوار ہوتا ہے۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ سارا نظام کائنات ہی اسی محور کے گرد گردش کرتا ہے۔ قانون مکافات عمل کے معنی یہ ہیں کہ ۱۔

(۱) خدا نے ہر کام کا ایک متعین نتیجہ مقرر کر رکھا ہے۔ مثلاً اگر آگ پر پانی کی دیکھی رکھ دی جائے تو کچھ وقت کے بعد پانی گرم ہو جائے گا اور پھر کھولنے لگے گا یا اگر ایک خاص مقدار میں سنکھیا کھا لیا جائے تو انسان مرجائے گا۔ یہ خدا کا مقرر کردہ قانون ہے۔

(۲) انسان کا ہر عمل اپنا نتیجہ پیدا کر کے رہتا ہے۔

یہ قانون اٹل ہے جس میں کبھی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ سُنَّةَ اللَّهِ الَّتِي قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ ۖ وَ لَنْ تُجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا ۝ (۲۸/۲۳ ذ ۴۴/۱۷ ذ ۳۵/۳۳) اسی کو قَدْ رَأَى مَقْعُودُ دُرٍّ (۳۳/۳۸) کہا گیا ہے۔ یعنی خدا کے مقرر کردہ پیمانے، انہی پیمانوں کو عام اصطلاح میں قوانین خداوندی کہا جاتا ہے۔

جب یہ کہا جائے کہ خدا کے قوانین میں تبدیلی نہیں ہوتی تو عام ذہنی سطح کے لوگوں کی طرف سے اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس سے خدا کے قادر مطلق ہونے کی نفی ہوتی ہے۔ وہ اسی صورت میں قادر مطلق قرار پاسکتا ہے جب یہ سمجھا جائے کہ وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ خدا سب کچھ کر سکتا ہے۔ لیکن جب اس نے خود اپنی مشیت اور اپنے اختیار و ارادے سے کچھ قوانین وضع کر دیئے اور اس کے بعد کہہ دیا کہ یہ قوانین اٹل ہیں ہم ان کے خلاف نہیں کریں گے، تو اس سے اس کے قادرِ مطلق ہونے پر حرف نہیں آتا۔ اس نے خود اپنے اوپر ایک پابندی عائد کی ہے جسے وہ توڑ توڑ سکتا ہے لیکن وہ اسے توڑتا نہیں۔ اس کے قادرِ مطلق ہونے پر حرف اس صورت میں آسکتا تھا کہ کوئی دوسرا اُس پر کوئی پابندی عائد کر دیتا۔ خود عائد کردہ پابندی کا نہ توڑنا تو اصول پرستی کہلاتا ہے۔ اسی کو خدا نے ”اپنے وعدے“ سے تعبیر کیا ہے اور کہا ہے کہ **إِنِّ دَعَدَ اللّٰهُ حَقًّا** (۲۸/۱۳) خدا کا وعدہ حق ہے۔ اور **إِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيعَادَ** (۳/۸) خدا وعدہ خلافی کبھی نہیں کرتا جتنی کہ اس نے بعض مقامات پر اپنے اوپر خود عائد کردہ پابندی کو اس قسم کے الفاظ میں بھی بیان کیا ہے کہ **كَتَبَ عَلٰی نَفْسِهِ الرِّحْمَةَ** (۱۶/۱۲) اس نے اپنے اوپر رحمت کو واجب قرار دے رکھا ہے یا **مَثَلًا كَذٰلِكَ حَقًّا عَلَيْنَا مَثَلُ الْـمُؤْمِنِينَ** (۱۰/۱۰۳) مومنین کو تباہی سے محفوظ رکھنا ہم پر فرض ہے۔ مقصد ہمارے کہنے کا یہ ہے کہ جو پابندیاں خدا نے خود اپنے اوپر عائد کر رکھی ہیں ان سے اس کے قادرِ مطلق ہونے پر حرف نہیں آتا بلکہ یہ تو خود اس کے قادرِ مطلق ہونے کی دلیل ہے۔ اس لئے جو قوانین اس نے مقرر کر رکھے ہیں ان کے غیر تبدیل ہونے سے خدا کے قادرِ مطلق ہونے پر حرف نہیں آتا۔ اس کے اپنے مقرر کردہ قوانین ہیں جن میں وہ تبدیلی نہیں کرتا۔ قانونِ مکافاتِ عمل بھی اس کا مقرر کردہ اٹل قانون ہے۔ اس نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ یہ تمام سلسلہ کائنات اس لئے سرگرم عمل ہے کہ ہر ایک کو اس کے کام کا نتیجہ مل جائے (۲۲/۴۵ : ۳۱/۵۳)۔

طبعی کائنات میں قانون کی کارفرمائی

طبعی کائنات کا یہ محیر العقول نظام، اسی قانونِ مکافات کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ انہیں علم اصطلاح میں قوانینِ فطرت کہا جاتا ہے۔ کائنات کی کسی شے کو ان قوانین کی اطاعت سے محالِ سترابی نہیں (۴۹۱۔ ۵۰/۱۶)۔ چونکہ یہ سوال ہمارے زیرِ نظر موضوع سے متعلق نہیں — ہمارا موضوع صرف انسانی دنیا سے متعلق ہے — اس لئے ہم اس کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتے۔

انسانی دنیا میں قانون مکافات

انسانی زندگی کے دو حصے ہیں۔ ایک حصہ اس کی طبعی زندگی کا ہے جو خدا کے مقرر کردہ طبعی قوانین کے تابع ہے۔ اس میں انسان اور حیوان ایک سطح پر ہوتے ہیں۔ کھانا، پینا، سونا، جاگنا، صحت، بیماری اور بالآخر موت۔ سب طبعی قوانین کے مطابق طے پاتے ہیں۔ اس میں انسان کے اختیار و ارادہ اور علم کی بھی شرط نہیں۔ مثلاً ایک شخص آگ میں انگلی ڈالتا ہے اس کی انگلی جل جائے گی اور اسے سخت تکلیف ہوگی۔ اس کے لئے:

(۱) یہ ضروری نہیں کہ انسان کو اس کا علم ہو کہ آگ میں انگلی جل جاتی ہے تو انگلی جلے اور اگر اس کو اس کا علم نہ ہو تو انگلی نہ جلے۔

(۲) نہ ہی یہ ضروری ہے کہ انسان اپنے ارادے اور فیصلے سے انگلی ڈالے تو انگلی جلے اور اگر کوئی دوسرا شخص اس کی انگلی زبردستی آگ میں ڈال دے تو انگلی نہ جلے۔

اور یہ قانون اس قدر اٹل ہے کہ ہو نہیں سکتا کہ انگلی میری جلے اور درد کسی کو ہونے لگے۔ نہ ہی یہ ممکن ہے کہ کوئی میرے درد میں سے کچھ حصہ لے لے اور میری تکلیف میں تخفیف ہو جائے۔ نہ ہی یہ ممکن ہے کہ کسی کی سفارش پر درد مٹ جائے یا میں رشوت دے کر نجات حاصل کر لوں۔ اس تکلیف سے نجات حاصل کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ جس خدا نے یہ قانون بنایا ہے کہ آگ میں انگلی ڈالنے سے وہ جل جاتی ہے اسی نے یہ قانون بھی مقرر کر دیا ہے کہ جلی ہوئی انگلی پر فلاں دوائی لگائی جائے تو اسے آرام آجائے گا۔ یعنی جس نے خدا کے ایک قانون کی خلاف ورزی کر کے اپنی انگلی جلا لی ہے اب اسے خدا کے دوسرے قانون کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ (اسے انابت الی اللہ کہا جاتا ہے)۔ پہلے قانون کی خلاف ورزی کے نتیجے میں درد کا پیدا ہونا اگر عدل ہے تو خدا کا دوسرا قانون جس کی اطاعت سے اس درد سے نجات مل سکتی ہے اس کی رحمت ہے۔ (رحم MERCY) کا یہی تصور قرآنی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ عدل اور رحمت سے متعلق یہ دونوں قوانین ہر انسان کے لئے یکساں ہیں۔ ان میں مومن و کافر کی بھی کوئی تمیز نہیں۔ اس باب میں تو بلکہ انسان اور حیوان میں بھی کوئی تفریق نہیں۔ طبعی قوانین کا سب پر یکساں اطلاق ہوتا ہے۔

انسانی زندگی

لیکن انسان کی زندگی محض طبیعی (یا حیوانی) زندگی نہیں۔ اس کی ایک زندگی 'حیوانی سطح سے اوپر' انسانی زندگی بھی ہے۔ اس مقام پر ہمارے سامنے دو نظریات حیات آتے ہیں۔ ایک نظریہ یہ ہے کہ انسان کی زندگی ہے تو طبیعی زندگی ہی، لیکن چونکہ یہ مدنی الطبع واقعہ ہوا ہے اس لئے اس کی زندگی انفرادی نہیں، اجتماعی ہے۔ یعنی اس نے معاشرہ (یا سوسائٹی) کے ایک فرد کی حیثیت سے زندگی بسر کرنی ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ایسے قوانین وضع کئے جائیں جن سے معاشرہ کے مختلف افراد کے مفاد میں ٹکراؤ نہ ہو اور سب امن و چین اور خوشحالی و فارغ البالی کی زندگی بسر کریں۔ اس مقصد کے لئے سوسائٹی کچھ قوانین و ضوابط مرتب کرتی ہے جن کی پابندی سب افراد کے لئے ضروری ہے۔ جو ان قوانین کو توڑتا ہے، معاشرہ اسے مجرم قرار دے کر 'قانون شکنی' کی سزا دیتا ہے اسے معاشرہ کا نظام عدل کہا جاتا ہے۔ یہ بھی درحقیقت قانون مکافات عمل ہی کی ایک شکل ہے لیکن اس میں اور طبیعی قوانین میں کچھ فرق ہے اور وہ فرق بڑا اہم ہے۔ معاشرہ کے نظام عدل کی رو سے یہ ہو سکتا ہے کہ

(۱) ایک شخص قانون شکنی کرے لیکن نظام عدل کی گرفت میں نہ آئے۔

(۲) گرفت میں آئے بھی تو کسی نہ کسی طرح اپنے جرم کی سزا پانے سے بچ جائے۔ رشوت سے

سفارش سے، فریب دہی سے..... (وغیرہ وغیرہ)۔

جو شخص اس طرح قانون شکنی کی سزا سے محفوظ رہ جائے اس میں اور اس شخص میں جس نے قانون شکنی نہیں کی تھی کوئی فرق نہیں رہتا۔ دونوں 'سوسائٹی کی نگاہ میں یکساں' مملکت کے پُر امن شہری ہوتے ہیں۔ اور جب معاشرہ میں قانون شکنی عام ہو جائے تو قانون شکن 'ان لوگوں کے مقابلہ میں جو قانون کی پابندی کرتے ہیں' زیادہ مزے میں رہتے ہیں کیونکہ یہ جائز اور ناجائز ہر طریق سے مفاد حاصل کر لیتے ہیں اور عیش کی زندگی بسر کرتے ہیں۔

دوسرا نظریہ زندگی

اس کے برعکس 'دوسرا نظریہ زندگی یہ ہے کہ انسان کی زندگی محض طبیعی زندگی نہیں۔ اس میں حیات

طبعی کے علاوہ ایک اور شے بھی ہے جسے انسانی ذات کہا جاتا ہے۔ انسان کے ہر عمل کا اثر اس کی ذات پر پڑتا ہے۔ اچھے کام کا اچھا اثر، بُرے کام کا بُرا اثر۔ اس اثر (یا نتیجہ) سے انسان اپنی کاریگری یا پُرکاری سے بچ نہیں سکتا۔ اس کے لئے نہ کسی دیکھنے والے کی ضرورت ہوتی ہے نہ گرفتار کرنے والے کی حاجت۔ نہ کسی دنیاوی عدالت کے فیصلے کی ضرورت پڑتی ہے نہ اس فیصلہ پر عمل کرانے والی انتظامیہ کی حاجت۔ یہ نتیجہ اسی طرح از خود مرتب ہو جاتا ہے جس طرح آگ میں انگلی ڈالنے سے انگلی جل جاتی ہے۔ انسان کی طبعی موت کے ساتھ اس کی ذات کا خاتمہ نہیں ہو جاتا۔ اس کی ذات ان اثرات کو لئے ہوئے جو اس پر عسّر بھر مرتب ہوتے رہے تھے مرنے کے بعد آگے بڑھتی ہے اور جس قسم کے اثرات کا مجموعی پلاٹا بھاری ہو اس کے مطابق اس کا مستقبل متشکل ہوتا ہے۔ اس نظریہ زندگی کا نام دین ہے۔

دین بھی ایک معاشرہ متشکل کرتا ہے کیونکہ معاشرہ سے باہر (ایک فرد کی تجربیدی زندگی میں) یعنی ایسی زندگی میں جس میں اسے کسی دوسرے انسان سے معاملہ نہ پڑے، اچھے اور بُرے کام کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس سے ظاہر ہے کہ دین انسانی زندگی کے لئے جو قوانین دیتا ہے ان کا اثر بھی معاشرہ پر پڑتا ہے۔ لیکن ان کا اثر صرف معاشرہ پر ہی نہیں پڑتا۔ ان کا اثر خود اس فرد کی ذات پر بھی پڑتا ہے جو ان کا اتباع کرتا ہے یا ان کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ مثلاً

(۱) ایک شخص کسی کے ہاں چوری کرنے کا ارادہ کرتا ہے لیکن اس کا اُسے موقع نہیں ملتا۔ یہ شخص معاشرہ کے نظامِ عدل کی رُو سے مجرم نہیں قرار پائے گا لیکن اس کی اس نیت (ارادہ) کا اثر اس کی ذات پر مرتب ہو جائے گا۔

(۲) وہ شخص چوری کرتا ہے لیکن معاشرہ کے نظامِ عدل کی گرفت میں نہیں آتا یا کسی اور طریق سے سزا سے بچ جاتا ہے۔ اسے معاشرہ کی رُو سے اس کے کئے کی سزا نہیں ملے گی، لیکن اس کی ذات پر اس کا اثر مرتب ہو جاتا ہے۔

(۳) اگر اس شخص کو اس کے جرم کی سزا مل جائے تو معاشرہ کے نظامِ عدل کی رُو سے وہ اس کے بعد اس جرم کا مجرم متصور نہیں ہوگا۔ لیکن اس کا جو اثر اس کی ذات پر مرتب ہوا تھا اس سزا سے وہ اثر زائل نہیں ہوتا۔

(۴) اسی کی ذات پر مرتب شدہ اثر اس قانونِ خداوندی کی طرف رجوع کرنے سے زائل ہوگا جو اس

مقصد کے لئے مقرر کیا گیا ہے۔

(۵) اگر اس نے اس طرح اُس اثر کو زائل نہیں کیا، تو وہ اثر مرنے کے بعد اس کے ساتھ جائے گا۔

اس سلسلہ میں دو اور باتوں کا سمجھ لینا بھی ضروری ہے۔ ایک یہ کہ انسانی ذات پر صرف انہی اعمال کا اثر مرتب ہوگا جن کے صحیح یا غلط ہونے کا اسے علم تھا۔ اگر ایک شخص تک یہ قانون پہنچا ہی نہیں یا اس کی ذہنی سطح ایسی نہیں جس سے وہ ان امور کو سمجھ سکے، تو اس کی ذات پر ایسے اعمال کا اثر مرتب نہیں ہوگا۔ دوسرے یہ کہ اگر اس سے ایسا کام (صحیح یا غلط) مجبوراً کرایا گیا ہے تو پھر بھی اس کا اثر اس کی ذات پر مرتب نہیں ہوگا۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا (۲/۲۸۶) تو اس کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ ایک شخص اپنے انہی اعمال کا ذمہ دار ہے جنہیں اس نے اپنے علم اور ارادے سے انجام دیا تھا۔

اب آپ افراد سے آگے بڑھ کر معاشرہ (یا اقوام) کی طرف آئیے۔ اس سلسلہ میں اس بنیادی نکتہ کا سمجھ لینا ضروری ہے کہ دین نام ہے فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے ان کے حاصل کو قوانینِ خداوندی کے مطابق تمام نوعِ انسانی کی منفعت کے لئے صرف کرنے کا۔ فطرت کی قوتیں خدا کے مقرر کردہ طبیعی قوانین کے مطابق عمل کرنے سے مسخر ہوں گی۔ اور ان کے صحیح استعمال کے لئے ان قوانین کی ضرورت ہوگی جنہیں ہم نے ”انسانی زندگی“ سے متعلق بتایا ہے۔ انہیں ہم (طبیعی قوانین سے متمیز کرنے کے لئے) مستقل اقدار کی اصطلاح سے تعبیر کریں گے۔ اس سے واضح ہے کہ

(۱) جو قوم طبیعی قوانین کے مطابق تسخیرِ فطرت نہیں کرتی اس کی دنیاوی زندگی خوشحال نہیں ہو سکتی۔ اور جب اس نے فطرت کی قوتوں کو مسخر نہیں کیا تو انہیں مستقل اقدار کے مطابق صرف کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔ لہذا وہ قوم دین کے مطابق زندگی بسر نہیں کر سکتی۔ اس قوم کی یہ زندگی بھی تاریک ہوگی اور مستقبل کی زندگی بھی تاریک۔

لیکن اگر اس قوم میں ایسے افراد ہیں جو اس بیچ زندگی سے مطمئن نہیں اور وہ کوشش کرتے ہیں کہ نظامِ معاشرہ میں ایسی تبدیلی پیدا ہو جائے جس سے وہ دین کے تقاضوں کے مطابق زندگی بسر کر سکیں، تو ان افراد کی موجودہ دنیا کی زندگی تو بالعموم مصائبِ تکالیف میں گریگی لیکن ان کی اگلی زندگی تابناک ہوگی۔

(۲) جو قوم فطرت کی قوتوں کو مسخر کرتی ہے لیکن انہیں مستقل اقدار کے مطابق صرف نہیں کرتی، اسے اس دنیا میں سامانِ زیست کی فراوانیاں حاصل ہو جائیں گی لیکن اس کے افراد کی اخروی زندگی تاریک ہوگی۔

ہاں اگر اس قوم میں ایسے افراد ہیں جو نظامِ معاشرہ کو مستقل اقدار پر متشکل کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو ان افراد کی حیاتِ آخرت درخشندہ ہوگی۔

(۳) جو قوم فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے انہیں مستقل اقدار کے مطابق صرف کرتی ہے، اس کی حال کی زندگی بھی درخشندہ ہوتی ہے اور آخرت کی زندگی بھی تابندہ۔ یہ قوم اسلامی نظام کی حامل کہلائے گی۔ البتہ ان میں جو افراد ایسے ہوں گے جن پر اس نظام کے تابع زندگی بسر کرنا گوارہ نہ ہو گا اور وہ اس میں کرباؤں گذار رہے ہوں گے یا جو اس نظام کو الٹنے کی کوشش کریں گے، ان کی آخرت کی زندگی تاریک ہوگی۔

قرآن کریم نے قانونِ مکافاتِ عمل کے ان اجتماعی نتائج کو بھی بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

(۱) جو قوم فطرت کی قوتوں کو مسخر ہی نہیں کرتی ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے اسلاف کے ترکہ پر چند دن کے لئے سامانِ زیست سے مستمتع ہوتی رہے، لیکن آخر الامر وہ تباہ ہو جائے گی۔

(۲) جو قوم فطرت کی قوتوں کو مسخر تو کر لیتی ہے لیکن انہیں مستقل اقدار کے مطابق صرف نہیں کرتی، اسے مفادِ عاجلہ حاصل ہو جائیں گے، لیکن ان کا نظام بھی آخر الامر بگڑ جائے گا اور وہ قوم تباہ ہو جائے گی۔

اس قسم کی تباہی کو وہ الساعۃ سے تعبیر کرتا ہے جس سے مراد کسی قوم کی زندگی میں انقلابِ عظیم برپا ہونے کے ہیں۔ اس انقلاب کی مختلف شکلیں ہوتی ہیں۔ مثلاً

(۱) کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اس قوم کے غلط نظام کی وجہ سے اس میں اندرونی خرابیاں پیدا ہونی شروع ہو جاتی ہیں جن کی وجہ سے اس میں حوادثِ ارضی و سماوی کے مقابلہ اور مدافعت کی سکت اور صلاحیت نہیں رہتی اور یوں وہ قوم رفتہ رفتہ آمادہ بہ زوال ہو کر آخر الامر یا تو بالکل مٹ جاتی ہے اور یا اپنی قومی حیثیت کھو بیٹھتی ہے۔

(۲) یا کوئی دوسری قوم، جو اس قوم سے زیادہ طاقتور ہوتی ہے، اسے اپنا مغلوب و محکوم بنا لیتی ہے۔ اس طرح اس کا قومی تشخص ختم ہو جاتا ہے۔

اگر یہ طاقتور قوم، دین کے صحیح نظام کی حامل ہے، تو وہ سابقہ قوم کے غلط نظام کی جگہ مستقل اقدار کا صحیح نظام متشکل کر دیتی ہے اس طرح اس سابقہ قوم کے افراد کو احترامِ آدمیت کا مقام حاصل ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر یہ نئی قوم محض قوت ہی میں بالادست ہے اور نظام ان کا بھی انسانیت سوز ہے تو پھر یہ قوم سابقہ

قوم کے افراد کا کچھ مز نکال دیتی ہے اور کچھ دنوں کے بعد ان کی اپنی حالت بھی ایسی ہی ہو جاتی ہے۔
 قرآنِ کریم، ان تباہ ہونے والی قوموں کی زندگی کو (دنیاوی) جہنم سے تعبیر کرتا ہے اور جو معاشرہ
 مستقل اقدار کے مطابق متشکل ہوتا ہے اسے جنتی معاشرہ کہہ کر پکارتا ہے۔ یہاں کی جنت اور جہنم کی
 زندگی، آگے بڑھ کر، اُخروی جنت اور جہنم کی زندگی بن جاتی ہے۔ اس زندگی کو قرآن نے تمثیلی انداز میں
 بیان کیا ہے کیونکہ اس کی کنہ و حقیقت کا ادراک، انسانی شعور کی موجودہ سطح پر ممکن نہیں۔

یہ ہے قانونِ مکافاتِ عمل کا ایک طائرانہ سا تصور جسے قرآنِ کریم نے بڑی شرح و بسط سے پیش
 کیا ہے۔ اس کے لئے وہ ہماری اصطلاحات ہی استعمال کرتا ہے کیونکہ قرآن بہر حال انسانوں کی زبان
 — عربی — میں نازل ہوا ہے۔ مثلاً وہ کہتا ہے کہ تمہارا ہر عمل لکھا جاتا ہے۔ اس کا ریکارڈ رکھا جاتا ہے۔
 تم سے حساب لیا جائے گا۔ تمہارے اعمالِ عدل کے ثرا دو میں تلے گئے۔ مجرمین کو عدالت میں پیش ہونا ہوگا۔
 ان کے ساتھ ”پولیس کے سپاہی“ ہوں گے۔ مستغیث بھی وہاں موجود ہوں گے اور گواہ بھی۔ اس عدالت
 میں نہ کسی کی سفارش چلے گی نہ رشوت۔ نہ کچھ دے دلا کر جان چھوٹے گی، نہ کوئی شخص کسی دوسرے کی
 سزا بھگت سکے گا۔ اسی طرح، جہنم کی جن سزاؤں کا ذکر ہے وہ ایسی ہی ہیں جیسے دنیا میں جیل خانوں
 کی زندگی یا میدانِ جنگ میں آگ اور خون کا عذاب۔ جہاں تک اس دنیا میں جنت یا جہنم کی زندگی کا
 تعلق ہے، وہ تو بہر حال، مادی شکل ہی میں ہوتی ہے۔ لیکن آخرت کی زندگی کی یہ تفصیل تمثیلی انداز میں
 بیان ہوئی ہیں۔

قانونِ مکافاتِ عمل کے اس مجموعی اور اجمالی تعارف کے بعد آپ دیکھئے کہ قرآنِ کریم نے ان تفصیل
 کو کس طرح بیان کیا ہے۔ ان تفصیل کو اس مجموعی تعارف کی روشنی میں دیکھنا چاہیئے۔ اس سے بات بھی
 زیادہ آسانی سے سمجھ میں آجائے گی اور ہمیں ایک ہی نکتہ کو بار بار وہرانا بھی نہیں پڑے گا۔

دوسرا باب

ہائیکو اس کے عمل کا نتیجہ ملتا ہے

جیسا کہ سابقہ باب میں بتایا جا چکا ہے، 'دین کا سارا نظام' قانونِ مکافات کے محور کے گرد گردش کرتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ

(۱) ہر شخص کو اس کے کام کا نتیجہ ملتا ہے۔

(۲) نتیجہ صرف اپنے کام کا ملتا ہے، خواہ اسے انفرادی طور پر کیا جائے اور خواہ دوسروں کے ساتھ شریک ہو کر۔ اور

(۳) کسی کا کوئی کام بلا نتیجہ نہیں رہ سکتا۔ تعمیری کام کا نتیجہ خوشگوار، تخریبی کا ناخوشگوار۔

وہ آں کریم نے اس بنیادی حقیقت کو جامعیت کے ساتھ ان مختصر الفاظ میں بیان کر دیا کہ — هَلْ يُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (۴۱/۱۴۷ ذ ۵۲/۱۶ ذ ۳۹/۳۷ ذ ۲۸/۴۵) لوگوں کو بدلہ صرف ان کے اپنے کاموں کا ملتا ہے۔ اس سے ذرا آگے ہے سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (۴۱/۱۸۰) انہیں ان کے کاموں کا بدلہ بہت جلد مل جائے گا۔ سورہ یونس میں ہے هَلْ يُجْزَوْنَ إِلَّا بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ (۱۰/۵۱) انہیں صرف اس کا بدلہ ملے گا جو کچھ کرتے ہو۔ اس میں نہ کسی کی تخصیص ہے، نہ استثناء۔

وَإِنْ كُنْتُمْ لَكُمْ رَحْمَةٌ لِّمَنْ يُّؤْتِيهِمْ رَبُّكَ أَغْمَالَهُمْ (۱۱۱/۱۱۲) نیز (۲۹/۴)

تیرا رب ان سب کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دے گا۔

سورہ نحل میں ہے وَتُؤْتِي كُلَّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ وَ هُمْ لَا يُظْلَمُونَ (۵/۱۱۱ ذ ۱۴/۱۴ ذ ۳۹/۴۰)

(۳۶/۵۴) ہر شخص کو اس کے کاموں کا پورا پورا بدلہ ملے گا۔ اس میں نہ کسی پر زیادگی ہوگی، نہ کسی کے بدلہ

میں کمی کی جائے گی۔

جو لوگ حُسنِ کارانہ انداز سے زندگی بسر کرتے ہیں ان کے متعلق کہا کہ لَيْفُمْ مَّا يَشَاءُونَ عِندَ رَبِّهِمْ (۳۹/۲۲) جو کچھ وہ چاہیں گے انہیں اپنے رب کے ہاں سے ملے گا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ ذٰلِكَ جَزَاءُ الْمُحْسِنِينَ (۳۹/۲۳) یہ اس لئے کہ انہوں نے قوانینِ خداوندی کے مطابق نہایت حسنِ کارانہ انداز سے زندگی بسر کی تھی۔ اور اس سے اگلی آیت (۳۹/۲۵) میں اس کی مزید تشریح کر دی۔ سورۃ احقاف میں کہا کہ ”ان لوگوں کے لئے جنت ہے“ اور اس کے ساتھ ہی اس کی وضاحت کر دی کہ جَزَاءً ۲۱ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (۴۰/۱۳) یہ ان کے اپنے اعمال کا بدلہ ہے۔ (نیز ۵۲/۱۹)۔ دوسری طرف غلط کار لوگوں کے متعلق کہا کہ ان کی زندگی جہنمی ہوگی اور یہ ان کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہوگا (۴۰/۷)۔ یعنی جزا مطابق اعمال (۴۸/۲۶)۔

غلط کار خود اپنے آپ کو تباہ کرتا ہے

معاشرہ میں غلط روش اختیار کرنے والے (بزعمِ خویش) یہ سمجھتے ہیں کہ ہم دوسروں کو نقصان پہنچا کر اپنا فائدہ کرتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس سے جو نقصان ان کی ذات کو پہنچتا ہے وہ اس طبعی مفاد سے کہیں بڑھ کر ہوتا ہے جسے وہ غلط طریق سے حاصل کرتے ہیں۔ اس طرح وہ دوسروں کو تباہ نہیں کرتے بلکہ خود اپنے آپ کو تباہ کرتے ہیں۔ اَلَّذِينَ خَسِرُوا اَنْفُسَهُمْ (۴/۵۳) نیز ۴/۵۳ میں ان کی اپنی ہلاکت کا سامان پوشیدہ ہوتا ہے۔

وَ اِنْ يَنْفَكُوْنَ اِلَّا اَنْفُسُهُمْ وَ مَا يَشْعُرُوْنَ (۲/۲۶)

یہ صرف اپنے آپ کو ہلاک کرتے ہیں لیکن اس بات کو سمجھتے نہیں۔

وہ سمجھتے ہیں کہ وہ دوسروں پر ظلم و زیادتی کرتے ہیں لیکن وہ درحقیقت اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں — وَ اَنْفُسُهُمْ كَانُوا يَظْلِمُوْنَ (۴/۱۷۷) جب ان پر تباہی آتی ہے تو وہ واویلا مچانا شروع کر دیتے ہیں کہ خدا نے ان پر ظلم کیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ اللّٰہ ان پر ظلم نہیں کرتا۔ وَلٰكِنْ كَانُوا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ (۱۶/۳۳) وہ خود اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں اور وہی ظلم ہلاکت بن کر ان کے سامنے آجاتا ہے۔ (نیز ۱۶/۱۱۲، ۲۹/۳۰، ۳۰/۹)۔

اجر منتقل نہیں کیا جاسکتا

آپ صبح کے وقت باقاعدہ سیر کے لئے جاتے ہیں۔ اس سے آپ کی صحت اچھی ہو جاتی ہے آپ آپ کا بھائی سیر کے لئے نہیں جاتا۔ وہ سیر کے فوائد سے محروم رہ جاتا ہے۔ آپ ہزار چاہیں کہ اپنی سیر کا نتیجہ اپنے بھائی کی طرف منتقل کر دیں، آپ ایسا نہیں کر سکتے۔ اسے یہ نتیجہ اسی وقت مل سکے گا جب وہ خود سیر کرے۔ اسی کا نام انسانی ذات کی انفرادیت (INDIVIDUALITY) ہے۔ یعنی ہر انسانی ذات دوسری ذات سے منفرد ہے اس لئے کسی ایک شخص کے عمل کا نتیجہ نہ کسی دوسرے کی طرف منتقل ہو سکتا ہے نہ کوئی اور اسے اس سے چھین سکتا ہے۔ نہ ہی ایسا ہو سکتا ہے کہ غلط کام کوئی دوسرا کرے اور اس کا نتیجہ آپ بھگتیں جو شخص انگلی آگ میں ڈالے گا، درد اسی کو ہوگا۔ کوئی دوسرا اس کی اس تکلیف کو بٹا نہیں سکتا، یہ ہے قانونِ مکافاتِ عمل کا وہ بنیادی اصول جس کے لئے قرآن نے کہا کہ

لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ عَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ (۲/۲۸۴)

جو شخص کوئی اچھا کام کرے گا اس کا اچھا اثر اس کی اپنی ذات پر مرتب ہوگا۔ جو غلط کام کرے گا اس کا تباہ کن نتیجہ بھی اس کی ذات کو بھگتنا پڑے گا۔

دوسری جگہ ہے وَ مَنْ يَكْسِبْ إِثْمًا فَإِنَّمَا يَكْسِبُهُ عَلَى نَفْسِهِ ۖ (۴/۱۱۱) جو شخص جرم کرتا ہے تو وہ جرم خود اس کی اپنی ذات کے خلاف ہوتا ہے۔ اس کا تباہ کن اثر اس کی اپنی ذات پر مرتب ہوتا ہے۔ سورہ روم میں ہے۔ مَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهُ ۖ وَ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلَا نَفْسِهِمْ يَمْنَهُ ۚ (۳۰/۴۲) جو صداقت سے انکار کرتا اور قوانینِ خداوندی سے سرکشی برتا ہے تو اس کا نقصان خود اٹھاتا ہے اور جو شخص صلاحیت بخش کام کرتا ہے وہ بھی اپنے ہی لئے سامانِ آسائش مہیا کرتا ہے۔ قانونِ مکافاتِ عمل کی رُو سے اصول یہ ہے کہ

فَمَنْ اهْتَدَىٰ فَإِنَّمَا يَهْتَدِي لِنَفْسِهِ ۚ وَ مَنْ ضَلَّٰ فَإِنَّمَا

يَضِلُّ عَلَيْهَا ۚ (۱۰/۱۰۸) (۱۴/۱۵) (۳۹/۴۱)

جو صحیح راستے پر چلتا ہے تو اس کا فائدہ اس کی اپنی ذات کو پہنچتا ہے اور جو غلط راہ اختیار کرتا ہے اس سے اس کی اپنی ذات کا نقصان ہوتا ہے۔

دوسری جگہ ہے فَمَنْ أَبْصَرَ فَلِنَفْسِهِ ۚ وَ مَنْ عَمِيَ فَعَلَيْهَا ۖ (۲۹/۴ : ۳۴/۹۲ : ۴/۱۰۵)۔
جو آنکھیں کھول کر چلتا ہے اس کا فائدہ خود اسی کو ہوتا ہے اور جو آنکھیں بند کر کے چلتا ہے وہ خود کُنوئیں میں
گرتا ہے۔ اس سے ذرا آگے چل کر ہے۔

وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ إِلَّا عَلَيْهَا ۚ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ

(۶/۱۴۵)

جو شخص غلط اقدام کرتا ہے تو اس کا نقصان اس کی اپنی ذات کو ہوتا ہے، قانونِ مکافات

عمل یہ ہے کہ کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔

لَهَذَا إِنْ أَحْسَنْتُمْ أَحْسَنْتُمْ لِأَنْفُسِكُمْ قَدْ وَ إِنْ أَسَاءْتُمْ فَلَهَا ۖ (۱۴/۴) (زمر ۳۴/۱۲ : ۳۱/۱۲)

(۳۵/۱۵) اگر تم اچھا کام کرتے ہو تو اپنی ذات کے لئے کرتے ہو اور اگر غلط کام کرتے ہو تو اس کا نقصان بھی تمہیں کو
ہوگا۔ لہذا یہ عقیدہ کہ ہم اپنے کسی نیک کام کا ثواب دوسرے کو پہنچا سکتے ہیں یا کوئی ہمارے گناہوں کا کفارہ دے
ہمیں عذاب سے بچا سکتا ہے، شر ان کی بنیادی تعلیم کے خلاف ہے۔ وَ مَنْ تَزَكَّىٰ فَإِنَّمَا يَتَزَكَّىٰ
لِنَفْسِهِ (۳۵/۱۸) جو اپنی ذات کے لئے سامانِ نشوونما فراہم کرتا ہے، اس کی ذات نشوونما پاتی ہے۔

وَأِنْ تَدْعُ مُثْقَلَةٌ إِلَىٰ حِمْلِهَآ لَا يَحْمِلْ مِنْهُ شَيْءٌ ۚ قَدْ كَانَ ذَا قُرْبَىٰ ۖ (۱۵/۱۸)
اگر کوئی ایسا شخص جو بوجھ کے نیچے دب رہا ہو کسی دوسرے کو آواز دے کہ وہ اس کے بوجھ کو اٹھالے تو وہ اس کا
ذرا سا بوجھ بھی نہیں ہٹا سکے گا خواہ وہ اس کا کتنا ہی قریبی کیوں نہ ہو (۳۹/۴)۔ ہر شخص اپنا اپنا بوجھ اپنی کمر پر
لاوے، سامنے آئے گا (۴/۳۱ : ۵۳/۳۸)۔

ہاں! جو لوگ دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں، ان کی پشت پر ان لوگوں کے بوجھ کا بھی کچھ حصہ ہوگا نہیں

انہوں نے گمراہ کیا تھا۔

لِيَحْمِلُوا أَوْزَانَهُمْ كَامِلَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۚ وَ مِنْ أَوْزَانِ الَّذِينَ

يُضِلُّونَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ إِلَّا سَاءَ مَا يَزِمُونَ ۚ (۲۹/۱۳ : ۱۴/۲۵)

وہ مکافات کے وقت اپنے غلط اعمال کا تو پورے کا پورا بوجھ اٹھائے ہوں گے اور اس

کے ساتھ ہی ان لوگوں کے بوجھ کا بھی کچھ حصہ جنہیں انہوں نے بلا علم و تحقیق غلط راستے پر

ڈال دیا تھا۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس طرح راہِ گم کردہ لوگوں کے بوجھ میں کچھ تخفیف ہو جائے گی۔ ان کا بوجھ تو اتنا ہی رہیگا لیکن گمراہ کرنے والوں کے بوجھ میں اضافہ ہو جائے گا۔ یہ بوجھ انہیں دوسروں کو گمراہ کرنے کے جرم کی وجہ سے اٹھانا پڑے گا۔

قانونِ مکافاتِ عمل کا اصل الاصول یہ ہے کہ مَنْ يَعْمَلْ سُوءًا يُجْزَ بِهِ لَا يَتُوبُ لِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (۴/۱۲۳) اسے اس کا بدلہ ملے گا۔ وَ مَنْ يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ مِنْ ذَكَرٍ أَوْ اُنْثٰی اور جو کوئی اچھے کام کرے گا۔ وہ مرد ہو یا عورت۔۔۔ اسے اس کا بدلہ ملے گا۔ وَلَا يُظْلَمُونَ نَقِيرًا (۴/۱۲۳) اور ان پر کسی قسم کا ظلم اور زیادتی نہیں ہوگی۔ اس باب میں اور تو اور کائنات کی عظیم ترین ہستی، خود ذاتِ رسالت کی زبانِ اقدس سے یہ اعلان کرایا گیا کہ

قُلْ اِنِّیْ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ (۴/۱۵)

(۱۰/۱۵ ذ ۳۹/۱۳)

ان سے کہہ دو کہ اگر میں بھی اپنے رب کے قوانین کی خلاف ورزی کروں تو یومِ مکافات کے عذاب سے مجھے بھی چھٹکارا نہیں مل سکتا۔ میں بھی اس سے ڈرتا ہوں۔

بلکہ آپ سے کہا گیا کہ اگر (بفرضِ محال) آپ ایسا کرتے تو آپ کو اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی دوہرا عذاب ملتا " (۱۴/۷۵)۔ جن کے رتبے ہیں سوا ان کی سوا مشکل ہے۔

یہ اعلان ایک عظیم حقیقت کا آئینہ دار ہے۔ آپ مختلف مذاہبِ عالم پر نگاہ ڈالئے۔ ان کے متبعین نے اپنے بانی مذہب کے متعلق بڑے غلو سے کام لیا ہے۔ کسی نے اسے خدا بنا دیا، کسی نے خدا کا بیٹا۔ کسی نے اُسے اوتار کہا اور کسی نے کہہ دیا کہ اس نے اپنی جان دے کر ہمارے گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا ہے۔ اور یہ عقیدہ تو کسی نہ کسی شکل میں ہر ایک کے ہاں موجود ہے کہ ان کے پیغمبر یا بزرگ خدا کے ہاں سفارش کر کے انہیں ان کے گناہوں کی پاداش سے بچالیں گے۔ ان کے برعکس، قرآن کریم کا یہ اعلان دیکھئے جس کی رُو سے خود رسول اللہ یہ کہہ رہے ہیں کہ کسی اور کو گناہوں کی پاداش سے چھڑانا تو ایک طرف، اگر مجھ سے بھی قانونِ خداوندی کی خلاف ورزی ہو جائے تو میں بھی اس کی سزا سے نہیں بچ سکتا، بلکہ مجھے دوسروں کے مقابلہ میں دوہری سزا ملے گی۔ ہم سمجھتے ہیں کہ خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کی وضاحت اس سے بہتر انداز میں ہو نہیں سکتی۔ اسی لئے قرآن کریم نے اس رسول کے متبعین سے بھی کہہ دیا کہ تم یہ نہ سمجھ لینا کہ تم (محض اس

رسول کی امامت میں شامل ہونے کی بنا پر) یونہی جنت میں داخل ہو جاؤ گے اور ان جانگل مراحل میں سے نہیں گزرو گے جو جنت تک پہنچنے کی راہ میں پڑتے ہیں (۲/۲۱۴)۔ ان مراحل میں گزرنے ہی پر تو اس کی پرکھ ہوگی کہ تم میں کون سچی پیہم اور عمل مسلسل سے جنت کا مستحق بنتا ہے (۱۱/۳۱۱ : ۱۴/۱۹)۔ یہ استحقاق زبان سے لیماں کا دعویٰ کر دینے سے حاصل نہیں ہو جاتا۔ اس کے لئے بڑی بڑی سخت کٹھالیوں میں سے گزرتا پڑتا ہے (۲۹/۲۹)۔ جی تو ہر ایک کا یہی چاہتا ہے کہ وہ جنت میں داخل ہو جائے لیکن جنت انسان کے اپنے اعمال کا فطری نتیجہ ہے (۳۸ - ۴۰/۲۹)۔ یہ نہ "بخشش" کے طور پر مل سکتی ہے نہ کسی کی سفارش سے۔ یہ تو أَجْرُ الْعَامِلِينَ (۲۹/۵۸) — یعنی کام کرنے والوں کے کام کا معاوضہ ہے۔ یہ جَزَاءٌ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (۳۲/۱۷) ہے۔ یعنی ان کے اعمال کا فطری نتیجہ۔ اس کے حصول کے لئے ہر کام کرنے والے کو کام کرنا چاہیئے (۳۶/۶۱) یہی وہ ہے کہ جنت میں داخل ہونے والوں کو پکار کر بتا دیا جائے گا کہ

بَلَلَكُمْ الْجَنَّةُ أَودِثْتُمُوهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ۝ (۴/۴۲)

یہ وہ جنت ہے جس کا تمہیں تمہارے اپنے اعمال کی بدولت وارث بنایا گیا ہے۔ اور چونکہ اسے تم نے اپنے سعی و عمل سے حاصل کیا ہے اس لئے تم اس کے مالک قرار پا گئے ہو۔ اب تمہیں کوئی اس سے نکال نہیں سکتا۔ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا۔ تم اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہو گے۔ جَزَاءً مِمَّنْ ذَرَبْتَ عَطَاءً حِسَابًا ۝ (۴۸/۳۶) اسے "حساب کر کے" عطا کیا گیا ہے۔

عدل کے ترازو

اس حساب کے لئے خدا نے عدل کے ترازو کھڑے رکھے ہیں۔ سورہ انبیاء میں ہے وَ نُضَعُ الْمَوَازِينَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيَمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا * (۲۱/۴۷) یوم مکافات کو ہم عدل کے ترازو کھڑے کر دیں گے اور اس طرح کسی پر کوئی ظلم اور زیادتی نہیں ہوگی۔ ان ترازوؤں کی کیفیت یہ ہوگی کہ فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ ۝ وَ مَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ (۹۹/۸-۷) غلط اور صحیح اعمال کا ایک ایک ذرہ سامنے آ جائے گا۔ چونکہ (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) ہر انسان کے عمل کا اثر اس کی ذات پر مرتب ہو جاتا ہے اس لئے کسی عمل کے منافع ہو جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس ضمن میں کہیں ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُهِنُّمُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِينَ ۝ (۳/۱۷۰) "خدا

مومنین کا اجر ضائع نہیں کرتا: کہیں یہ کہ وَلَا تُضِیْعُوا أَمْوَالَكُمْ الَّتِي كَسَبْتُمْ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوَاۓ الَّتِي بَيْنَ يَدَيْهَا عَذَابٌ عَظِيمٌ (۱۸/۳۰) ”ہم کسی کے حسنِ عمل کو ضائع نہیں جلتے دیتے۔“ کسی جگہ ہے لَھُمْ أَجْرُھُمْ عِنْدَ رَبِّھُمْ (۲/۲۴۴) ”ان کے اعمال کا بدلہ ان کے خدا کے ہاں سے ملے گا۔“ پورا پورا بدلہ۔ ثُمَّ قُوۡتِیْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَھُمْ لَا یُظْلَمُوۡنَ (۲/۲۸۱) ہر شخص کو اس کے عمل کا پورا پورا بدلہ ملے گا اور کسی پر کسی قسم کا ظلم نہیں ہوگا۔ کسی کے کام کا پورا پورا بدلہ نہ دینا ظلم ہے اور خدا ظلم کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا (۳/۲۴۱؛ ۳/۵۴؛ ۳/۱۹۰)۔ ظلم کرنا تو ایک طرف خدا کے قانونِ مکافات کی رو سے جو بدلہ ملے گا وہ انسان کے اپنے اندازے سے بھی زیادہ ہوگا (۴/۱۴۳)۔ لیکن بلا سنی و عمل کسی کو کچھ نہیں ملے گا کہ قانونِ مکافات کا بنیادی اصول یہ ہے کہ لَیْسَ لِلْإِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعَى (۵۳/۳۹) انسان کے لئے صرف وہ ہے جس کے لئے وہ کوشش کرتا ہے جنت میں جانے والوں کے متعلق کہا کہ وَ نَحْمَدُ أَجْرَ الْعَٰمِلِیۡنَ (۳/۱۳۵) کام کرنے والوں کے کام کا بدلہ کیسا اچھا ہے؟ مدارج کے تعین کا معیار بھی لوگوں کے اعمال ہی ہوں گے جس کا جتنا اور جس قدر اچھا کام اس کا اتنا ہی درجہ بلند۔ وَ یُكَلِّمُ الَّذِیۡنَ دَرَجٰتُہُمۡ مِّمَّا عَمِلُوۡۤا وَ مَا رَبُّكَ بِغَٰفِلٍ عَمَّا یَعْمَلُوۡنَ (۶۱/۱۳۳) (۲۴/۱۹) ہر ایک کا درجہ اس کے اعمال کے مطابق متعین کیا جائے گا۔ خدا کو سب معلوم ہے کہ کس نے کیا کام کئے ہیں۔

انسانی زندگی ایک کارگاہِ عمل ہے

موجودہ سطح پر انسانی زندگی کا مقصد و منتہی یہ ہے کہ اس کی ذات کی اس حد تک نشوونما ہو جائے کہ وہ اس سے اگلی ارتقائی منزل طے کرنے کے قابل ہو جائے۔ موت و حقیقت اس بات کی پرکھ (TEST) کے لئے ہے کہ انسانی ذات میں کس حد تک استحکام پیدا ہو چکا ہے۔ خَلَقَ الْاِنۡسَٰنَ وَ الْحَیۡوۃَ لِیَبۡلُوۡکُمۡ اَیُّکُمۡ اَحْسَنُ عَمَلًا (۹۱/۲) خدا نے موت و حیات کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ تمہیں حسنِ عمل کے لئے مواقع بہم پہنچائے۔ لہٰذا اس کارگاہِ عمل میں لِمَنْ شَآءَ مِنْکُمْ اَنْ یَّتَقَدَّمَ اَوْ یَتَّخِذُ (۹۲/۲۴) جس کا جی چاہے آگے بڑھ جائے جس کا جی چاہے پیچھے رہ جائے۔

اس سے اگلی آیت میں شُرَّانِ کریم نے مکافاتِ عمل کے سارے فلسفہ اور اس کی رقم کو ایک لفظ میں مٹا کر رکھ دیا ہے۔ کہا کہ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ ۝ (۴۲/۳۸) دوسری جگہ ہے۔ كُلُّ امْرِئٍ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ ۝ (۵۲/۲۱) ہر شخص نے اپنے آپ کو اپنے اعمال کے عوض (گرو) رکھا ہوا ہے۔ جو شخص جو کام کرتا ہے اس کام کا نتیجہ اسے بھگتنا ہوگا۔ اس لئے اس حد تک اس کی آزادی سلب ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے اس کام کے نتیجے کے ہاتھوں رہن رکھا جاتا ہے۔ اس سے اسے کوئی دوسرا چھڑا نہیں سکتا۔ اسی نکتہ کی وضاحت کے لئے کہا کہ تم نہ تو خدا کی مملکت سے بھاگ کر کسی اور مملکت میں جاسکتے ہو کہ وہاں (سابقہ مملکت کے خلاف جرائم کی پاداش سے) بچ جاؤ اور نہ ہی اس کی مملکت میں رہتے ہوئے اس کے خلاف جنگ کر کے اسے شکست دے سکتے اور اس طرح اس کی گرفت سے چھوٹ سکتے ہو۔ یہ ناممکن ہے (۴۲/۱۲)۔ اس کا قانونِ مکافات تمہیں اس طرح پکڑ لے گا جس طرح گھوڑے کو اس کی پیشانی کے بالوں سے پکڑ لیا جاتا ہے اور اس طرح وہ بے بس اور مجبور ہو جاتا ہے (۱۵۱-۱۶۶/۱۶)۔ یہ ہو سکتا ہے کہ تم (غلط معاشرہ میں) اپنے جرائم کی پاداش سے اپنے آپ کو بچاؤ۔ لیکن یہ کچھ تم اس دنیا کی زندگی میں کر سکتے ہو اور دنیا کی زندگی تو بہر حال ایک مدتِ معینہ تک کے لئے ہے۔ اس کے بعد یہاں کی حفاظتی تدابیر تمہارے کسی کام نہیں آسکیں گی۔ لہذا ”اگر تمہاری عمر ہزار برس کی بھی ہو جائے تو بھی تم اس کی گرفت سے مامون نہیں رہ سکتے“ (۲/۹۶)۔

کل کے لئے کیا بھیجا ہے ؟

چونکہ انسان کا عمل پہلے سرزد ہوتا اور اس کا نتیجہ بعد میں مرتب ہوتا ہے اس لئے شُرَّانِ کریم نے ظہورِ نتائج کے لئے ”کل“ یا ”فردا“ کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ سورہ حشر میں ہے۔ وَ لَتُنْظُرُنَّ نَفْسٌ مِّنَّا قَدْ مَتَّ رِغْدًا ۚ (۵۹/۱۸) ہر شخص کو چاہیے کہ یہ دیکھے کہ اس نے ”کل“ کے لئے کیا آگے بھیجا ہے۔ ”آگے بھیجنے“ سے مراد ہی اعمال کے نتائج ہیں۔ یہ اصطلاح کئی ایک دیگر مقامات میں بھی آئی ہے۔ مثلاً (۴۳/۲۰؛ ۴۵/۱۳؛ ۴۸/۲۰؛ ۸۱/۱۴؛ ۸۲/۵)۔ سورہ الفجر میں اس کے ساتھ ایک اور لفظ کا اضافہ ہوا ہے جس سے حقیقت نکھر کر سامنے آگئی ہے۔ کہا کہ اہل جہنم اس تباہی کو دیکھ کر بے ساختہ پکار اٹھیں گے کہ یٰلَیْسَٰنَا قَدْ مَتَّ رِغْدًا ۚ (۸۹/۲۴) اے کاش! میں نے اپنی زندگی کے لئے کچھ پہلے بھیج دیا ہوتا۔ اس سے

واضح ہے کہ زندگی کی اگلی منزل عبارت ہوگی انسان کے اپنے اعمال کے نتائج سے۔ اس کے غلط اعمال کے نتائج اس دنیا میں بھی اس کی انسانی صلاحیتوں پر رنگ بن کر چھٹ جاتے ہیں جس سے وہ ابھرنے ہی نہیں پاتیں (۸۳/۱۴) اور یہی نتائج اگلی زندگی میں اس کی صحیح زندگی کے راستے میں سنگِ گراں بن کر حائل ہو جاتے ہیں۔

اپنے اعمال کی فکر ہونی چاہیئے

سو جب حقیقت یہ ہے کہ انسان کی زندگی اس کے اپنے اعمال ہی سے جنت اور جہنم بنتی ہے تو انسان کو اپنے اعمال کا محاسبہ کرتے رہنا چاہیئے۔ دوسروں کے اعمال کی ٹوہ میں لگے رہنے سے اس کا اپنا کیا سنور جائے گا؟ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم مومنین سے بار بار تاکید کرتا ہے کہ وہ مخالفین سے اس باب میں اُنھیں نہیں بلکہ ان سے دو ٹوک الفاظ میں کہہ دیں کہ

وَلَنَّا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ (۲۷/۵۵؛ ۲/۱۳۹)

ہمارے اعمال کے نتائج ہمارے لئے ہوں گے۔ تمہارے

اعمال کے نتائج تمہارے لئے۔

سورہ کافرون میں اعمال کی جگہ نتائج اعمال (دین) کہہ کر بات کو اور بھی واضح کر دیا۔ — لَكُمْ دِينُكُمْ قَوْلَ دِينَ ۵ (۱۰۹/۶)۔ سورہ سبأ میں ہے کہ ان سے کہہ دو کہ لَا تَسْأَلُونَنَا عَمَّا آجَزَمْنَاهُ وَلَا تَسْأَلُونَنَا عَمَّا تَعْمَلُونَ ۵ (۳۲/۲۵) نہ تم سے پوچھا جائے گا کہ ہم نے کیا کیا جرم کئے تھے اور نہ ہم سے سوال ہوگا کہ تم نے کس قسم کے کام کئے تھے۔ دوسرے مقام پر نبی اکرمؐ سے کہا گیا کہ ان سے کہہ دو کہ میرے اعمال میرے لئے ہیں تمہارے اعمال تمہارے لئے۔ نہ تمہارے اعمال کی ذمہ داری مجھ پر عائد ہوتی ہے اور نہ ہی میرے اعمال کی ذمہ داری تم پر عائد ہوگی (۱۰۶/۴۱)۔

اسلاف کے اعمال

اپنے مخاطبین ہی سے نہیں۔ بلکہ تم اسلاف کے متعلق بھی اس قسم کی بحثوں میں نہ الجھا کرو کہ فلاں اچھے تھے اور فلاں بُرے۔ فلاں جنت میں جائیں گے فلاں جہنم میں۔ یاد رکھو!

تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ لَكُمْ مِمَّا كَسَبْتُمْ
وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝ (۲/۱۳۱) (۲/۱۳۲)

یہ لوگ اپنے اپنے وقتوں میں گذر گئے۔ ان کے اعمال ان کے لئے تھے تمہارے اعمال تمہارے لئے ہوں گے۔ اور تم سے پوچھا نہ جائے گا کہ انہوں نے کیا کیا تھا۔

غور کیجئے۔ اگر قرآن کریم کا یہ عظیم اصول ہمارے پیش نظر رہے تو ہم کس طرح ان تمام اُلجھنوں سے چھوٹ جاتے ہیں جن میں اُمت تیرہ سو برس سے مانوذبلی آرہی ہے اور جس سے نہ صرف یہ کہ اس قدر وقت محنت توانائی دولت ضائع ہو چکی اور ضائع ہوتی رہتی ہے بلکہ اس سے باہمی نفرت و حقارت و دور ہو کر کس طرح وحدت اور یگانگت پیدا ہو سکتی ہے۔ خدا بر ملا کہہ رہا ہے کہ تم سے یہ پوچھا ہی نہیں جائے گا کہ تمہارے اسلاف نے کیسے کام کئے تھے لیکن ہم کہتے ہیں کہ نہیں! ہم سے سب سے پہلے سوال ہی یہ پوچھا جائے گا اس لئے نہیں ”پوری چھان بین اور کامل تحقیق و تدقیق“ کے بعد اس سوال کے جواب کی تیاری کرنی چاہیئے۔

پھر اسے بھی سمجھ رکھئے کہ ہمارے اسلاف میں سے اگر کسی نے اچھے کام کئے تھے تو ان کا فائدہ ان کی اپنی ذات کو پہنچے گا۔ ہمیں ان کا کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ (جیسا کہ پہلے وضاحت سے بیان کیا جا چکا) کسی کے عمل کا نتیجہ کسی دوسرے کی طرف منتقل کیا ہی نہیں جاسکتا۔

کوئی کسی کے کام نہیں آسکے گا

اس اصول کی وضاحت کے لئے قرآن کریم نے بار بار کہہ دیا کہ نتائج اعمال کے سلسلہ میں کوئی کسی کے کام نہیں آسکے گا۔ سورہ بقرہ میں ہے۔

وَالْقَوَا يُومَمَّا لَا تَجْزِي نَفْسٌ عَنْ نَفْسٍ شَيْئًا وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا
شَفَاعَةٌ وَلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ ۝ (۲/۲۵۳) (۲/۲۵۴)

تم ظہور نتائج کے اس دن سے ڈرو جب کوئی شخص کسی دوسرے کے کسی کام نہیں آسکے گا نہ ہی کسی کی سفارش قبول کی جائے گی۔ نہ کوئی کچھ دے دلا کر چھوٹ سکے گا نہ ہی مجربوں کی کسی قسم کی مدد کی جاسکے گی۔

دوسری جگہ ہے کہ یَوْمَ لَا بِنِعْمٍ فِينِهِ وَلَا خُلَّةٌ وَلَا شَفَاعَةٌ ۝ (۲/۲۵۴) (۲/۲۵۵) اس دن

کوئی سودا بازی ہو سکے گی۔ نہ کسی کی کوئی سودا بازی کوئی کام دے سکے گی۔ نہ کسی کی سفارش چل سکے گی۔ اس دن کوئی کسی کو کسی قسم کا نفع یا نقصان نہیں پہنچا سکے گا (۳۲/۴۲)۔ اَلَا خِلَآءُ يَوْمَئِذٍ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِينَ ؕ (۳۳/۶۷) اس دن دوست بھی ایک دوسرے کے دشمن ہو جائیں گے۔ ہاں مگر جو لوگ کامیابیوں کی فہرست میں شامل ہوں گے ان کی باہمی رفاقت قائم رہے گی لیکن اعمال کے نتائج بدلنے میں وہ بھی ایک دوسرے کے کام نہیں آسکیں گے (۴۴/۴۱)۔ کسی میں نہ اس کی قوت ہوگی کہ وہ ان نتائج کو اپنے سے دور کر سکے اور نہ کوئی دوسرا اس کا مددگار بن سکے گا (۸۶/۱۰)۔ فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْ أَحَدِهِمْ مِلْءُ الْأَرْضِ ذَهَبًا وَّ لَا يَوْفَىٰ اُتَىٰ بِهِ ؕ (۳/۹۰)؛ (۵/۳۶)؛ (۱۳/۱۸)؛ (۳۹/۴۷)؛ (۳۲/۴۷)۔ اگر کوئی چاہے گا کہ سارے کرۂ ارض کے برابر سونا دے کر ان نتائج سے محفوظ رہ سکے تو اس سے یہ بھی بطور فدیہ قبول نہیں کیا جائے گا (۵۷/۱۵)؛ (۶/۷۰)۔ لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَّ لَا اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْئًا ؕ (۳/۹۱)؛ (۵۸/۱۷)؛ (۱۱۵/۲)۔ خدا کے قانونِ مکافات کے مقابلہ میں نہ کسی کا مال کچھ کام دے سکے گا نہ اولاد (۲۶/۸۸)۔ يَوْمًا لَا يَخْزِي وَّ الْاَبْءَ عَنْ وَّ لَدِيْكَ وَّ لَا مَوْلُوْكَ هُوَ جَاۤءَ عَنْ ذَا الْاَبْدِ شَيْئًا ؕ (۳۱/۳۳) جس دن نہ بیٹا باپ کے کسی کام آ سکے گا نہ باپ بیٹے کو بچا سکے گا۔ لَنْ تَنْفَعَكُمْ اَرْحَامُكُمْ وَّ لَا اَوْلَادُكُمْ يَوْمَ الْاٰفَاقَةِ (۶۰/۳) اس دن نہ کسی کو اس کی اولاد کوئی فائدہ پہنچا سکے گی نہ کوئی اور رشتہ دار جس قدر قوت اور اقتدار (انتھارٹی) دہ دنیا میں رکھتا تھا، وہ بھی اس کے لئے کچھ نہیں کر سکے گی (۹۲/۱۱)؛ (۱۱۱/۲)۔ قانون کہتے ہی اسے میں جس پر کوئی خارجی عنصر اثر انداز نہ ہو سکے اور وہ اپنی کار فرمائی اور نتیجہ خیزی میں اٹل ہو ہر ایک اپنے اپنے اعمال کی ہتھکڑیوں اور بیڑیوں میں جکڑا ہوا حاضر عدالت ہو اور نفسا نفسی اور افراتفری کا یہ عالم کہ

يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ ؕ وَّ اُمِّهِ ؕ وَّ صَاحِبَتِهِ

وَّ بَنِيْهِ ؕ كُلٌّ اِمْرٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَانٌ يُغْنِيْهِ ؕ (۸۰/۳۷)؛ (۳۲/۴۷)؛ (۷۰/۱۳)؛ (۱۰/۱۰)۔

جس دن دوست اپنے دوست سے بھاگ جائے گا۔ ماں اور باپ اولاد کو چھوڑ جائیں گے۔ بیوی اور

بچے بھی سب آنکھیں دکھا دیں گے۔ اس لئے کہ اس دن سب کو اپنی اپنی بیڑی ہوگی۔

دنیاوی قانون کی گرفت سے چھوٹنے کے لئے مختلف سازشیں کام دے جاتی ہیں۔ لیکن خدا کے قانونِ مکافات کے مقابلہ میں کوئی سازش کارگر نہیں ہو سکے گی (۵۲/۴۶)۔ یہ اس لئے کہ انسان کے ہر عمل کا اثر اس کی ذات پر

مرتب ہوتا ہے۔ اس لئے کوئی خارجی قوت اس اثر کو زائل کرنے میں کیا کام دے سکتی ہے؟ اسی حقیقت کو قرآن کریم نے ایک ایسے جامع انداز میں بیان کیا ہے کہ جوں جوں نیک بصیرت اس پر غور کرتی ہے، انسان وجد میں آ جاتا ہے۔

انسانی ذات وہ شے ہے جسے "میں" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ آپ اپنے آپ کو "میں" کہتے ہیں اور باقی ہر شے کو "میری" (یعنی اس "میں" کی)۔ میرا مال، میری جائیداد، میری بیوی، میری اولاد، میرے دوست، میرا جسم، حتیٰ کہ میری جان۔ انسانی اعمال کا اثر اس "میں" پر مرتب ہوتا ہے اور موت کے وقت وہ سب کچھ جسے میرا یا میری کہا جاتا ہے پیچھے رہ جاتا ہے اور "میں" تنہا آگے جاتا ہے۔ دیکھئے! اس حقیقت کو قرآن کن الفاظ میں بیان کرتا ہے۔ سورۃ النعام میں ہے۔

وَلَقَدْ جِئْتُمُونَا فَرَادَىٰ كَمَا خَلَقْنَاكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَ تَرْكُكُمْ مَّا
خَوَّلْنَاكُمْ وَرَاءَ ظُهُورِكُمْ ۚ وَمَا نَرَىٰ مَعَكُمْ شُفَعَاءَ كُمُ الَّذِينَ زَعَمْتُمْ
أَنَّهُمْ فِيكُمْ ۚ شُرَكَؤُا۟ ۚ لَقَدْ تَقَطَّعَ بَيْنَكُمْ وَ هَلَكَ عَنْكُم مَّا كُنْتُمْ
تَزْعُمُونَ ۝ (۶/۹۵) (۱۷/۲۸۱)

تم ہمارے پاس فرادی (تنہا) آؤ گے جس طرح ہم نے تمہیں پہلی مرتبہ پیدا کیا تھا اور اس کے بعد جو کچھ تمہیں دیا گیا تھا سب پیچھے چھوڑ آؤ گے۔ حتیٰ کہ جن کے متعلق تم سمجھتے تھے کہ وہ تمہارا ساتھ دیں گے اور خدا کے شریک بن کر تمہیں عذاب سے بچالیں گے وہ بھی تمہارے ساتھ نہیں ہوں گے۔ اس وقت تمام رشتے منقطع ہو جائیں گے اور جس جس کو تم "میرا" سمجھتے تھے سب غائب غلاً ہو جائیں گے۔

سورۃ مريم میں اسے اور بھی مختصر الفاظ میں سمٹا کر بیان کر دیا جب کہا کہ وَ كُلُّهُمْ اٰتِيهِ يَوْمَ الْقِيَمَةِ فَرْدًا ۝ (۱۹/۹۵) اس دن سب کے سب خدا کے سامنے انفرادی طور پر آئیں گے۔ یعنی کوئی اضافی نسبت ان کے ساتھ نہیں ہوگی۔ ان کی ذات، ان کے اعمال کے اثرات لئے ہوئے آگے جائے گی (۱۹/۸۰)۔

تیسرا باب

حَسَابُ کِتَاب

قانونِ مکافاتِ عمل کا منطقی اور فطری نتیجہ یہ ہے کہ انسان اپنے تمام اعمال کا خود ذمہ دار ہے یا یوں کہیے کہ انسان کے اپنے اعمال کے ذمہ دار ہونے کا فطری نتیجہ یہ ہے کہ وہ اپنے اعمال کا نتیجہ بھگتے۔ بات دونوں صورتوں میں ایک ہی ہے جس شخص کو کسی چیز کا ذمہ دار ٹھہرایا جائے اس کے متعلق کہا یہ جاتا ہے اسے اس چیز کا حساب دینا ہوگا۔ اسے (ACCOUNTABILITY) کہا جائے گا۔ قرآن کریم نے اسے ”حساب دینے“ سے تعبیر کیا ہے۔ سورہ الحج میں ہے۔

فَوَرَبِّكَ لَنَسْأَلَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ ۖ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ (۹۲-۱۵/۹۳)

تیرا رب اس پر شاہد ہے کہ جو کچھ یہ لوگ کرتے ہیں، ان سے اس کی بابت باز پرس ہوگی۔

دوسری جگہ ہے ثُمَّ لَنَسْأَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ (۱۰۲/۸) پھر ان سے ان تمام نعمتوں کی بابت پوچھا جائے گا۔ جن سے یہ متمتع ہوتے تھے۔ پوچھا یہ جائے گا کہ انہیں حاصل کس طرح کیا تھا اور خرچ کہاں کیا تھا۔ انسان یہ سمجھتا ہے کہ چونکہ وہ اپنے کاروبار میں آزاد اور صاحب اختیار ہے اس لئے وہ جو جی چاہے کرے۔ یہ ٹھیک ہے کہ انسان صاحب اختیار و ارادہ ہے اور اسے آزادی حاصل ہے کہ یہ جو جی میں آئے کرے۔ لیکن اسے اپنے ہر عمل کا نتیجہ بھگتنا ہوگا۔ یعنی وہ اس باب میں تو آزاد ہے کہ وہ جو جی میں آئے کرے، لیکن اسے اس کا اختیار حاصل نہیں کہ وہ اپنے اعمال کے نتائج بدل لے۔ اس کے لئے وہ خدا کے قانونِ مکافات کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ فَإِنَّمَا حِسَابُهُ عِنْدَ رَبِّهِ (۲۳/۱۱۷) ”یقیناً خدا کے ہاں اس کا حساب ہوگا“ (۲۴/۳۹)۔ خدا کے رسول جو انسانوں کو

خدا کے قانونِ مکافات سے آگاہ کرتے تھے، ان سے واضح الفاظ میں کہتے تھے کہ ان کا حساب ان کے خدا کے ہاں ہوگا۔ اے کاش! یہ اس حقیقت کو سمجھ لیں (۲۶/۱۱۳)۔ اور خدا اعلان کرتا تھا کہ إِنَّ عَلَيْنَا جِسْمًا بِهْمُ (۸۸/۲۶) ان سے حساب لینا ہمارے ذمہ ہے۔ بلکہ وہ اپنے رسولوں سے واضح کہہ دیتا تھا کہ فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاءُ وَ عَلَيْنَا الْحِسَابُ ۝ (۱۳/۴۰) تمہارے ذمہ صرف اس پیغام کا پہنچا دینا ہے، ان سے حساب لینا ہمارے ذمہ ہے۔ اس کے لئے خدا کو کسی معاون اور مددگار کی ضرورت نہیں۔ نہ ہی اس کے انتقام میں کسی قسم کا نقص یا خامی ہے۔ وَ كَفَىٰ بِاللّٰهِ حَسِيبًا (۴/۴۱)؛ (۳۲/۳۹) خدا محاسبہ کرنے کے لئے کافی ہے۔ وہ ہر شے کا حساب لے گا (۴/۸۶)۔ انسانی عمل کا ایک ایک ذرہ اس کے حساب میں آجائے گا (۲۱/۴۶)۔

دنیا کا نظامِ عدل و محاسبہ کتنا ہی مکمل اور ہمہ گیر کیوں نہ ہو اس کی دسترس بہر حال انسان کے ظاہری اعمال تک ہو سکتی ہے۔ اس کے خیالات اور ارادے اس کی دسترس سے باہر ہوتے ہیں لیکن خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کی رُو سے انسان کے ہر خیال اور ارادہ کا اثر بھی اس کی ذات پر پڑتا ہے اس لئے یہ بھی 'خدا کے حساب' کے دائرے کے اندر آجاتے ہیں۔ اسی لئے فرمایا کہ وَ اِنْ تُبْدُوا مَا فِیْ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تَخْفَوْا ۙ یُخَاسِبْکُمْ بِہِ اللّٰہُ ۝ (۲/۲۸۴) تم کسی بات کو اپنے دل میں چھپاؤ یا آگے ظاہر کرو، خدا ان سب کا حساب لے گا۔ مومن کو اس کا یقین ہوتا ہے اور اسی سے وہ غلط اقدامات سے بچتا ہے۔ اسی لئے وہ ظہورِ نتائج کے وقت کہتا ہے کہ مجھے اس کا ہر وقت خیال رہتا تھا کہ اِنِّیْ مُلْقٍ حِسَابِہٖ ۝ (۴۹/۲۰) میرا حساب میرے سامنے آئے گا۔ اس کے برعکس، جہنم میں جانے والا اپنے حساب کا پرت دیکھ کر چیخ اٹھے گا کہ یَلٰیئَتٰی کَمْ اُذْتُ کِتٰبِہٖ ۝ وَ کَمْ اٰذَرِمَا حِسَابِہٖ ۝ (۲۵-۲۶) اے کاش! یہ حساب کا پرت مجھے نہ دیا جاتا اور مجھے معلوم ہی نہ ہوتا کہ میرا حساب کیا ہے! چونکہ ابنِ جنت کے اعمال خدا کے قوانین کے مطابق ہوں گے اس لئے ان کا حساب بہت آسان ہوگا (۸۴/۸)۔ اس کے برعکس، غلط کاروں کو ان کا حساب بڑا سخت ہوگا (۱۳/۱۸)۔ لہذا انسان کو ہر وقت اس کا خیال رکھنا چاہیے کہ اسے اپنی ایک ایک حرکت کے لئے جواب دہ ہونا ہے۔

انسان اپنا محاسب آپ ہے

یہاں تک کہ ہم نے دیکھا کہ "خدا کو حساب لینے والا" کہا گیا ہے۔ یہ صرف بات سمجھانے کا انداز

ہے۔ مقصد اس سے یہی ہے کہ یہ حساب خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کی رُو سے ہوگا۔ یہ حساب کرنے والا کہیں باہر سے نہیں آئے گا۔ چونکہ انسان کے ہر عمل کا اثر اس کی ذات پر مرتب ہوتا ہے اس لئے وہ حقیقت اپنا محاسب آپ ہوتا ہے۔ اس کی ذات اس کا "اعمال نامہ" ہوتی ہے اور اس اعمال نامہ کو وہ خود پڑھ کر اپنا حساب آپ کر لیتا ہے۔ سورۃ بنی اسرائیل میں اس حقیقت کو بڑے بلیغ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔
 فرمایا۔ وَكُلَّ إِنْسَانٍ أَلْزَمْنَاهُ طَلْعَ كَرِّهِ عُنُقِهِ ۖ هَرَّاسَانِ كَالْعَمَالِ نَامَ اس کی گردن میں لٹکا ہوتا ہے۔ وَ نَخْرِجُ لَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ظَهْرَ تَنَاجُجِ کے وقت ہم اس اعمال نامہ کو باہر نکال لائینگے۔ كَتَبًا يَلْقَاهُ مَنشُورًا ۚ یعنی جو کاغذ پہلے پٹنا ہوا تھا اسے اُس وقت پھیلا دیا جائے گا اور انسان کہا جائے گا کہ اِقْرَأْ كِتَابَكَ ۖ تَوَاطَا اَعْمَالِ نَامَ خود آپ پڑھ۔ كَفَىٰ بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيبًا ۝ (۱۳-۱۴) آج تو اپنے خلاف اپنا محاسب آپ ہے۔ کسی دوسرے محاسب کی ضرورت نہیں۔

سریع الحساب

انسان سے جس وقت کوئی عمل سرزد ہو اس کا نتیجہ اس کے ساتھ ہی مرتب ہونا شروع ہو جاتا ہے لیکن وہ محسوس شکل میں کچھ عرصے کے بعد جا کر سامنے آتا ہے۔ اس اعتبار سے کہ عمل کا نتیجہ اس کے ساتھ ہی مرتب ہونا شروع ہو جاتا ہے، خدا نے اپنے آپ (یعنی اپنے قانونِ مکافات) کو سریع الحساب۔ بہت جلد حساب لینے والا۔ کہا ہے (۱۸/۳: ۴/۵: ۱۳/۵۱: ۱۴/۵۱: ۲۴/۳۹: ۲۵/۱۴: ۲۶/۱۴: ۲۷/۱۴: ۲۸/۱۴: ۲۹/۱۴: ۳۰/۱۴: ۳۱/۱۴: ۳۲/۱۴: ۳۳/۱۴: ۳۴/۱۴: ۳۵/۱۴: ۳۶/۱۴: ۳۷/۱۴: ۳۸/۱۴: ۳۹/۱۴: ۴۰/۱۴: ۴۱/۱۴: ۴۲/۱۴: ۴۳/۱۴: ۴۴/۱۴: ۴۵/۱۴: ۴۶/۱۴: ۴۷/۱۴: ۴۸/۱۴: ۴۹/۱۴: ۵۰/۱۴: ۵۱/۱۴: ۵۲/۱۴: ۵۳/۱۴: ۵۴/۱۴: ۵۵/۱۴: ۵۶/۱۴: ۵۷/۱۴: ۵۸/۱۴: ۵۹/۱۴: ۶۰/۱۴: ۶۱/۱۴: ۶۲/۱۴: ۶۳/۱۴: ۶۴/۱۴: ۶۵/۱۴: ۶۶/۱۴: ۶۷/۱۴: ۶۸/۱۴: ۶۹/۱۴: ۷۰/۱۴: ۷۱/۱۴: ۷۲/۱۴: ۷۳/۱۴: ۷۴/۱۴: ۷۵/۱۴: ۷۶/۱۴: ۷۷/۱۴: ۷۸/۱۴: ۷۹/۱۴: ۸۰/۱۴: ۸۱/۱۴: ۸۲/۱۴: ۸۳/۱۴: ۸۴/۱۴: ۸۵/۱۴: ۸۶/۱۴: ۸۷/۱۴: ۸۸/۱۴: ۸۹/۱۴: ۹۰/۱۴: ۹۱/۱۴: ۹۲/۱۴: ۹۳/۱۴: ۹۴/۱۴: ۹۵/۱۴: ۹۶/۱۴: ۹۷/۱۴: ۹۸/۱۴: ۹۹/۱۴: ۱۰۰/۱۴: ۱۰۱/۱۴: ۱۰۲/۱۴: ۱۰۳/۱۴: ۱۰۴/۱۴: ۱۰۵/۱۴: ۱۰۶/۱۴: ۱۰۷/۱۴: ۱۰۸/۱۴: ۱۰۹/۱۴: ۱۱۰/۱۴: ۱۱۱/۱۴: ۱۱۲/۱۴: ۱۱۳/۱۴: ۱۱۴/۱۴: ۱۱۵/۱۴: ۱۱۶/۱۴: ۱۱۷/۱۴: ۱۱۸/۱۴: ۱۱۹/۱۴: ۱۲۰/۱۴: ۱۲۱/۱۴: ۱۲۲/۱۴: ۱۲۳/۱۴: ۱۲۴/۱۴: ۱۲۵/۱۴: ۱۲۶/۱۴: ۱۲۷/۱۴: ۱۲۸/۱۴: ۱۲۹/۱۴: ۱۳۰/۱۴: ۱۳۱/۱۴: ۱۳۲/۱۴: ۱۳۳/۱۴: ۱۳۴/۱۴: ۱۳۵/۱۴: ۱۳۶/۱۴: ۱۳۷/۱۴: ۱۳۸/۱۴: ۱۳۹/۱۴: ۱۴۰/۱۴: ۱۴۱/۱۴: ۱۴۲/۱۴: ۱۴۳/۱۴: ۱۴۴/۱۴: ۱۴۵/۱۴: ۱۴۶/۱۴: ۱۴۷/۱۴: ۱۴۸/۱۴: ۱۴۹/۱۴: ۱۵۰/۱۴: ۱۵۱/۱۴: ۱۵۲/۱۴: ۱۵۳/۱۴: ۱۵۴/۱۴: ۱۵۵/۱۴: ۱۵۶/۱۴: ۱۵۷/۱۴: ۱۵۸/۱۴: ۱۵۹/۱۴: ۱۶۰/۱۴: ۱۶۱/۱۴: ۱۶۲/۱۴: ۱۶۳/۱۴: ۱۶۴/۱۴: ۱۶۵/۱۴: ۱۶۶/۱۴: ۱۶۷/۱۴: ۱۶۸/۱۴: ۱۶۹/۱۴: ۱۷۰/۱۴: ۱۷۱/۱۴: ۱۷۲/۱۴: ۱۷۳/۱۴: ۱۷۴/۱۴: ۱۷۵/۱۴: ۱۷۶/۱۴: ۱۷۷/۱۴: ۱۷۸/۱۴: ۱۷۹/۱۴: ۱۸۰/۱۴: ۱۸۱/۱۴: ۱۸۲/۱۴: ۱۸۳/۱۴: ۱۸۴/۱۴: ۱۸۵/۱۴: ۱۸۶/۱۴: ۱۸۷/۱۴: ۱۸۸/۱۴: ۱۸۹/۱۴: ۱۹۰/۱۴: ۱۹۱/۱۴: ۱۹۲/۱۴: ۱۹۳/۱۴: ۱۹۴/۱۴: ۱۹۵/۱۴: ۱۹۶/۱۴: ۱۹۷/۱۴: ۱۹۸/۱۴: ۱۹۹/۱۴: ۲۰۰/۱۴: ۲۰۱/۱۴: ۲۰۲/۱۴: ۲۰۳/۱۴: ۲۰۴/۱۴: ۲۰۵/۱۴: ۲۰۶/۱۴: ۲۰۷/۱۴: ۲۰۸/۱۴: ۲۰۹/۱۴: ۲۱۰/۱۴: ۲۱۱/۱۴: ۲۱۲/۱۴: ۲۱۳/۱۴: ۲۱۴/۱۴: ۲۱۵/۱۴: ۲۱۶/۱۴: ۲۱۷/۱۴: ۲۱۸/۱۴: ۲۱۹/۱۴: ۲۲۰/۱۴: ۲۲۱/۱۴: ۲۲۲/۱۴: ۲۲۳/۱۴: ۲۲۴/۱۴: ۲۲۵/۱۴: ۲۲۶/۱۴: ۲۲۷/۱۴: ۲۲۸/۱۴: ۲۲۹/۱۴: ۲۳۰/۱۴: ۲۳۱/۱۴: ۲۳۲/۱۴: ۲۳۳/۱۴: ۲۳۴/۱۴: ۲۳۵/۱۴: ۲۳۶/۱۴: ۲۳۷/۱۴: ۲۳۸/۱۴: ۲۳۹/۱۴: ۲۴۰/۱۴: ۲۴۱/۱۴: ۲۴۲/۱۴: ۲۴۳/۱۴: ۲۴۴/۱۴: ۲۴۵/۱۴: ۲۴۶/۱۴: ۲۴۷/۱۴: ۲۴۸/۱۴: ۲۴۹/۱۴: ۲۵۰/۱۴: ۲۵۱/۱۴: ۲۵۲/۱۴: ۲۵۳/۱۴: ۲۵۴/۱۴: ۲۵۵/۱۴: ۲۵۶/۱۴: ۲۵۷/۱۴: ۲۵۸/۱۴: ۲۵۹/۱۴: ۲۶۰/۱۴: ۲۶۱/۱۴: ۲۶۲/۱۴: ۲۶۳/۱۴: ۲۶۴/۱۴: ۲۶۵/۱۴: ۲۶۶/۱۴: ۲۶۷/۱۴: ۲۶۸/۱۴: ۲۶۹/۱۴: ۲۷۰/۱۴: ۲۷۱/۱۴: ۲۷۲/۱۴: ۲۷۳/۱۴: ۲۷۴/۱۴: ۲۷۵/۱۴: ۲۷۶/۱۴: ۲۷۷/۱۴: ۲۷۸/۱۴: ۲۷۹/۱۴: ۲۸۰/۱۴: ۲۸۱/۱۴: ۲۸۲/۱۴: ۲۸۳/۱۴: ۲۸۴/۱۴: ۲۸۵/۱۴: ۲۸۶/۱۴: ۲۸۷/۱۴: ۲۸۸/۱۴: ۲۸۹/۱۴: ۲۹۰/۱۴: ۲۹۱/۱۴: ۲۹۲/۱۴: ۲۹۳/۱۴: ۲۹۴/۱۴: ۲۹۵/۱۴: ۲۹۶/۱۴: ۲۹۷/۱۴: ۲۹۸/۱۴: ۲۹۹/۱۴: ۳۰۰/۱۴: ۳۰۱/۱۴: ۳۰۲/۱۴: ۳۰۳/۱۴: ۳۰۴/۱۴: ۳۰۵/۱۴: ۳۰۶/۱۴: ۳۰۷/۱۴: ۳۰۸/۱۴: ۳۰۹/۱۴: ۳۱۰/۱۴: ۳۱۱/۱۴: ۳۱۲/۱۴: ۳۱۳/۱۴: ۳۱۴/۱۴: ۳۱۵/۱۴: ۳۱۶/۱۴: ۳۱۷/۱۴: ۳۱۸/۱۴: ۳۱۹/۱۴: ۳۲۰/۱۴: ۳۲۱/۱۴: ۳۲۲/۱۴: ۳۲۳/۱۴: ۳۲۴/۱۴: ۳۲۵/۱۴: ۳۲۶/۱۴: ۳۲۷/۱۴: ۳۲۸/۱۴: ۳۲۹/۱۴: ۳۳۰/۱۴: ۳۳۱/۱۴: ۳۳۲/۱۴: ۳۳۳/۱۴: ۳۳۴/۱۴: ۳۳۵/۱۴: ۳۳۶/۱۴: ۳۳۷/۱۴: ۳۳۸/۱۴: ۳۳۹/۱۴: ۳۴۰/۱۴: ۳۴۱/۱۴: ۳۴۲/۱۴: ۳۴۳/۱۴: ۳۴۴/۱۴: ۳۴۵/۱۴: ۳۴۶/۱۴: ۳۴۷/۱۴: ۳۴۸/۱۴: ۳۴۹/۱۴: ۳۵۰/۱۴: ۳۵۱/۱۴: ۳۵۲/۱۴: ۳۵۳/۱۴: ۳۵۴/۱۴: ۳۵۵/۱۴: ۳۵۶/۱۴: ۳۵۷/۱۴: ۳۵۸/۱۴: ۳۵۹/۱۴: ۳۶۰/۱۴: ۳۶۱/۱۴: ۳۶۲/۱۴: ۳۶۳/۱۴: ۳۶۴/۱۴: ۳۶۵/۱۴: ۳۶۶/۱۴: ۳۶۷/۱۴: ۳۶۸/۱۴: ۳۶۹/۱۴: ۳۷۰/۱۴: ۳۷۱/۱۴: ۳۷۲/۱۴: ۳۷۳/۱۴: ۳۷۴/۱۴: ۳۷۵/۱۴: ۳۷۶/۱۴: ۳۷۷/۱۴: ۳۷۸/۱۴: ۳۷۹/۱۴: ۳۸۰/۱۴: ۳۸۱/۱۴: ۳۸۲/۱۴: ۳۸۳/۱۴: ۳۸۴/۱۴: ۳۸۵/۱۴: ۳۸۶/۱۴: ۳۸۷/۱۴: ۳۸۸/۱۴: ۳۸۹/۱۴: ۳۹۰/۱۴: ۳۹۱/۱۴: ۳۹۲/۱۴: ۳۹۳/۱۴: ۳۹۴/۱۴: ۳۹۵/۱۴: ۳۹۶/۱۴: ۳۹۷/۱۴: ۳۹۸/۱۴: ۳۹۹/۱۴: ۴۰۰/۱۴: ۴۰۱/۱۴: ۴۰۲/۱۴: ۴۰۳/۱۴: ۴۰۴/۱۴: ۴۰۵/۱۴: ۴۰۶/۱۴: ۴۰۷/۱۴: ۴۰۸/۱۴: ۴۰۹/۱۴: ۴۱۰/۱۴: ۴۱۱/۱۴: ۴۱۲/۱۴: ۴۱۳/۱۴: ۴۱۴/۱۴: ۴۱۵/۱۴: ۴۱۶/۱۴: ۴۱۷/۱۴: ۴۱۸/۱۴: ۴۱۹/۱۴: ۴۲۰/۱۴: ۴۲۱/۱۴: ۴۲۲/۱۴: ۴۲۳/۱۴: ۴۲۴/۱۴: ۴۲۵/۱۴: ۴۲۶/۱۴: ۴۲۷/۱۴: ۴۲۸/۱۴: ۴۲۹/۱۴: ۴۳۰/۱۴: ۴۳۱/۱۴: ۴۳۲/۱۴: ۴۳۳/۱۴: ۴۳۴/۱۴: ۴۳۵/۱۴: ۴۳۶/۱۴: ۴۳۷/۱۴: ۴۳۸/۱۴: ۴۳۹/۱۴: ۴۴۰/۱۴: ۴۴۱/۱۴: ۴۴۲/۱۴: ۴۴۳/۱۴: ۴۴۴/۱۴: ۴۴۵/۱۴: ۴۴۶/۱۴: ۴۴۷/۱۴: ۴۴۸/۱۴: ۴۴۹/۱۴: ۴۵۰/۱۴: ۴۵۱/۱۴: ۴۵۲/۱۴: ۴۵۳/۱۴: ۴۵۴/۱۴: ۴۵۵/۱۴: ۴۵۶/۱۴: ۴۵۷/۱۴: ۴۵۸/۱۴: ۴۵۹/۱۴: ۴۶۰/۱۴: ۴۶۱/۱۴: ۴۶۲/۱۴: ۴۶۳/۱۴: ۴۶۴/۱۴: ۴۶۵/۱۴: ۴۶۶/۱۴: ۴۶۷/۱۴: ۴۶۸/۱۴: ۴۶۹/۱۴: ۴۷۰/۱۴: ۴۷۱/۱۴: ۴۷۲/۱۴: ۴۷۳/۱۴: ۴۷۴/۱۴: ۴۷۵/۱۴: ۴۷۶/۱۴: ۴۷۷/۱۴: ۴۷۸/۱۴: ۴۷۹/۱۴: ۴۸۰/۱۴: ۴۸۱/۱۴: ۴۸۲/۱۴: ۴۸۳/۱۴: ۴۸۴/۱۴: ۴۸۵/۱۴: ۴۸۶/۱۴: ۴۸۷/۱۴: ۴۸۸/۱۴: ۴۸۹/۱۴: ۴۹۰/۱۴: ۴۹۱/۱۴: ۴۹۲/۱۴: ۴۹۳/۱۴: ۴۹۴/۱۴: ۴۹۵/۱۴: ۴۹۶/۱۴: ۴۹۷/۱۴: ۴۹۸/۱۴: ۴۹۹/۱۴: ۵۰۰/۱۴: ۵۰۱/۱۴: ۵۰۲/۱۴: ۵۰۳/۱۴: ۵۰۴/۱۴: ۵۰۵/۱۴: ۵۰۶/۱۴: ۵۰۷/۱۴: ۵۰۸/۱۴: ۵۰۹/۱۴: ۵۱۰/۱۴: ۵۱۱/۱۴: ۵۱۲/۱۴: ۵۱۳/۱۴: ۵۱۴/۱۴: ۵۱۵/۱۴: ۵۱۶/۱۴: ۵۱۷/۱۴: ۵۱۸/۱۴: ۵۱۹/۱۴: ۵۲۰/۱۴: ۵۲۱/۱۴: ۵۲۲/۱۴: ۵۲۳/۱۴: ۵۲۴/۱۴: ۵۲۵/۱۴: ۵۲۶/۱۴: ۵۲۷/۱۴: ۵۲۸/۱۴: ۵۲۹/۱۴: ۵۳۰/۱۴: ۵۳۱/۱۴: ۵۳۲/۱۴: ۵۳۳/۱۴: ۵۳۴/۱۴: ۵۳۵/۱۴: ۵۳۶/۱۴: ۵۳۷/۱۴: ۵۳۸/۱۴: ۵۳۹/۱۴: ۵۴۰/۱۴: ۵۴۱/۱۴: ۵۴۲/۱۴: ۵۴۳/۱۴: ۵۴۴/۱۴: ۵۴۵/۱۴: ۵۴۶/۱۴: ۵۴۷/۱۴: ۵۴۸/۱۴: ۵۴۹/۱۴: ۵۵۰/۱۴: ۵۵۱/۱۴: ۵۵۲/۱۴: ۵۵۳/۱۴: ۵۵۴/۱۴: ۵۵۵/۱۴: ۵۵۶/۱۴: ۵۵۷/۱۴: ۵۵۸/۱۴: ۵۵۹/۱۴: ۵۶۰/۱۴: ۵۶۱/۱۴: ۵۶۲/۱۴: ۵۶۳/۱۴: ۵۶۴/۱۴: ۵۶۵/۱۴: ۵۶۶/۱۴: ۵۶۷/۱۴: ۵۶۸/۱۴: ۵۶۹/۱۴: ۵۷۰/۱۴: ۵۷۱/۱۴: ۵۷۲/۱۴: ۵۷۳/۱۴: ۵۷۴/۱۴: ۵۷۵/۱۴: ۵۷۶/۱۴: ۵۷۷/۱۴: ۵۷۸/۱۴: ۵۷۹/۱۴: ۵۸۰/۱۴: ۵۸۱/۱۴: ۵۸۲/۱۴: ۵۸۳/۱۴: ۵۸۴/۱۴: ۵۸۵/۱۴: ۵۸۶/۱۴: ۵۸۷/۱۴: ۵۸۸/۱۴: ۵۸۹/۱۴: ۵۹۰/۱۴: ۵۹۱/۱۴: ۵۹۲/۱۴: ۵۹۳/۱۴: ۵۹۴/۱۴: ۵۹۵/۱۴: ۵۹۶/۱۴: ۵۹۷/۱۴: ۵۹۸/۱۴: ۵۹۹/۱۴: ۶۰۰/۱۴: ۶۰۱/۱۴: ۶۰۲/۱۴: ۶۰۳/۱۴: ۶۰۴/۱۴: ۶۰۵/۱۴: ۶۰۶/۱۴: ۶۰۷/۱۴: ۶۰۸/۱۴: ۶۰۹/۱۴: ۶۱۰/۱۴: ۶۱۱/۱۴: ۶۱۲/۱۴: ۶۱۳/۱۴: ۶۱۴/۱۴: ۶۱۵/۱۴: ۶۱۶/۱۴: ۶۱۷/۱۴: ۶۱۸/۱۴: ۶۱۹/۱۴: ۶۲۰/۱۴: ۶۲۱/۱۴: ۶۲۲/۱۴: ۶۲۳/۱۴: ۶۲۴/۱۴: ۶۲۵/۱۴: ۶۲۶/۱۴: ۶۲۷/۱۴: ۶۲۸/۱۴: ۶۲۹/۱۴: ۶۳۰/۱۴: ۶۳۱/۱۴: ۶۳۲/۱۴: ۶۳۳/۱۴: ۶۳۴/۱۴: ۶۳۵/۱۴: ۶۳۶/۱۴: ۶۳۷/۱۴: ۶۳۸/۱۴: ۶۳۹/۱۴: ۶۴۰/۱۴: ۶۴۱/۱۴: ۶۴۲/۱۴: ۶۴۳/۱۴: ۶۴۴/۱۴: ۶۴۵/۱۴: ۶۴۶/۱۴: ۶۴۷/۱۴: ۶۴۸/۱۴: ۶۴۹/۱۴: ۶۵۰/۱۴: ۶۵۱/۱۴: ۶۵۲/۱۴: ۶۵۳/۱۴: ۶۵۴/۱۴: ۶۵۵/۱۴: ۶۵۶/۱۴: ۶۵۷/۱۴: ۶۵۸/۱۴: ۶۵۹/۱۴: ۶۶۰/۱۴: ۶۶۱/۱۴: ۶۶۲/۱۴: ۶۶۳/۱۴: ۶۶۴/۱۴: ۶۶۵/۱۴: ۶۶۶/۱۴: ۶۶۷/۱۴: ۶۶۸/۱۴: ۶۶۹/۱۴: ۶۷۰/۱۴: ۶۷۱/۱۴: ۶۷۲/۱۴: ۶۷۳/۱۴: ۶۷۴/۱۴: ۶۷۵/۱۴: ۶۷۶/۱۴: ۶۷۷/۱۴: ۶۷۸/۱۴: ۶۷۹/۱۴: ۶۸۰/۱۴: ۶۸۱/۱۴: ۶۸۲/۱۴: ۶۸۳/۱۴: ۶۸۴/۱۴: ۶۸۵/۱۴: ۶۸۶/۱۴: ۶۸۷/۱۴: ۶۸۸/۱۴: ۶۸۹/۱۴: ۶۹۰/۱۴: ۶۹۱/۱۴: ۶۹۲/۱۴: ۶۹۳/۱۴: ۶۹۴/۱۴: ۶۹۵/۱۴: ۶۹۶/۱۴: ۶۹۷/۱۴: ۶۹۸/۱۴: ۶۹۹/۱۴: ۷۰۰/۱۴: ۷۰۱/۱۴: ۷۰۲/۱۴: ۷۰۳/۱۴: ۷۰۴/۱۴: ۷۰۵/۱۴: ۷۰۶/۱۴: ۷۰۷/۱۴: ۷۰۸/۱۴: ۷۰۹/۱۴: ۷۱۰/۱۴: ۷۱۱/۱۴: ۷۱۲/۱۴: ۷۱۳/۱۴: ۷۱۴/۱۴: ۷۱۵/۱۴: ۷۱۶/۱۴: ۷۱۷/۱۴: ۷۱۸/۱۴: ۷۱۹/۱۴: ۷۲۰/۱۴: ۷۲۱/۱۴: ۷۲۲/۱۴: ۷۲۳/۱۴: ۷۲۴/۱۴: ۷۲۵/۱۴: ۷۲۶/۱۴: ۷۲۷/۱۴: ۷۲۸/۱۴: ۷۲۹/۱۴: ۷۳۰/۱۴: ۷۳۱/۱۴: ۷۳۲/۱۴: ۷۳۳/۱۴: ۷۳۴/۱۴: ۷۳۵/۱۴: ۷۳۶/۱۴: ۷۳۷/۱۴: ۷۳۸/۱۴: ۷۳۹/۱۴: ۷۴۰/۱۴: ۷۴۱/۱۴: ۷۴۲/۱۴: ۷۴۳/۱۴: ۷۴۴/۱۴: ۷۴۵/۱۴: ۷۴۶/۱۴: ۷۴۷/۱۴: ۷۴۸/۱۴: ۷۴۹/۱۴: ۷۵۰/۱۴: ۷۵۱/۱۴: ۷۵۲/۱۴: ۷۵۳/۱۴: ۷۵۴/۱۴: ۷۵۵/۱۴: ۷۵۶/۱۴: ۷۵۷/۱۴: ۷۵۸/۱۴: ۷۵۹/۱۴: ۷۶۰/۱۴: ۷۶۱/۱۴: ۷۶۲/۱۴: ۷۶۳/۱۴: ۷۶۴/۱۴: ۷۶۵/۱۴: ۷۶۶/۱۴: ۷۶۷/۱۴: ۷۶۸/۱۴: ۷۶۹/۱۴: ۷۷۰/۱۴: ۷۷۱/۱۴: ۷۷۲/۱۴: ۷۷۳/۱۴: ۷۷۴/۱۴: ۷۷۵/۱۴: ۷۷۶/۱۴: ۷۷۷/۱۴: ۷۷۸/۱۴: ۷۷۹/۱۴: ۷۸۰/۱۴: ۷۸۱/۱۴: ۷۸۲/۱۴: ۷۸۳/۱۴: ۷۸۴/۱۴: ۷۸۵/۱۴: ۷۸۶/۱۴: ۷۸۷/۱۴: ۷۸۸/۱۴: ۷۸۹/۱۴: ۷۹۰/۱۴: ۷۹۱/۱۴: ۷۹۲/۱۴: ۷۹۳/۱۴: ۷۹۴/۱۴: ۷۹۵/۱۴: ۷۹۶/۱۴: ۷۹۷/۱۴: ۷۹۸/۱۴: ۷۹۹/۱۴: ۸۰۰/۱۴: ۸۰۱/۱۴: ۸۰۲/۱۴: ۸۰۳/۱۴: ۸۰۴/۱۴: ۸۰۵/۱۴: ۸۰۶/۱۴: ۸۰۷/۱۴: ۸۰۸/۱۴: ۸۰۹/۱۴: ۸۱۰/۱۴: ۸۱۱/۱۴: ۸۱۲/۱۴: ۸۱۳/۱۴: ۸۱۴/۱۴: ۸۱۵/۱۴: ۸۱۶/۱۴: ۸۱۷/۱۴: ۸۱۸/۱۴: ۸۱۹/۱۴: ۸۲۰/۱۴: ۸۲۱/۱۴: ۸۲۲/۱۴: ۸۲۳/۱۴: ۸۲۴/۱۴: ۸۲۵/۱۴: ۸۲۶/۱۴: ۸۲۷/۱۴: ۸۲۸/۱۴: ۸۲۹/۱۴: ۸۳۰/۱۴: ۸۳۱/۱۴: ۸۳۲/۱۴: ۸۳۳/۱۴: ۸۳۴/۱۴: ۸۳۵/۱۴: ۸۳۶/۱۴: ۸۳۷/۱۴: ۸۳۸/۱۴: ۸۳۹/۱۴: ۸۴۰/۱۴: ۸۴۱/۱۴: ۸۴۲/۱۴: ۸۴۳/۱۴: ۸۴۴/۱۴: ۸۴۵/۱۴: ۸۴۶/۱۴: ۸۴۷/۱۴: ۸۴۸/۱۴: ۸۴۹/۱۴: ۸۵۰/۱۴: ۸۵۱/۱۴: ۸۵۲/۱۴: ۸۵۳/۱۴: ۸۵۴/۱۴: ۸۵۵/۱۴: ۸۵۶/۱۴: ۸۵۷/۱۴: ۸۵۸/۱۴: ۸۵۹/۱۴: ۸۶۰/۱۴: ۸۶۱/۱۴: ۸۶۲/۱۴: ۸۶۳/۱۴: ۸۶۴/۱۴: ۸۶۵/۱۴: ۸۶۶/۱۴: ۸۶۷/۱۴: ۸۶۸/۱۴: ۸۶۹/۱۴: ۸۷۰/۱۴: ۸۷۱/۱۴: ۸۷۲/۱۴: ۸۷۳/۱۴: ۸۷۴/۱۴: ۸۷۵/۱۴: ۸۷۶/۱۴: ۸۷۷/۱۴: ۸۷۸/۱۴: ۸۷۹/۱۴: ۸۸۰/۱۴: ۸۸۱/۱۴: ۸۸۲/۱۴: ۸۸۳/۱۴: ۸۸۴/۱۴: ۸۸۵/۱۴: ۸۸۶/۱۴: ۸۸۷/۱۴: ۸۸۸/۱۴: ۸۸۹/۱۴: ۸۹۰/۱۴: ۸۹۱/۱۴: ۸۹۲/۱۴: ۸۹۳/۱۴: ۸۹۴/۱۴: ۸۹۵/۱۴: ۸۹۶/۱۴: ۸۹۷/۱۴: ۸۹۸/۱۴: ۸۹۹/۱۴: ۹۰۰/۱۴: ۹۰۱/۱۴: ۹۰۲/۱۴: ۹۰۳/۱۴: ۹۰۴/۱۴: ۹۰۵/۱۴: ۹۰۶/۱۴: ۹۰۷/۱۴: ۹۰۸/۱۴: ۹۰۹/۱۴: ۹۱۰/۱۴: ۹۱۱/۱۴: ۹۱۲/۱۴: ۹۱۳/۱۴: ۹۱۴/۱۴: ۹۱۵/۱۴: ۹۱۶/۱۴: ۹۱۷/۱۴: ۹۱۸/۱۴: ۹۱۹/۱۴: ۹۲۰/۱۴: ۹۲۱/۱۴: ۹۲۲/۱۴: ۹۲۳/۱۴: ۹۲۴/۱۴: ۹۲۵/۱۴: ۹۲۶/۱۴: ۹۲۷/۱۴: ۹۲۸/۱۴: ۹۲۹/۱۴: ۹۳۰/۱

کہ آگے چل کر بتایا جائے گا) اعمال کے نتائج اس دنیا میں بھی سامنے آجاتے ہیں۔ اس اعتبار سے کہا کہ
 اقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَ هُمْ فِي غَفْلَةٍ مُّعْرِضُونَ ۝ (۲۱/۱) لوگوں کے حساب کا وقت قریب
 آ رہا ہے لیکن وہ ابھی تک حقائق سے منہ موڑے خواب غفلت میں پڑے سو رہے ہیں۔ دنیا میں جس قدر فساد پر پا
 ہے اور لوگ دھاندلی مچا رہے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ انہیں ”یوم حساب“ (خدا کے قانونِ مکافات) پر یقین
 نہیں یہی وہ لوگ ہیں جن کے ہر امن پسند کو پناہ مانگنی چاہیئے۔ جب حضرت موسیٰؑ نے اپنے پیغام کے خلاف
 فرعون کا ردِ عمل دیکھا تو ان کی زبان پر بے ساختہ آگیا کہ اِنِّیْ عَذْتُ بِرَبِّیْ وَ رَبِّکُمْ مِّنْ کُلِّ مُتَكَبِّرٍ
 لَا یُؤْتِیْ مِنْ رَّیْثِهِمُ الْحِسَابَ ۝ (۲۰/۲۷) میں ہر اس متکبر سے محفوظ رہنے کے لئے جو یوم حساب پر ایمان
 نہیں رکھتا، خدا کی پناہ میں آجانا چاہتا ہوں۔

پھر جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، ہر شخص اپنے اعمال کا آپ ذمہ دار ہے۔ اس لئے قرآن کریم نے اسے بھی
 واضح کر دیا کہ ہر ایک کا حساب اپنا اپنا ہوگا۔ حتیٰ کہ اس باب میں رسول بھی افراد امت کے حساب میں شریک
 نہیں ہوتا۔ چنانچہ نبی اکرمؐ سے واضح الفاظ میں کہہ دیا گیا کہ مَا عَلَیْكَ مِنْ حِسَابٍ بِهَمْ مِّنْ شَیْءٍ
 وَ مَا مِنْ حِسَابٍ لَّکَ عَلَیْهِمْ مِّنْ شَیْءٍ ۝ (۶/۵۲) نہ ان کے اعمال کا حساب تمہارے ذمہ ہے
 اور نہ ہی تمہارے اعمال کا حساب ان کے ذمے۔

بغیر حساب

شہدِ ان کریمؐ میں بعض مقامات کہا گیا ہے کہ لوگوں کو ان کے اعمال کا اجر ”بغیر حساب“ ملے گا۔
 مثلاً سورہ زمر میں ہے۔ اِنَّمَا یُؤْتِی الْضَّالِّیْنَ اَجْرَهُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ ۝ (۳۹/۱۰) جو لوگ
 مشکلات کے وقت ثابت قدم رہتے ہیں، انہیں ان کا بدلہ ”بغیر حساب“ کے ملتا ہے یا مثلاً رزق کے معاملہ
 میں بعض مقامات میں کہا گیا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ یَزِدُّكَ مِنْ یَّشَاءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ
 (۳/۳۶؛ ۲۴/۳۸؛ ۴۰/۴۰) اس کے یہ معنی نہیں کہ خدا کے ہاں کوئی قاعدہ اور قانون مقرر نہیں اور
 وہ یونہی بلا حساب دے دیتا ہے۔ یہ شہدِ ان کریمؐ کی ساری تعلیم کے خلاف ہے۔ خدا کے ہاں ہر بات قاعدہ
 اور پیمانے کے مطابق ہوتی ہے۔ ان آیات میں ”بغیر حساب“ کے معنی یہ ہیں کہ جو شخص قانونِ خداوندی
 کے مطابق کوئی کام کرتا ہے تو اس کا خوشگوار نتیجہ اس کے اپنے اندازے اور خیال سے بھی بڑھ کر

مرتب ہوتا ہے۔ چنانچہ سورۃ طلاق میں ہے کہ جو شخص قانونِ خداوندی کی نگہداشت کرے، خواہ بظاہر حالات کیسے ہی نامساعد کیوں نہ ہوں۔ **يَنْزِلُ لَهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ** (۹۵/۳) خدا سے ایسے مقامات سے رزق دیتا ہے جو اس کے سامان و گمان میں بھی نہیں ہوتے۔ اس کے برعکس جن سرکش اور عہد شکن یہودیوں کو مسلمانوں کے ہاتھوں شکست ملی تھی۔ ان کے متعلق کہا کہ **فَأَنفَعُ اللَّهُ مِنْ حَيْثُ كَمْ يَحْتَسِبُونَ** (۵۹/۲) خدا (کا عذاب) ان پر ان راستوں سے آگیا جو ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھے۔

بنابریں جن آیات میں کہا گیا ہے کہ خدا "بغیر حساب" دیتا ہے وہاں مراد یہ ہے کہ وہ اتنا دیتا ہے جو خود اس شخص کے اپنے انداز سے اور حساب سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔ خدا کے پیمانے انسانی پیمانوں سے مختلف ہوتے ہیں۔

قوموں کا حساب

یہ حساب افراد ہی کا نہیں ہوتا، قانونِ مکافات کی رو سے قوموں کے اعمال کا بھی محاسبہ ساتھ کے ساتھ ہوتا رہتا ہے۔ سورۃ طلاق میں ہے۔

وَكَايُنْ مِنْ قَرْيَةٍ عَتَتْ عَنْ أَمْرِ رَبِّهَا وَرُسُلِهِ فَحَاسَبْنَاهَا حِسَابًا شَدِيدًا وَعَذَبْنَاهَا عَذَابًا نَكِرًا (۷۵/۸)۔

کتنی قومیں ایسی تھیں جنہوں نے احکاماتِ خداوندی اور پیغاماتِ رسالت سے سرکشی برتی تو ہم نے ان کا سخت محاسبہ کیا اور انہیں تباہ کن عذاب کا مزہ چکھایا۔

خدا کی گرفت

اس محاسبہ کو کہیں خدا کی گرفت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ سورۃ بروج میں ہے۔ **إِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيدٌ** (۸۵/۱۲) یہ حقیقت ہے کہ تیرے رب کی گرفت بڑی سخت ہوتی ہے۔ دوسری جگہ اسے **الْبَطْشَةُ الْكُبْرَى** کہا گیا ہے (۴۴/۱۶)۔

جو مجرم ارتکابِ جرم کے بعد کہیں بھاگ جائے پولیس اس کا تعاقب کرتی ہے۔ کبھی وہ اسے پکڑنے میں کامیاب ہو جاتی ہے اور کبھی اس کا سراغ نہیں لگتا اور وہ گرفت سے بچ جاتا ہے قرآن کریم نے اس

چوتھا باب

اعمال نامہ

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، انسان کے ہر عمل کا نتیجہ اس کی ذات پر مرتب ہوتا چلا جاتا ہے اور اس طرح اس کی ذات، اس کے تمام اعمال کو اپنے اندر محفوظ کر لیتی ہے۔ اس طرح اس کی ذات پر مرتب شدہ نقوش، اس کا اعمال نامہ ہے۔ یوں سمجھئے کہ انسانی زندگی کی ہر نقل و حرکت (حتیٰ کہ اس کے دل میں گزرنے والے خیالات تک) کی ایک فلم ساتھ کے ساتھ تیار ہوتی جاتی ہے اور ظہورِ نتائج کے وقت، یہی فلم سکرین (پردہ) پر سامنے آ جاتی ہے۔ لیکن چونکہ قرآن کریم میں، اس قانون کی کار فرمائی کو دنیاوی نظامِ عدل کی تشبیہات کی رُو سے سمجھایا گیا ہے اس لئے کہیں یہ کہا گیا ہے کہ تمہارا کوئی عمل خدا کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں۔ (اور ظاہر ہے کہ جس جرم کے عینی معتبر گواہ موجود ہیں، اسے ثابت کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی)۔ کہیں یہ کہا گیا ہے کہ ہماری خفیہ پولیس کے نہایت دیانتدار پرچہ نویس، ساتھ کے ساتھ تمہاری ڈائری مرتب کرتے چلے جاتے ہیں۔ یہ سارا ریکارڈ عدالت میں پیش ہوگا اور اس کی رُو سے تمہارے مقدمات کا فیصلہ کیا جائے گا۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے علمِ خداوندی کی بات سامنے آتی ہے جسے (یوں کہنے کا ایک عینی گواہ کی حیثیت دی گئی ہے۔

خدا تمہارے اعمال سے باخبر ہے

سب سے پہلے قرآن کریم نے انسان کی اس بنیادی غلط فہمی کو لیا جس کی وجہ سے وہ ارتکابِ جرم کرتا ہے۔ اس لئے کہا:

أَيَحْسَبُ أَنْ لَمْ يَرَهُ أَحَدٌ (۹)

کیا وہ یہ سمجھتا ہے کہ اسے کوئی دیکھ ہی نہیں رہا۔

اس کے بعد کہا کہ یہ غلط ہے کہ انسان کبھی تنہا بھی ہوتا ہے۔ جس وقت وہ سمجھتا ہے کہ وہ بالکل تنہا ہے، اس کے پاس کوئی اور نہیں، اس وقت بھی اس کے پاس ”کوئی“ ہوتا ہے۔ اور یہ دوسرا ساتھ ہونے (یا رہنے والا) خود خدا ہے۔ وَ هُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنْتُمْ (۵۷/۴) وہ تمہارے ساتھ ہوتا ہے جہاں کہیں بھی تم ہو۔ وَ اللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ (۵۷/۴) اور جو کچھ بھی تم کرتے ہو وہ اسے دیکھ رہا ہوتا ہے۔ ذرا غور کیجئے! اگر انسان کو اس بات کا یقین ہو کہ میں جہاں بھی ہوں اور جو کچھ بھی کروں، اسے خدا دیکھتا ہے، تو ایسا انسان کبھی دانستہ قانون شکنی کر ہی نہیں سکتا۔ جرم کا ارتکاب تو بالعموم کیا ہی اس یقین (یا کم از کم اس مفروضہ) کے ماتحت جاتا ہے کہ مجھے کوئی نہیں دیکھتا۔ خدا! انسان کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ إِنَّ اللَّهَ بِمَا يَعْمَلُونَ كَبِيرٌ (۳/۱۱۹) دوسری جگہ ہے۔ وَ اللَّهُ مِنْ قَرَابِهِمْ تُحِيطُ (۸۵/۲۰) خدا! انسان کو ہر طرف سے محیط ہے۔ سورۃ الفجر میں ہے۔ إِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ (۸۹/۱۳) خدا ہر وقت تمہاری گھات میں ہوتا ہے۔

پھر یہی نہیں کہ جس وقت تم سے کوئی عمل محسوس طور پر سرزد ہوتا ہے وہ اُسے اُس وقت دیکھتا ہے۔ وہ انسان کے دل میں گزرنے والے خیالات تک کا علم رکھتا ہے۔ سورۃ ق میں ہے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ وَ نَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهِ نَفْسُهُ ۖ وَ نَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ (۵۰/۱۶)۔

ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے اور اس کے دل میں گزرنے والے خیالات تک سے واقف ہیں (اس لئے کہ) ہم اس کی رگِ جاں سے بھی زیادہ اس کے قریب ہوتے ہیں۔

دوسری جگہ ہے يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْأَعْيُنِ وَ مَا تَخْفَى الصُّدُورُ (۴۰/۱۹) وہ لگا ہونگی خیانتوں اور دل کے رازوں تک کو جانتا ہے۔ انسان خواہ کتنے ہی خفیہ مشورے کرے، وہ خدا سے پوشیدہ نہیں رہ سکتے۔ اس لئے کہ ”جب تم میں مل کر خفیہ مشورہ کرتے ہو تو وہ چوتھا وہاں موجود ہوتا ہے اور جب تم پانچ مل کر مشورہ کرتے ہو تو وہ چھٹا وہاں موجود ہوتا ہے۔“ یہ ”پانچ اور چھ“ تو محض بات سمجھانے کے لئے کہا گیا ہے۔ مشورہ کرنے والے کتنے ہی کیوں نہ ہوں هُوَ مَعَهُمْ أَيْنَ مَا كَانُوا (۵۸/۷) وہ

ان کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس لئے انسان کا کوئی راز بھی خدا کی نگاہوں سے مستور نہیں رہ سکتا۔ لَا تَخْفَى مِنْكَ خَافِيَةٌ ۝ (۱۸/۶۹)۔ اس لئے کہ وہ عَالِمِ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ (۸/۶۲) ہے۔ اس کے نزدیک مستور مشہور سب یکساں ہیں۔ کوئی اونچے بات کرے یا چپکے سے کوئی دن کی روشنی میں کھلے بندوں چلے یا رات کی تاریکی میں دبے پاؤں، اس کے نزدیک اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا (۱۰/۱۳)۔ اس کا دیکھنا ایسا ہے کہ لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَ هُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ ۚ (۴/۱۰۴) کوئی آنکھ اسے نہیں دیکھ سکتی (اس کا ادراک تک نہیں کر سکتی) لیکن وہ ہر آنکھ کا ادراک کرتا ہے۔ اس لئے وہ انسانی اعمال کے ایک ایک ذرے کو سامنے لے آئے گا۔ خواہ وہ زمین و آسمان میں کسی جگہ ہو اور پتھر کی چٹانوں کے اندر بھی چھپا ہوا کیوں نہ ہو (۱۴/۲۱)۔ اس لئے کہ يَعْلَمُ السِّرَّ فِي السَّمَوَاتِ وَ الْأَرْضِ ۝ (۶/۲۵) وہ کائنات کے تمام سربستہ اسرار سے واقف ہے۔ وَ اللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ (۶۴/۲۲؛ ۵۴/۳۳؛ ۷۸/۴۵؛ ۱۲/۶۵) وہ ہر شے کا علم رکھتا ہے۔ (وَ) يَعْلَمُ مَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ ۝ (۲۲/۱۳) اور ہر انسان کے ہر عمل کا علم بھی۔ (نیز ۴۱/۲۴)۔

اس حقیقت کو قرآن کریم نے اس تکرار و اصرار سے دہرایا ہے کہ ان تمام آیات کا درج کرنا طوالت پذیر ہے۔ کہیں اس نے کہا ہے کہ وَ مَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ۝ (۴۴/۲) ”جو کچھ تم کرتے ہو خدا اس سے غافل نہیں۔“ (اسے قریب دس مقامات پر دہرایا گیا ہے)۔ کہیں کہا ہے کہ وَ اللَّهُ بِصِيرٍ بِمَا تَعْمَلُونَ (۹۶/۲) اللہ لوگوں کے اعمال کو دیکھتا ہے۔ (یہ الفاظ کم و بیش بیس مقامات پر آئے ہیں)۔ کہیں کہا ہے کہ وَ اللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ (۲۳۴/۲) اللہ تمہارے اعمال سے باخبر ہے۔ اور کہیں یہ کہ وَ اللَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ (۱۵۳/۲) اللہ تمہارے دل کی باتوں سے بھی باخبر ہے۔ (اس عنوان کو بیس کچیس مقامات پر سامنے لایا گیا ہے)۔

تحریری ریکارڈ

اس حقیقت کو بیشتر مقامات میں ان الفاظ میں پیش کیا گیا ہے کہ سَنَكْتُبُ مَا يَقُولُ (۹۹/۱۹) جو کچھ (انسان) کہتا ہے ہم اسے لکھ لیتے ہیں۔ دوسری جگہ ہے۔ وَ إِنَّا لَهُ كَاتِبُونَ (۹۴/۲۱) اور ہم اس کے ہر عمل کو لکھ لیتے ہیں۔ سورۃ یٰسٰی میں ہے۔ وَ تَكْتُبُ مَا قَدَّمُوا وَ آثَرَهُمْ ۚ وَ كُلُّ شَيْءٍ أَحْصَيْنَاهُ فِي إِمَامٍ مُّبِينٍ ۝ (۱۲۱/۳۶)؛ (۲۹/۷۸) جو کچھ انسان اپنے اعمال سے آگے بھیجتا ہے ہم اسے

بھی لکھ لیتے ہیں اور جو نقوش یہ پیچھے چھوڑ جاتا ہے انہیں بھی محفوظ کر لیا جاتا ہے۔ ہم اس کی ہر بات کو ایک کھلے ہوئے رجسٹر میں درج کرتے جاتے ہیں۔ اَخْطِئْتُ اللّٰهَ وَ نَسُوهُ (۵۸/۶) انسان تو بھول جاتا ہے کہ اس نے کیا کیا تھا لیکن خدا کے اس ریکارڈ سے ایک حرف بھی محو نہیں ہوتا۔

کہیں اس حقیقت کو اس انداز سے بیان کیا گیا ہے کہ ہر انسان کے ساتھ ہمارے نقشہ کردہ محافظ متعین ہیں جو اس کی ہر بات کو ریکارڈ کرتے رہتے ہیں کہ لَوْ مَعْقُوبَاتٌ مِّنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَ مِنْ خَلْفِهِ يَحْفَظُوْنَہُ مِّنْ اَمْرِ اللّٰهِ (۱۱/۱۳) اس کے آگے اور پیچھے نگران مقرر ہیں جو اس کی ہر بات کو بحکم خداوندی محفوظ کئے جاتے ہیں۔ کوئی لفظ اس کی زبان سے نہیں نکلتا کہ یہ ٹیپ ریکارڈر (TAPE RECORDER) اسے ریکارڈ نہ کر لیتا ہو (۵۰/۱۸)۔ سورۃ انفطار میں ان ریکارڈ کرنے والوں کو عَمَّا نَکَاثِبُیْنَ (۸۲/۱۱) کہہ کر پکارا گیا ہے۔ یعنی نہایت واجب التکریم ریکارڈ کیپر۔ یہی وہ پہرے دار ہیں جن کی نگاہوں سے انسان کا کوئی عمل پوشیدہ نہیں رہتا (۸۶/۴)۔

یہ ”رجسٹر“ کہیں چھپا کر نہیں رکھا گیا۔ نہ ہی اس کے اندراجات ایسی باطنی زبان میں کئے گئے ہیں جنہیں ہر کوئی پڑھ نہ سکے۔ یہ رجسٹر کتاب مبین ہے (۱۰/۶۱)۔ یعنی بالکل صاف، واضح، کھلی ہوئی کتاب۔ (یزہ/۲۶) ۳/۳۲۔ وَ کُلُّ شَیْءٍ فَخْرُوْهُ فِی الزُّبْرِہِ وَ کُلُّ صَغِیْرٍ وَ کَبِیْرٍ مُّسْتَقْبَرُوْہُ (۵۲-۵۳/۵۴) جو کچھ بھی لوگ کرتے ہیں وہ ان کی کتابوں میں درج ہو جاتا ہے۔ ہر چھوٹا اور بڑا عمل ضبطِ تحریر میں آ جاتا ہے۔ جب فرعون نے حضرت موسیٰ سے پوچھا کہ ہمارے جو اسلاف پہلے گزر چکے ہیں وہ کس حالت میں ہیں، تو انہوں نے جواب دیا کہ عَلِمُہَا عِنْدَ رَبِّیْ فِیْ کِتٰبٍ۔ ان کے متعلق میرے خدا کے ہاں ایکس رجسٹر میں سب کچھ درج ہے۔ لَا یُضِلُّ رَبِّیْ وَلَا یَنْسِی (۵۱-۵۲/۲۰) وہ نہ تو کچھ بھولتا ہی ہے کہ درج ہونے سے رہ جائے اور نہ ہی حساب کرنے میں غلطی کرتا ہے۔ یہی وہ ”کتاب“ ہے جس کے متعلق کہہ دیا کہ یَنْطِقُ بِاَلْحَقِّ۔ وہ بالکل حق کے ساتھ (حقیقت کے مطابق) بات کرتی ہے۔ وَ هُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ (۲۳/۶۲) اس لئے اس کے مطابق فیصلہ کرنے میں کسی پر کسی قسم کے ظلم اور زیادتی کا امکان ہی نہیں۔ یہی وہ کتاب (اعمال نامہ) ہے کہ اُسے جن کے ”دائیں ہاتھ“ میں دیا جائے گا وہ صاحبِ مین و سعاد ہوں گے اور زندگی کی خوش بختیوں اور سرفرازیوں کے حامل (۶۹/۱۹) اور جن کے ”بائیں ہاتھ“ میں دیا جائیگا وہ سہیٹ کر رہ جائیں گے اور کہیں گے کہ یَلِیْسَ لَہُمْ اَوْفَتْ کِتٰبِہٖ ؕ وَ لَمْ اَدْرِ مَا حِسَابِہٖ ؕ

(۲۵-۶۹/۲۶) اے کاش! مجھے یہ اعمالِ نامہ نہ ہی ملا ہوتا تو اچھا تھا۔ یہ میرا حساب میرے سامنے کیوں آگیا۔ اس کا مجھے علم نہ ہی ہوتا تو ٹھیک تھا۔ (نیز ۷۷-۸۴/۱۱)۔ اس وقت انسان کے سارے بھید کھل جائیں گے۔ (یَوْمَ تُبْلَى السَّرَائِرُ ۸۶/۹)۔ وَحُصِّلَ مَا فِي الصُّدُورِ (۱۰۰/۱۰) اور دلوں کے راز باہر آجائیں گے۔ اس مقام پر ذرا رکئے۔ ہم اس دنیا میں ہزاروں اشخاص سے ملتے ہیں۔ ہم کیر کڑ کے اعتبار سے (اندیسے) کچھ اور ہوتے ہیں لیکن بظاہر ان سے کسی اور طرح معاملہ کرتے ہیں اور اس طرح ان کی نظروں میں بڑے معتبر بنے رہتے ہیں۔ ہم اپنے دوستوں کو اپنے خلوص اور دیانت کا یقین دلاتے رہتے ہیں لیکن دل میں ان کے متعلق کچھ اور ہی خیالات رکھتے ہیں۔ ہم اپنے ملنے والوں کی نگاہوں میں بڑے مقدس اور پاکباز بنے رہتے ہیں کیونکہ ہماری حقیقت ان کے سامنے نہیں آنے پاتی۔ ہم اسی طرح معتبر اور محترم علیہ بنے دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔

اب ذرا تصور میں لائیے اس منظر کو کہ وہ تمام لوگ ہمارے سامنے بیٹھے ہوں جن کی نگاہوں میں ہم نے اپنے آپ کو اس قدر دیانتدار، پاکیزہ، مقدس، پر خلوص، صادق بن کر دکھایا تھا اور ان کی موجودگی میں ہماری اصل حقیقت اس طرح واشگاف طور پر سامنے آجائے کہ کسی کو اس میں کسی طرح کا شک و شبہ نہ رہے تو سوچئے کہ اس وقت ہمارا حشر کیا ہوگا؟ کیا اس سے بڑھ کر کوئی اور عذاب بھی ہو سکتا ہے کہ انسان ان کی نظروں میں بے نقاب ہو جائے جن میں وہ بڑا معتبر بنا رہا تھا؟ یہ ہے جو کچھ انسان کا یہ ”اعمالِ نامہ“ کرے گا۔

لیکن (جیسا کہ پہلے بھی بتایا جا چکا ہے) یہ اعمالِ نامہ یہ کتابِ مبین کہیں باہر نہیں ہے۔ کُلَّ إِنْسَانٍ أَلْزَمْنَاهُ طَائِرًا فِي عُنُقِهِ ۚ وَهَرِاسَانِ كَامِعَالِ نَامِهْ خُودِاسْ كِیْ گُردنِ مِیْنِ لَنَکْ رِہا ہِے۔ وَنَخْرِجُ لَهُ يَوْمَ الْقِيَمَةِ كِتَابًا يَتْلُوهُ ۚ مَنشُورًا ۚ فَرَقْ صَرَفِ اتنا ہِے کہ اس وقت وہ پٹا ہوا ہے۔ ظہورِ نتائج کے وقت اسے کھول دیا جائے گا اور انسان سے کہا جائے گا کہ اقْرَأْ کِتَابَکَ ۚ تو اپنا اعمالِ نامہ خود آپ پڑھ۔ کَفَىٰ بِنَفْسِکَ الْيَوْمَ عَلَیْکَ حَسِیْبًا ۚ (۱۳-۱۴/۱۴) اور اپنا حساب بھی آپ ہی کرے۔ تو اپنا حساب کرنے کے لئے خود آپ کافی ہے۔ اس کے لئے کہیں باہر سے اکاؤنٹنٹ یا آڈیٹر بلانے کی ضرورت نہیں۔ یہ اعمالِ نامہ انسان کی اپنی ذات ہے جس پر اس کے ہر عمل کا نتیجہ منقوش ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس لئے انسان اپنے اعمال کا کاتب بھی آپ ہے اور محاسب بھی آپ۔ یہی وہ اعمالِ نامہ ہے جس کے بے نقاب ہو جانے سے بحرین چیخ اٹھیں گے (۱۸/۲۹)۔ اس وقت انسان کی کیفیت

ہے کہ وہ دوسرے لوگوں سے اپنی حقیقت کو چھپاتا ہے اور اگر اس کا کوئی عیب ظاہر ہونے لگتا ہے تو ایسے گواہ پیدا کر لیتا ہے جو اس کی پاک بازی کی شہادت دے دیں۔ یہ کچھ تو وہ دوسروں کو دھوکا دینے کے لئے کرتا ہے۔ جہاں تک اس کی اپنی ذات کا تعلق ہے اس کی اپنی عقل فریب کار اس کے ہر غلط کام کے جواز میں بیسیوں نگاہ فریب و بیلین تراش کر اسے دھوکے میں رکھتی ہے یا یوں کہیے کہ وہ اس طرح خود اپنے آپ کو دھوکا دے لیتا ہے۔ لیکن ظہور نتائج کے وقت صورت اس کے بالکل برعکس ہوگی۔ اس وقت

بَلِ الْإِنْسَانُ عَلَىٰ نَفْسِهِ بَصِيرَةٌ ۚ ۝ ذَٰلَٰكَ أَلْقَىٰ مَعَاذِ مُرْسِكِ ۖ ۝ (۱۳۱-۱۵/۷۵) انسان خود اپنے خلاف آپ گواہی دے گا اور خود فریبی کے لئے جو جھوٹے بہانے اس نے اس سے پہلے تراشے تھے، ان سب کی تردید آپ کر دے گا۔

یوں انسان کا ہر عمل نتیجہ خیز ہو کر رہے گا۔ افراد کا بھی اور اقوام کا بھی (۱۳۱/۲۸)۔ لیکن اقوام کے متعلق ہم گفتگو آگے چل کر کریں گے۔

پانچواں باب

لِقَاءِ رَبِّ

مجسّم کو جب ارتکابِ جرم کے بعد، سزا کا احساس ہوتا ہے تو وہ فرار ہو جاتا ہے تاکہ اسے عدالت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ (پولیس اسے مفور یا اشتہاری ملزم قرار دے دیتی ہے)۔
یا (مثلاً) ایک شخص کسی کے خلاف (اس کی غیبت میں) کچھ کہتا ہے لیکن جب اس کے بعد اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے تو اس شخص کا سامنا کرنے سے ہچکچاتا ہے۔

فُتْرَانِ کریم نے 'قانونِ مکافاتِ عمل' کی ہمہ گیریت کی وضاحت اور اس کے اٹل ہونے کی حقیقت کی تبیین کے لئے کہا ہے کہ تم ارتکابِ جرم کے بعد کہیں بھاگ کر نہیں جا سکتے۔ تمہیں خدا کے سامنے پیش ہونا پڑے گا۔ تم اس سے بچ کر کہیں روپوش نہیں ہو سکتے۔ اس کے لئے اس نے "لقاءِ ربّ" کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ یعنی خدا کی ملاقات یا آمنا سامنا۔ اس سلسلہ میں ایک اہم نکتہ کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ اس "لقاءِ ربّ" کے یہ معنی نہیں کہ اس وقت خدا، انسان کے سامنے نہیں۔ ایسا صرف مرنے کے بعد ہو گا جب

لے فُتْرَانِ کریم نے خدا کے تخلیقی شاہکاروں پر غور و خوض کے بعد، اس حقیقت پر پہنچ جانے کو کہ یہ کارِ کائنات اس کی حکمتِ بالغہ کی رو سے کس قدر صحیح اور غیر متبدل قوانین کے مطابق سرگرم عمل ہے، بعض مقالات پر لغارت سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی اس طرح یوں سمجھو گویا انسان خدا کو اپنے سامنے کھڑا دیکھتا ہے۔ لیکن اس مقام پر ہم "لقاءِ ربّ" کا تصور صرف قانونِ مکافات کی رو سے پیش کر رہے ہیں۔

انسان "حشر کے میدان میں" خدا کے سامنے حاضر ہوگا۔ مرنے کے بعد "خدا کے حضور جانے" کے متعلق آگے چل کر گفتگو ہوگی۔ اس وقت صرف اتنا سمجھ لینا چاہیے کہ یہ اصطلاح بھی ہمارے عدالتی نظام کی تشبیہ کے طور پر سمجھنے کے لئے استعمال کی گئی ہے۔ خدا کا قانون مکافات ہر آن اور ہر جگہ انسان کے سامنے موجود رہتا ہے اور انسان کے ہر عمل کا نتیجہ اس کے مطابق ساتھ کے ساتھ مرتب ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے 'انسان' اپنی زندگی کے ہر سانس میں عدالت خداوندی میں حاضر ہوتا ہے۔ "لِقَاءَ رَبِّ" کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لئے اس حقیقت کو پیش نظر رکھئے۔ اسی کو بعض مقامات پر "رجعت الی اللہ" (خدا کی طرف لوٹنے) کے الفاظ سے بھی واضح کیا گیا ہے۔ رجعت الی اللہ۔ یا۔ خدا کی طرف لوٹنے کے بھی یہ معنی نہیں کہ پہلے ہم کہیں خدا کے پاس رہتے تھے پھر وہاں سے دنیا میں آگئے اور مرنے کے بعد پھر وہیں 'اس کے پاس چلے جائیں گے۔ یہ تصور صحیح نہیں۔ جیسا کہ ہم پہلے بھی وضاحت سے لکھ چکے ہیں 'خدا اس وقت بھی ہر آن ہمارے پاس ہوتا ہے۔ وہ ہماری رگ و جاں سے کبھی زیادہ قریب ہے۔ اس لئے اس سے "جدا ہو کر دنیا میں آنے اور مرنے کے بعد اس سے پھر جا کر ملنے" کا تصور وٹا آئی نہیں۔ اس سے کبھی یہی مراد ہے کہ تم جہاں بھی ہو تمہارا ہر قدم خدا کے قانون مکافات عمل کی طرف اٹھ رہا ہے۔ تم کشاں کشاں اُس کی طرف جا رہے ہو۔ تمہیں اس سے مفر ہی نہیں۔ "إِلَيْهِ رَاجِعُونَ" کے یہی معنی ہیں۔

چونکہ 'انسانی اعمال کا نتیجہ اس دنیا میں بھی سامنے آسکتا ہے اور اس کے بعد کی زندگی میں یقیناً سامنے آئے گا۔ اس لئے "لِقَاءَ رَبِّ" یا "رجعت الی اللہ" کا عمل اس زندگی میں قدم قدم پر ہوتا ہے اور مرنے کے بعد بھی ہوگا۔ یعنی قانون خداوندی کے مطابق 'انسان کا اپنے اعمال کے نتائج کا سامنا کرنا۔ چاہے اس دنیا میں 'چاہے اس کے بعد۔ لہذا 'جہاں قرآن کریم میں مرنے کے بعد بھی "لِقَاءَ رَبِّ" یا "رجعت الی اللہ" کا ذکر آتا ہے وہاں بھی اس سے یہی مراد ہے۔ (مرنے کے بعد کی زندگی کے متعلق تفصیلی ذکر آگے چل کر آئے گا)۔ اس وضاحت کے بعد لقاء رب یا رجعت الی اللہ کے متعلق قرآن کریم کی تصریحات ملاحظہ فرمائیے۔

لِقَاءَ رَبِّ پُر ایمان

سورۃ انعام میں ہے کہ بنی اسرائیل کی طرف خدائی راہ نمائی آئی۔ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ

يُؤْمِنُونَ (۱۵۵/۶) تا کہ وہ اپنے رب کے سامنے جانے پر ایمان رکھیں۔ یعنی وہ اس بات کا یقین کریں کہ ان کا ہر عمل خدا کے مقرر کردہ قانون کے مطابق نتیجہ پیدا کر کے رہے گا۔ سورہ رعد میں ہے کہ قرآن کریم میں قوانین خداوندی کو اس طرح نکھارا اور ابھارا کہ اس لئے بیان کیا گیا ہے۔ لَعَلَّكُمْ بِلِقَاءِ رَبِّكُمْ تُوقِنُونَ (۱۵۳/۲۱) تا کہ تم اپنے رب کے سامنے جانے کا یقین کر لو۔ مومنین کی بنیادی خصوصیت یہ بتائی گئی ہے کہ انہیں اس بات کا ہر وقت خیال رہتا ہے کہ انہوں نے اپنے رب کے سامنے جانا ہے۔ اس لئے ان کا ہر قدم اسی طرف اٹھتا ہے (۲/۲۶۱) جس دن وہ اپنے رب کے سامنے جائیں گے (یعنی ظہورِ نتائج کے وقت) انہیں سلامتی کے مژدہ جانفز اسے نوازا جائے گا (۳۳/۴۳)۔

اس کے برعکس جو لوگ "لقاء رب" پر یقین نہیں رکھتے وہ سخرِ الامرتباہ و برباد ہو جائیں گے (۱۰/۳۱) (۱۰/۴۵)۔ جسے اس بات پر یقین ہی نہیں کہ سنکھیا کھانے سے ہلاکت ہو جاتی ہے وہ بلا درینغ سنکھیا کھالے گا اور اس کا نتیجہ تباہی ہوگا۔ اکیسے لوگوں کی نگاہ ہمیشہ مفادِ عاجلہ پر رہتی ہے۔ یعنی ان کا مسلک یہ ہوتا ہے کہ جس طریق سے بھی ہو سکے دنیاوی مفاد حاصل کر لئے جائیں اور جب انہیں یہ مفاد حاصل ہو جاتے ہیں تو وہ مطمئن ہو جاتے ہیں کہ مقصدِ زندگی حاصل ہو گیا۔

إِنَّ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا وَرَضُوا بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَاطْمَأَنَّنُوا
بِهَا وَالَّذِينَ هُمْ عَنْ آلَتِنَا غٰفِلُونَ ۝ (۱۰/۴)

جو لوگ ہمارے سامنے آنے کی توقع نہیں رکھتے اور مفادِ دنیا ہی کو مقصودِ حیات سمجھ کر اس پر مطمئن ہو جاتے ہیں وہ جائز اور ناجائز کی پروا ہی نہیں کرتے اور قوانینِ خداوندی کو پس پشت ڈال دیتے ہیں۔

یہ لوگ اپنی مفاد پرستیوں کے نشہ میں ہدمست اپنی غلط روی میں آنکھیں بند کر کے آگے ہی آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں (۱۰/۱۱)۔ انہیں جائز اور ناجائز کی تمیز کی تلقین بڑی ناگوار گذرتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم اس شرِ ان کے اتباع کے لئے تیار نہیں جو ہماری بے محابا مفاد پرستیوں پر حدود و قیود عائد کرتا ہے۔ اگر تم اس شرِ ان کی جگہ کوئی دوسرا قرآن لے آؤ یا اس میں ہماری منشاء کے مطابق تبدیلیاں کر دو تو پھر ہم تمہاری دعوت کو قبول کر لیں گے (۱۰/۱۵)۔ ان سے کہا گیا کہ خدا کے مقرر کردہ قوانین اٹل اور اپنی نتیجہ خیزی میں غیر متبدل ہیں۔ نہ ان میں کوئی تبدیلی ہو سکتی ہے اور نہ ہی اس قسم کی مفاہمت کہ ان قوانین

کے ساتھ کچھ انسانوں کے خود ساختہ قوانین شامل کر کے اس مرکب کو ضابطہ حیات بنالیا جائے اور اطمینان حاصل کر لیا جائے کہ ہم تباہیوں سے محفوظ ہو گئے ہیں کیا سنکھیا میں شکر ملا لینے سے اس کی سمیت رائل ہو سکتی ہے؟ لہذا قانونِ مکافاتِ عمل پر ایمان رکھنے والے کو تو خالصتہً قوانینِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنی ہوگی۔ قَمَنْ كَانَ يَرْجُوا لِقَاءَ رَبِّهِ فَلْيُحْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِ أَحَدًا ۝۱۱۰ (۱۸/۱۱۰) ”سو جو کوئی اپنے رب کے سامنے جانے پر یقین رکھتا ہے اسے صلاحیت بخش کام کرنے چاہئیں اور قوانینِ خداوندی کے ساتھ کسی اور کے قوانین کو شریک نہیں کرنا چاہیئے۔

جیسا کہ کہا جا چکا ہے، انسان صحیح روش پر صرف اس صورت میں چل سکتا ہے جب اسے اس بات کا یقین ہو کہ غلط روش پر چلنے سے وہ تباہ ہو جائے گا۔ اگر یہ یقین باقی نہ رہے تو پھر انسان اپنی غلط روش چھوڑنے کے خلاف ہزار کٹ جتیاں پیش کرتا ہے۔ اسی قسم کے لوگ ہیں جن کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ کبھی کہتے ہیں کہ خدا خود ہمارے سامنے کیوں نہیں آتا یا ہم پر فرشتے نازل ہو کر ہمیں اس سے آگاہ کیوں نہیں کرتے (۲۵/۲۱)۔ حالانکہ یہ ان بستیوں کے کھنڈرات کے پاس سے صبح و شام گزرتے رہتے ہیں جو اس لئے تباہ ہو گئیں کہ انہیں مکافاتِ عمل پر یقین نہیں تھا (۲۵/۴۰)۔ اگر انہیں اس کا یقین ہوتا تو انہیں اس حقیقت کے تسلیم کرنے میں بھی کوئی تاثر نہ ہوتا کہ غلط روش کے نتیجے میں تباہی آکر رہتی ہے (۲۹/۵)۔

جو شخص قانونِ مکافاتِ عمل پر یقین رکھتا ہے، اگر کبھی اس کا کوئی قدم غلط سمت کی طرف اٹھ جاتا ہے تو اسے اس کا بھی یقین ہوتا ہے کہ اگر میں نے فلاں روش اختیار کر لی تو اس غلط اقدام کے نقصان کی تلافی ہو جائے گی۔ (اسے خدا کی رحمت کہتے ہیں)۔ لیکن جو شخص سرے سے قانونِ مکافاتِ عمل پر یقین نہیں رکھتا اور سمجھتا ہے کہ دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے اتفاقیہ طور پر (BY CHANCE) ہوتا ہے اس کے سامنے غلط اقدام کے نقصان کی تلافی کی کوئی صورت ہی نہیں ہوتی۔ اس کے لئے کہا گیا کہ وَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ اللَّهِ وَ لِقَائِهِ أَذِلَّةً يَسْتَوُونَ رَحْمَتِي ذَٰلِكُمْ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝ (۲۹/۲۳) جو لوگ قوانینِ خداوندی سے کسرشی برتتے ہیں اور اس پر یقین ہی نہیں رکھتے کہ ہر عمل اپنا خاص نتیجہ پیدا کرتا ہے — غلط عمل نقصان دہ نتیجہ، صحیح عمل منفعت بخش نتیجہ — وہ

درحقیقت خدا کی اس رحمت کا امتیاز رہتے ہیں جو نقصان ہو جانے کے بعد اس کی تلافی کا طریق بتاتی ہے
 فوراً سوچتے کہ وہ شخص جسے تکلیف سے نجات حاصل کرنے کی کوئی امید باقی نہ رہے کس قدر الم انگیز اور دردناک
 اذیت کی زندگی بسر کرتا ہے! انہی کے متعلق کہا کہ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا؟ کیا ہم
 تمہیں بتائیں کہ وہ لوگ کون ہیں جن کے حصے میں تباہی ہی تباہی ہے۔ الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ
 فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا؟ یہ وہ لوگ ہیں جن کی
 سعی و عمل کا نتیجہ "جائز و ناجائز" ہر طریق سے اپنے مفاد حاصل کرنا ہوتا ہے۔ اس کے لئے وہ طرح طرح
 کی تدابیر سوچتے رہتے ہیں اور بزمِ خویش سمجھتے ہیں کہ ہماری کاریگری بڑی کامیاب ہے۔ أُولَئِكَ الَّذِينَ
 كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَلِقَائِهِمْ؟ یہ وہ لوگ ہیں جو قوانین خداوندی سے سرکشی اختیار کرتے ہیں
 اور "اپنے رب کا سامنا کرنے" کا انہیں خیال تک نہیں ہوتا۔ نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ خَطِطُوا أَعْمَالَهُمْ
 فَلَا يُغْنِيهِمْ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ ذُنُوبُهُمْ؟ یہ وہ لوگ ہیں کہ ان کا کیا کرایا
 آخر الامر غارت ہو جاتا ہے اور ظہورِ ناسخ کے وقت یہ دیکھنے کی ضرورت تک نہیں پڑتی کہ ان کا کونسا پلڑا
 جھکتا ہے۔ (نیز ۳۰/۱۴)؛ (۳۲/۱۴)۔

قانونِ مکافات سے انکار کرنے والے درحقیقت زندگی کے تسلسل (مرنے کے بعد کی زندگی) سے
 انکار کرتے ہیں۔ یہ دونوں باتیں لازم و ملزوم ہیں۔ وَ كَالَّذِينَ إِذَا ضَلَلْنَا فِي الْأَرْضِ أَتَانَا
 لِنَقُولَ خَلِّقْ جَدِيدًا۔ یہ کہتے ہیں کہ جب ہمیں (مرنے کے بعد) مٹی اپنے اندر جذب کر لے گی اور یوں ہمارا
 خاتمہ ہو جائے گا تو کیا اس کے بعد ہمیں پھر ایک نئی زندگی عطا ہوگی؟ بَلْ هُمْ بِلِقَائِ رَبِّهِمْ كَافِرُونَ
 (۳۲/۱۰) اصل یہ ہے کہ یہ لوگ قانونِ مکافاتِ عمل پر یقین نہیں رکھتے۔ ورنہ اگر انسان کو اس بات پر یقین ہو کہ
 انسان کا کوئی عمل نتیجہ مرتب کئے بغیر نہیں رہ سکتا تو جن اعمال کے ناسخ اس دنیا میں اس کے سامنے نہیں آ
 ان کے متعلق وہ لازماً یہ سمجھے گا کہ ان کا نتیجہ مرنے کے بعد سامنے آئے گا۔ یوں قانونِ مکافاتِ عمل اور حیاتِ
 آخرت پر یقین لازم و ملزوم ہو جاتے ہیں۔

حیاتِ آخرت سے متعلق تفصیلی بحث آگے چل کر آتی ہے۔ جہاں تک قانونِ مکافات کا تعلق

لے "حُجُطِ أَعْمَالٍ" کی تفصیل آئندہ الگ باب میں ملے گی۔

ہے، اس کے لئے قرآن قوانین فطرت پر غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ نظام فطرت پر غور کرنے سے انسان کس نتیجہ پر پہنچتا ہے؟ کیا اس پر نہیں کہ کارگاہ کائنات کا فرد درہ قانون علت و معلول (LAW OF CAUSE AND EFFECT) کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ یہ محیر العقول نظام چل ہی اس بنیاد پر رہا ہے کہ یہاں ہر شے کی حرکت ایک نتیجہ پیدا کرتی ہے اور انہی نتائج کا نام فطرت کے اٹل قوانین ہیں سو جب نظام کائنات میں کوئی شے، ان قوانین کے احاطے سے باہر نہیں تو کیا انسان (جو اس زمین پر سلسلہ کائنات کی آخری کڑی ہے) اس سے مستثنیٰ سمجھا جائے گا؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ سورۂ روم میں ہے کہ کیا یہ لوگ خود اپنی زندگی اور نظام کائنات پر غور نہیں کرتے۔ خدا نے اس محیر العقول کارگاہ کو بالحق پیدا کیا ہے۔ بالحق پیدا کرنے کے معنی یہ ہیں کہ کائنات ایک مقصد کے ماتحت پیدا کی گئی ہے اور ایک خاص نظام کے تابع سرگرم عمل ہے۔ لیکن یہ سلسلہ لامتناہی نہیں۔ وَ أَجَلٌ مُّتَمَعْنِ ۖ يَهْدِيهِمْ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّبِينٍ (یس: ۲۸) لیکن اس اٹل قوانین کی حکمرانی ہے۔ وَإِنْ كَثُفَتْ أَسْفَلَ نَبَاثَاتُ النَّاسِ بِبِلْقَاعِهِمْ لَيَكُونُنَّ مِن دُونِ ۚ (سجده: ۱۷) لیکن اس کے باوجود انسانوں کی اکثریت خدا کے قانون مکافات سے انکار کرتی ہے۔

اس کے بعد کہا کہ اگر یہ لوگ اس طرح نظام کائنات پر غور و تدبیر نہیں کرنا چاہتے تو ان سے کہو کہ
 اَذَلَّمْ يَسِينُوۡا فِی الْاٰمْرِ مِنْۢ بَیِّنٰتٍ ۚ کَیۡتَمِ اِدۡمُودُۤمۡ مَفۡکَرُہٗ لَیۡسَ یُنۡکَلِتُہٗ اَوۡرَانَ بَسِیۡیُوۡں کے کھنڈرات
 پر سے نہیں گزرتے جن میں کبھی ایسی قومیں آباد تھیں جو تم سے بھی زیادہ قوت و شوکت کی مالک تھیں۔ تم
 ان کھنڈرات پر منقوش ان کی داستانوں کو پڑھو۔ وہ زبان حال سے خدا کے قانون مکافات کی کارفرمائی
 کی شہادت دیں گے۔ وہ بتائیں گے کہ فلاں قوم نے فلاں قسم کی روش اختیار کی تو اس کا نتیجہ یہ نکلا اور فلاں
 قوم نے دوسری قسم کا سلک اختیار کیا تو اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا۔ اس سے تم پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی
 کہ لَقَدْ کَانَ عَاقِبَةُ الَّذِیۡنَ اَسَآءُ ۗ وَاۡلَ السَّوۡۤءِ اٰی..... (۹۱۔۱۰۳) جو لوگ بھی دنیا میں ناہموار یا
 پیدا کریں گے ان کا انجام تبہا ہی ہوگا۔ یہی خدا کا قانون مکافات ہے۔

یہ بات آج سے چودہ سو سال پہلے کے انسانوں کو مخاطب کر کے کہی گئی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ اس طریق تفکر و تدبیر سے قانونِ مکافات کی حقیقت سے علم و آگہی اسی دور کے انسانوں کے لئے مختص نہیں سَنِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاَفَاقِ وَ فِيْ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَكْتَبِيْنَ

لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ۔ ہم نفس و آفاق میں پھیلی ہوئی اپنی نشانیاں انسانوں کے سامنے لاتے جائیں گے اور جوں جوں فطرت کے دستور حقائق کی پروہ کشائی ہوتی جائے گی، یہ حقیقت بے نقاب ہو کر سامنے آجائے گی کہ خدا نے جو کچھ کہا ہے وہ ایک یقینی بات ہے۔ لیکن اس کے باوجود آلاَ اِنَّهُمْ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَاءِ رَبِّهِمْ ؕ (۵۳-۵۴/۳۱) یہ لوگ "لقاء رب" کے متعلق شک و شبہ میں پڑے ہیں۔

یوم التلاق

اسی کو (یعنی ظہور نتائج کے وقت کو) یوم التلاق کہا گیا ہے۔ یعنی "خدا کے سامنے جانے کا دن" (۱۵۱/۴۰)۔ سورہ زمر میں ہے کہ اہل جہنم جب دوزخ کے دروازے پر پہنچیں گے تو ان سے پوچھا جائے گا کہ اَلَمْ يَأْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَتْلُونَ عَلَيْكُمْ آيَاتِ رَبِّكُمْ وَيُنْذِرُونَ لَكُمْ لِقَاءَ يَوْمِكُمْ هَٰذَا ؕ (۴۱/۳۹) کیا تمہارے پاس خدا کے رسول نہیں آئے تھے جو تمہارے سامنے خدا کے قوانین پیش کرتے تھے اور تمہیں اس دن کے سامنے آنے سے متنبہ کرتے تھے؟ اس دن پھر کوئی راز مستور نہیں رہے گا کوئی بات چھپی ہوئی نہیں رہے گی۔ اپنے جن اعمال کے متعلق انسان سمجھتا تھا کہ ان سے کوئی واقف نہیں، وہ سب بے نقاب ہو کر سامنے آجائیں گے (۱۸/۶۹)۔ یہی "ملاقات کا دن" ہو گا۔ سورہ زخرف میں اس کے متعلق کہا حَتَّىٰ اِذَا جَاءَهُنَّا (۳۸/۴۳) "جب انسان ہمارے پاس آئے گا"۔ دوسری جگہ ہے۔ اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذٍ النَّفْسَاقُ (۳۰/۴۵) اس دن ہر ایک کو اس کے رب کی طرف ہانک کر لیجا یا جائے گا۔ سورہ یٰس میں اس حقیقت کو ان الفاظ میں سامنے لایا گیا ہے اِلٰى رَبِّهِمْ يَنْسِلُوْنَ (۵۱/۳۶) "لوگ لپک کر خدا کی طرف جائیں گے" کہیں اسے وَ اِلَيْهِ النُّشُورُ سے تعبیر کیا گیا ہے (۱۵/۶۴)۔ یعنی "اسی کی طرف اٹھ کر جانا ہے" کہیں اِلَيْهِ تَعْشَرُونَ (۲۴/۶۴) کہہ کر یعنی اسی کی طرف اکٹھا ہونا ہے۔ سورہ غاشیہ میں ہے اِنَّ اِلَيْنَا اِيَابَهُمْ هُمْ ثُمَّ اِنَّا عَلَيْنَا حِسَابُهُمْ (۲۵-۲۴) انہیں آخر الامر ہماری طرف آنے ہے اور ہمارے ہی ذمے ان کا حساب لینا ہے۔

رجعت الی اللہ

(اوپر بتایا جا چکا ہے کہ) قانونِ مکافات کے سلسلہ میں کہا گیا ہے کہ کائنات کو خدا نے بلا مقصد

پیدا نہیں کیا۔ اسی سلسلہ میں خود انسان کے متعلق کہا کہ

أَلْحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثًا وَأَنَّكُمْ إِلَيْنَا لَا تُرْجَعُونَ (۳۵)۔

کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم نے تمہیں بلا مقصد پیدا کر دیا ہے اور تم ہماری طرف آؤ گے نہیں۔
 ”بامقصد“ پیدا کرنے کے معنی یہ ہیں کہ انسانی زندگی کا ایک مستقبل ہے۔ کاروانِ حیات کی ایک منزل ہے۔ اس مستقبل میں ہر فرد کے مقام کا تعین اس کے اعمال کے مطابق ہوگا۔ اسی کو رَجَعَتْ إِلَى اللَّهِ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں اور اس مقام پر اسے پھر دہرا دینا چاہتے ہیں کہ ”إِلَى اللَّهِ رَاجِعُونَ“ کے معنی یہ نہیں کہ ”ہم پہلے خدا کے پاس تھے“ پھر اس سے جدا ہو کر اس دنیا میں آ گئے“ اس کے بعد پھر اُس سے جا ملیں گے۔“ یہ عقیدہ ہندو فلسفہ ویدانت کا ہے اور وہیں سے ہمارے ہاں (تصوف کے رنگ میں) آ گیا ہے۔ ویدانت کا فلسفہ یہ ہے کہ انسانی روح ’آتما‘ روحِ خداوندی (پر ماتما) کا ایک حصہ ہے جو اپنی اصل سے الگ ہو کر مادی دنیا (پراکرتی) کی آلائشوں میں پھنس کر رہ گئی ہے۔ انسانی تگ و تاز کا منتہی یہ ہے کہ اس روح کو مادی آلائشوں سے نجات دلائی جائے تاکہ یہ پھر اپنی اصل (یعنی روحِ خداوندی) میں جا کر مل جائے اور یوں اس کے فراق کی اذیتیں وصال کی لذتوں میں بدل جائیں۔ انسانی ذات کا اس طرح ذاتِ خداوندی میں جذب ہو کر اپنے آپ کو فنا کر دینا، مقصودِ حیات ہے یہی فلسفہ ہمارے ہاں ”وحدت وجود“ کی شکل میں نمودار ہو گیا جس کے حاملین نے کبھی یہ کہا کہ

بشنوا زے چوں حکایت می کند

از جُبدائی ہا شکایت می کند

اور کبھی ان الفاظ میں کہ

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا

یہ غیر شرعی تصور ہے۔ قرآن کی رو سے ’انسانی ذات‘ ذاتِ خداوندی کا جُزء نہیں، اس کی عطا کردہ خصوصیتِ کبریٰ ہے جو انسان کے سوا کسی اور کو نہیں دی گئی۔ اسی سے یہ صاحب اختیار وارادہ ہے اور اپنے اعمال کی ذمہ داریوں کا حامل۔ انسان کو اس کی ذات، غیر نشوونما یافتہ شکل میں ملی ہے۔ سطحِ ارض پر انسانی زندگی کی تمام تگ و تاز کا مقصد یہ ہے کہ اس کی ذات کی اس حد تک نشوونما

ہو جائے کہ یہ زندگی کے اگلے ارتقائی مرحلہ میں پہنچنے کے قابل قرار پاجائے۔ (تفصیل ان امور کی حیات بعد الممات سے متعلق باب میں ملے گی)۔ اس وقت صرف اتنی وضاحت مقصود تھی کہ رجعت الی اللہ سے مراد خدا کی طرف واپس لوٹ کر ذات کا اپنی اصل سے مل جانا نہیں اس سے مراد اپنے اعمال کے نتیجہ کے لئے خدا کے قانون مکافاتِ عمل کی طرف کشاں کشاں جانا ہے۔ اس سلسلہ میں ”رجعت“ کا لفظ اس لئے استعمال کیا گیا ہے کہ مجرم ارتکابِ جرم کے بعد جرم کے جائے وقوع سے بھاگ جاتا ہے اور اثباتِ جرم کے لئے اسے پکڑ کر وہیں لایا جاتا ہے۔ ”رجعت الی اللہ“ سے مقصود یہ بتانا ہے کہ تم ارتکابِ جرم کے بعد کہیں بھاگ کر نہیں جاسکتے۔ تم جس طرف بھی بھاگ کر جاؤ گے، خدا کا قانون مکافاتِ تمہارے سامنے ہوگا اس لئے یوں سمجھو کہ اس بھاگنے میں بھی تمہارا ہر قدم اسی کی طرف اٹھ رہا ہے۔ تم اپنی دانست میں سمجھ رہے ہو کہ تم جرم کے جائے وقوع سے بھاگ کر کسی اور سمت کو جا رہے ہو لیکن درحقیقت تم لوٹ کر وہیں آ رہے ہو۔ اِنَّ اِلٰی رَبِّكَ الرَّجْعُ ۝ (۹۶/۸)۔

اس دنیا میں رجعت الی اللہ

یہ انسان کے ہر قدم کا خدا کی طرف اٹھنا۔ یہ اس کا ایک ”مغزور مجرم“ کی طرح پلٹ کر عدالت کی طرف آنا اس دنیا میں بھی ہوتا ہے اور مرنے کے بعد بھی ہوگا یہ جو اس نے کہا ہے کہ اِلَیْنَا رَاجِعُونَ (۲۱/۹۳) تو اس کے یہی معنی نہیں کہ تم (مرنے کے بعد) ہماری طرف پلٹ کر آؤ گے اس کے معنی یہ ہیں کہ تم ہر قدم پر ہماری طرف پلٹ کر آ رہے ہو۔ (راجعہ کے یہ معنی ہیں)۔ کہیں کہا ہے۔ اِلَیْهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِیْعًا (۱۱/۴) کہیں اِلَیْهِ تُرْجَعُونَ آیا ہے (۲۸/۷)۔ سورۃ مومن میں ہے اَنْ مَّوَدَّ نَا اِلٰی اللّٰهِ (۴۰/۴۳)۔ سورۃ زخرف میں ہے وَ اِنَّا اِلٰی رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُونَ (۳۲/۱۳)۔

لے رجعت الی اللہ کا ذکر ان آیات میں بھی آیا ہے۔

(۱۰/۴۶) (۱۱/۴) (۱۹/۴۰) (۲۱/۳۵) (۲۸/۸۸) (۲۹/۱۷۱) (۲۹/۲۱) (۳۰/۱۱) (۳۰/۸۳) (۳۹/۴۴)

(۳۹/۴۴) (۴۰/۴۳) (۴۱/۲۱) (۴۳/۱۳) (۴۳/۸۵) (۴۵/۱۵) (۴۵/۱۰) (۴۸/۷۹)

ضمناً یہ سمجھ لینا بھی ضروری ہے کہ سورۃ بقرہ میں ہے کہ جو لوگ دنیا میں آسمانی انقلاب برپا کرنے کے لئے اٹھتے ہیں انہیں قدم قدم پر سخت صبر آزمائیاں تصادمات اور ہمت شکن تراحمات کا مقابلہ کرنا ہوتا ہے۔ وہ ان مقامات پر گھبراتے نہیں بلکہ جب بھی کوئی نیا صبر آزماء مرحلہ سامنے آتا ہے تو وہ دل کی پوری جمیعت و سکون اور جگر کے بلند حوصلہ اور ہمت سے بیاختہ پکاراٹھتے ہیں کہ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۝ (۲/۱۵۹) ہم نے اپنے آپ کو خدا کے پروگرام کے لئے وقف کر رکھا ہے۔ اس لئے ان مصائب اور مشکلات سے ہم اپنا منہ نہیں موڑیں گے۔ ہمارا ہر قدم اس منزل کی طرف اٹھتا چلا جائے گا جسے ہم نے خدا کی راہ نمائی کے مطابق اپنے لئے مقرر کر رکھا ہے۔ ہجوم مصائب آتا ہے تو آئے مشکلات کے طوفان اٹھتے ہیں تو اٹھیں، ہم بلا خوف و خطر اپنی منزل کی طرف بڑھتے چلے جائیں گے۔ اِنَّا لِلّٰہِ رَاجِعُوْنَ۔

بہر حال ہم کہہ رہے تھے کہ اس زندگی میں انسان اپنے ہر سانس میں رجعت الی اللہ کر رہا ہے۔ یعنی اس کا ہر قدم خدا کے قانونِ مکافات کی طرف اٹھ رہا ہے تاکہ اس کے عمل کا نتیجہ اس کے مطابق مرتب ہو۔ قرآن کریم نے خود ہی بتا دیا کہ رجعت الی اللہ کا مقصد کیا ہے۔ کہا کہ اَللّٰهُ مَزِجُکُمْ جَیْنًا فَمِنْکُمْ دَہْنَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ (۵/۱۰۵) تم سب کی رجعت خدا کی طرف ہے۔ پس وہ تمہیں تمہارے اعمال کے متعلق سب کچھ بتا دے گا۔ (نیز ۴/۴۸؛ ۵/۴۵؛ ۴/۱۴۵؛ ۱۰/۲۳؛ ۲۴/۴۴؛ ۲۹/۸؛ ۳۱/۱۵؛ ۳۱/۲۳؛ ۳۹/۶)۔

موت کے بعد رجعت الی اللہ

لیکن رجعت الہی کا سلسلہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا۔ موت کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔ اسی لئے قرآن کریم کا رُوسے انسانی اعمال کے نتائج کی آماجگاہ یہی زندگی نہیں، موت کے بعد کی زندگی بھی ہے۔ اس لئے قرآن کریم میں مختلف مقامات میں موت کے بعد رجعت الہی اللہ کا ذکر بھی آیا ہے۔ مثلاً سورہ بقرہ میں ہے: **كَيْفَ تَكْفُرُونَ بِاللّٰهِ وَ كُنْتُمْ اَمْوَائًا فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ تُمَيِّتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُونَ** (۲/۲۸) تم خدا سے کس طرح انکار کر سکتے ہو! فوراً اپنی حالت پر غور کرو خدا نے تمہاری تخلیق کی ابتدا بے جان مادہ سے کی، پھر تم ارتقائی منازل طے کر کے پیکرِ بشریت میں پہنچے، طبعی زندگی پوری کر لینے کے بعد تم مر جاتے ہو۔ اس کے وہ تمہیں پھر زندگی عطا کرتا ہے۔ ان تمام مراحل میں تم اس

کے قانون کے دائرے میں گھرے رہتے ہو تو مرنے کے بعد تم اس دائرے سے کس طرح باہر نکل جاؤ گے؟ اب بھی تمہارا ہر قدم اس کی طرف اٹھ رہا ہے، مرنے کے بعد بھی ایسا ہی ہوگا۔ سورۃ انعام میں ہے۔
 وَ الْمُؤْمِنِيْنَ يَنْبَغُهُمْ اَللّٰهُ ثُمَّ اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ۝ (۶/۳۶) خدا مردوں کو اٹھائے گا تو وہ اس کی طرف جائیں گے۔ اس رجعت الی اللہ سے بھی مقصود مکافاتِ عمل کی رو سے نتیجہ خیزی ہے۔ جیسا کہ سورۃ توبہ میں واضح کر دیا جہاں کہا کہ

وَقُلْ اَعْمَلُوا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَ رِسُوْلُهُ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ سُورَةُ
 اِلَى عَلِيمِ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ (۹/۱۰۵)۔
 ان سے کہو کہ تم کام کرو۔ خدا، اس کا رسول اور جماعتِ مومنین تمہارے اعمال کو دیکھ لینگے۔
 پھر تم خدا کے عالم الغیب و الشہادت کی طرف لوٹتے جاؤ گے تاکہ وہ بتا دے کہ تم نے کس
 قسم کے کام کئے تھے۔

اس سے رجعت الی اللہ کا مقصود واضح ہے۔ یہ مضمون متعدد مقامات میں آیا ہے۔ مثلاً (۹/۹۴)؛ ۱۱/۶۰؛ ۱۱/۲۵؛
 ۲۴/۴۳؛ ۲۹/۵۶؛ ۳۰/۱۱؛ ۳۲/۱۱؛ ۳۴/۲۲؛ ۳۴/۸۳؛ ۵۰/۲۳؛ ۵۰/۸؛ ۶۲/۳۔

تمام امور خدا کی طرف لوٹتے ہیں

مذکورہ صدر آیات میں یہ کہا گیا ہے کہ تمام انسان خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کی طرف لوٹتے ہیں جس کے مطابق ان کے اعمال کے نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ دوسرے مقامات میں یہ کہا گیا ہے کہ تمام امور آخر الامر خدا کی طرف لوٹتے ہیں۔ اس کے معنی بھی یہی ہیں کہ دنیا کے ہر معاملہ کا فیصلہ خدا کے قانونِ مکافات کے مطابق ہوتا ہے وَ اِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ (۲/۳۱)؛ (۱۱/۱۲۳)؛ (۲۲/۴۶)؛ (۳۵/۴)۔ سورۃ آل عمران میں ہے۔

اَفْخِرْ دِيْنََ اللّٰهِ يَنْبَغُوْنَ وَ لَوْ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ
 طَوْعًا وَ كَرْهًا وَ اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ۝ (۳/۸۲)۔

کیا میں قانونِ خداوندی کے علاوہ کسی اور کے قوانین کو اپنی زندگی کا ضابطہ بناؤں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ کائنات کی ہر شے اسی کے قانون کے سامنے سجدہ ریز ہے اور ان کا ہر

قدم اسی کے قانونِ مکافات کی طرف اٹھ رہا ہے۔ (نیر ۱۰۸/۳)۔

سورۂ شوریٰ میں ہے۔ اَلَاۤ اِلٰی اللّٰهِ تَصِيْرُ الْاُمُوْر ۝ (۵۳/۴۲) اس حقیقت سے باخبر ہو کہ تمام معاملات اپنے آخری فیصلہ کے لئے خدا کے قانونِ مکافات ہی کی طرف جاتے ہیں۔ دوسری جگہ ہے۔ لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ (۵۴/۵) کائنات میں اختیار و اقتدار اسی کا ہے اور ہر معاملہ کا فیصلہ اسی کے قانونِ مکافات کے مطابق ہوتا ہے۔ (نیر ۲۲/۸)۔ سورۂ مریم میں ہے۔ اِنَّا نَحْنُ نَرِیْتُ الْاَرْضَ وَ مَنْ عَلَیْهَا وَ اِلَیْنَا یَرْجَعُوْنَ ۝ (۴۰/۱۹) زمین اور جو کچھ اس پر ہے وہ سب خدا کی ملک ہے اور اس کے قانونِ مکافات کے مطابق ہر معاملہ کا فیصلہ ہوتا ہے۔ یعنی خارجی کائنات کا ذرہ ذرہ خدا کے قانونِ علت و معلول کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ انسانی دنیا میں ہر فرد کے اعمال کے نتائج بھی خدا کے قانونِ مکافات کے مطابق مرتب ہوتے ہیں اور اقوام کا مستقبل بھی اسی کی رو سے متعین ہوتا ہے۔ سورۂ یونس میں ہے۔

اَلَمْ یَرَوْا کَمْ اَهْلَکْنَا قَبْلَہُمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ اَنَّهُمْ اِلَیْہُمْ لَا یَرْجَعُوْنَ
وَ اِنْ کُلُّ لَمَّا جَمِیْعٌ ۝ لَدَیْنَا مَخْضُوْدٌ ۝ (۳۱-۳۲/۳۶)۔

کیا انہوں نے تاریخ کی اس شہادت پر غور نہیں کیا کہ ہم ان سے پہلے کتنی اقوام کو اس طرح تباہ کر دیا کہ وہ دوبارہ اٹھنے کے قابل ہی نہ رہیں۔ لہذا "اقوام سابقہ ہوں یا یہ قوم مخاطب! ان سب کو اپنے انجام و آل کے لئے ہمارے قانونِ مکافات کے سامنے حاضر ہونا ہے۔

جو قوم اس حقیقت پر یقین رکھتی ہے کہ اس کے ہر عمل کا نتیجہ خدا کے قانونِ مکافات کی رو سے مرتب ہوتا ہے، وہ کبھی ظلم و استبداد اور سلب و نہب کی روش اختیار نہیں کرتی کیونکہ اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کی روش کا نتیجہ خود ان کی اپنی تباہی ہے۔ ظلم و استبداد پر وہی قوم اُترتی ہے جسے قانونِ مکافات پر یقین نہیں ہوتا۔ چنانچہ فرعون اور اس کے جیوش و عساکر کے متعلق کہا۔

وَ اسْتَكْبَرَ هُوَ وَ جَعَلَ لَہٗ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ وَ ظَنُوْا اَنَّهُمْ اِلَیْنَا لَا یَرْجَعُوْنَ ۝ (۳۹/۲۸)۔

فرعون اور اس کے لشکروں نے ملک میں ناحق و حائدی مچا رکھی تھی۔ اس لئے کہ وہ اس عزمِ باطل میں تھے کہ وہ اپنے اعمال کے نتائج کے لئے ہماری طرف نہیں آئیں گے۔

ان کے برعکس، جب ساحرین دربارِ فرعون نے حقیقت کو اپنے سامنے بے نقاب دیکھ لیا تو انہوں نے اسے بلا توقف قبول کر لیا۔ اس پر جب فرعون نے انتہائی جلال آمیز انداز سے کہا کہ میں تمہارے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا، تبہیں سولی پر چڑھا دوں گا تو انہوں نے دل کے انتہائی اطمینان کے ساتھ کہہ دیا کہ توجہ کچھ کرنا چاہتا ہے کر لے۔ تیرا حکم ہماری طبعی زندگی تک ہی چل سکتا ہے، اس سے آگے تیری دسترس ہی نہیں ہو سکتی اور ہم اس حقیقت کو جان چکے ہیں کہ إِنَّ إِلَى رَبِّنَا مُنْقَلِبُونَ ۵ (۷/۱۳۵) معاملات کے حقیقی فیصلے خدا کے قانونِ مکافات کی رُو سے ہوتے ہیں، ہمارے معاملہ کا صحیح فیصلہ بھی اسی کی عدالت سے ہوگا۔ تمہارے فیصلے کی ہمارے نزدیک کوئی وقعت ہی نہیں۔ یہی وہ یقینِ محکم ہے جس سے انسان کو سچا اطمینانِ قلب حاصل ہوتا ہے ۲۷۱-۲۸۰/۸۹ اور یہی ہر مومن کا ایمان و اعلان ہوتا ہے کہ — وَ إِنَّا إِلَىٰ رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُونَ ۵ (۳۳/۲۷) ہمیں اپنے ہر معاملہ کے فیصلہ کے لئے عدالتِ خداوندی کی طرف رجوع کرنا ہے۔

چھٹا باب

توبہ — مغفرت

ایک مریض ڈاکٹر کے پاس آیا۔ وہ دردِ گردہ سے بُری طرح تڑپ رہا تھا۔ کہنے لگا کہ ڈاکٹر صاحب! میں رات اچھا بھلا سویا تھا۔ آدھی رات کو اچانک درد اُٹھا اور صبح تک اس نے مجھے ادھ موا کر دیا ہے۔ معلوم نہیں یہ آنا فانا ہو کیا گیا؟ ڈاکٹر نے مریض کا ایکس رے (X-RAY) لیا اور اس سے کہا کہ تمہارے گردے میں تین پتھریاں ہیں۔ یہ کچھ تمہیں آنا فانا نہیں ہو گیا۔ کم از کم سال بھر سے یہ پتھریاں بن رہی تھیں۔ اگر تم پہلے ”چیک اپ“ (CHECK-UP) کر لیتے تو اسی وقت ان کا علاج ہو جاتا۔ تم نے تغافل بڑا۔ اب گرفتے کا آپریشن ہوگا۔

اس سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آگئی کہ انسان کے ہر عمل کا نتیجہ تو اس کے ساتھ ہی مرتب ہونا شروع ہو جاتا ہے لیکن اس کے نتیجہ کے محسوس طور پر نمودار ہونے میں کچھ وقت لگ جاتا ہے۔ عمل اور اس کے نتیجہ کے یوں سامنے آنے کی مدت کو مہلت کا وقفہ کہتے ہیں۔

(۱۰)

اب دوسرا کیس لیجئے۔ تپ دق کا مریض ڈاکٹر کے پاس لایا گیا۔ اس کے تیمار دار نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب! یہ میرا جوان بیٹا سال بھر سے بخار میں مبتلا ہے۔ یہ بڑا تندرست اور توانا تھا۔ مرض نے گھلا گھلا کر اسے مردہ بنا دیا ہے۔ اس کا کچھ کیجئے۔ ڈاکٹر نے کہا کہ تم ٹھیک کہتے ہو۔ اس نوجوان میں بڑی ہی قوتِ مدافعت تھی جو وہ اس موذی مرض کا اتنے عرصہ تک مقابلہ کرتا رہا۔ لیکن اب اس کی

قوتِ مدافعت کم ہو رہی ہے۔ ہم کوشش کریں گے کہ مرض ایسی شکل اختیار نہ کر لے کہ اس کی قوتِ مدافعت اس کا مقابلہ نہ کر سکے اگر اس میں اتنی قوتِ مدافعت پیدا نہ ہو سکی تو پھر مرض اس پر غالب آجائے گا اور اس کی موت واقع ہو جائے گی۔

یامثلًا شہر میں وبا پھیل گئی۔ کچھ لوگ پہلے ہی دو تین دن کے اندر مر گئے۔ بعض کچھ دنوں کے بعد اس کا شکار ہوئے اور بعض ایسے بھی تھے کہ یا تو مرض نے انہیں چھو ایک بھی نہیں۔ اور اگر وہ اس کی پیٹ میں آ بھی گئے تو بچ گئے۔ مرے نہیں۔ جب ڈاکٹر صاحب سے اس کے متعلق پوچھا تو انہوں نے کہا کہ جن لوگوں میں قوتِ مدافعت کی کمی تھی وہ شروع ہی میں اس تخریبی حملہ کا شکار ہو گئے۔ جن میں قوتِ مدافعت قدرے زیادہ تھی وہ چند دن تک اس کا مقابلہ کرتے رہے۔ جن کی قوتِ مدافعت کافی زیادہ تھی مرض نے حملہ تو ان پر بھی اسی طرح کیا لیکن انہوں نے اس کا مقابلہ کر لیا اور مرض مغلوب ہو گیا۔

اس سے واضح ہے کہ دنیا میں تخریبی اور تعمیری قوتوں کی کشمکش کا سلسلہ ہر آن جاری رہتا ہے۔ جب تک تعمیری قوتیں تخریبی قوتوں پر غالب رہتی ہیں اسے صحت، توانائی اور زندگی کہا جاتا ہے۔ جب تخریبی قوتیں غالب آجاتی ہیں تو اسے کمزوری، بیماری اور بالآخر موت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ واضح رہے کہ کمزوری اور بیماری (حتیٰ کہ موت کے وقت بھی) تعمیری قوتیں کسی نہ کسی حد تک جسم میں موجود ہوتی ہیں لیکن تخریبی قوتوں کا پلڑا اس قدر بھاری ہو جاتا ہے کہ تعمیری قوتیں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔

مہلت کا وقفہ

جس قسم کے قوانین انسان کی طبیعی زندگی پر کار فرما ہیں، اس قسم کے قوانین کا اطلاق اس کی "انسانی زندگی" پر بھی ہوتا ہے۔ جہاں تک ایک فرد کا تعلق ہے، یہ بتایا جا چکا ہے کہ انسانی زندگی کا مقصد اس کی ذات کی نشوونما ہے۔ غلط اعمال وہ ہیں جن سے انسان کی ذات کمزور ہو جاتی ہے۔ اچھے کام وہ ہیں جن سے اس کی ذات نشوونما پر مستحکم ہوتی جاتی اور اس طرح زندگی کے اگلے ارتقائی مراحل طے کرنے کے قابل ہو جاتی ہے۔ غلط کاموں کو آپ تخریبی قوتیں کہئے اور صحیح کاموں کو تعمیری قوتیں۔ (اقوام کی صورت میں کیا ہوتا ہے اس کی بابت متعلقہ عنوان میں بتایا جائے گا)۔ ان تعمیری اور تخریبی قوتوں میں

باہمی کشمکش کا سلسلہ ہر آن جاری رہتا ہے۔ اس کشمکش میں جب تک تعمیری قوتوں کا پلڑا بھاری رہتا ہے انسان تباہی سے محفوظ رہتا ہے۔ جب تخریبی قوتیں غالب آجاتی ہیں، تو یہ پہلے مضحل ہو جاتا ہے اور آخر کار اس پر تباہی آجاتی ہے۔ یہ مدت جس میں تخریبی قوتیں اس طرح غالب نہیں آجاتیں کہ تعمیری قوتیں اٹھنے کے قابل ہی نہ رہیں، مہلت کا وقفہ کہلاتا ہے۔ قانونِ مکافات میں یہ مہلت کا وقفہ فی الواقعہ خدا کی بڑی رحمت ہے۔ ورنہ اگر یہ ہوتا کہ جو نبی انسان سے کوئی غلط عمل سرزد ہوتا، یہ تباہ ہو جاتا، تو کوئی انسان تباہی سے بچ ہی نہ سکتا۔

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللَّهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَا تَرَكَ عَلَيْهَا مِنْ ذَاتِهِ دَلِيلٌ
يُؤَخِّرُهُمْ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى ۖ فَإِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ
سَاعَةً وَلَا يَسْتَقْدِرُونَ ۝ (۱۶/۶۱)

اگر ایسا ہوتا کہ جو نبی لوگ زیادتی کرتے تو ان پر فوری گرفت ہو جاتی تو صفحہ ارض پر کوئی ذلت باقی ہی نہ بچتا۔ لیکن خدا نے عمل اور اس کے نتیجہ میں ایک وقفہ رکھا ہے۔ اس دوران میں اس کی بازیابی کا امکان ہوتا ہے۔ لیکن جب یہ مہلت کا وقفہ پورا ہو جاتا ہے تو پھر ظہورِ نتائج میں ذرا بھی تقدیم و تاخیر نہیں ہوتی۔

سورہ کہف میں اس مہلت کے وقفہ کے متعلق کہا کہ رَبَّنَا انْفَعُورْ ذُو الرَّحْمَةِ۔ خدا کا مقصد لوگوں کی پکڑ و حکم نہ نہیں۔ وہ درحقیقت ان کی حفاظت اور نشوونما چاہتا ہے۔ اگر یہ صورت نہ ہوتی تو یُؤَاخِذُهُمْ بِمَا كَسَبُوا لَعَجَلْ لَهُمُ الْخَذَابُ اور جو نبی کسی کا غلط قدم اٹھتا، اس کا مواخذہ ہو جاتا تو ان پر فوراً تباہی آجایا کرتی۔ بَلْ لَهُمْ مَوْعِدٌ..... لیکن ان کے لئے ایک مہلت کا وقفہ ہے۔ اس کے دوران انسان کو سامانِ حفاظت مل سکتا ہے۔ لیکن یہ اگر رخصت سے فائدہ نہ اٹھائے تو اس کے بعد اسے اس تباہی سے کہیں پناہ نہیں مل سکتی (۱۸/۵۸)۔

اجلِ مسمیٰ

عمل اور اس کے نتیجے کے درمیانی وقفہ کو اجل سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔ (اَجَلٌ كَيْسِي مِعَادٌ ہوتی ہے)۔ سورہ ابراہیم میں ہے۔ يَذْعُوكُمْ لِئَلَّا يَكْفُرَ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوبِكُمْ۔ خدا چاہتا ہے کہ

تہیں تباہی سے سامانِ حفاظت مل جائے۔ اس مقصد کے لئے اس نے کہا یہ ہے کہ ذُوْخِرْکُمْ اِلٰی اَجَلٍ مُّسَمًّی ۝ (۱۱۳/۱۰) تمہاری تباہی کو ایک معین مدت تک کے لئے مؤخر کر دیتا ہے۔ دوسری جگہ ہے۔ وَ لَا یَلْمِزُ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّکَ لَکَانَ لَزَامًا وَ اَجَلٌ مُّسَمًّی ۝ (۱۱۳/۱۲) اگر خدا نے پہلے ہی سے قانونِ ہمت مقرر نہ کر دیا ہوتا تو غلط عمل کے ساتھ ہی تباہی آجایا کرتی لیکن اس نے عمل اور اس کے نتیجہ کے درمیان ہمت کا عرصہ مقرر کر رکھا ہے۔ (نیز ۱۱۳/۱۲)۔

انسان اس غلط فائدہ اٹھاتا ہے

ہمت کا وقفہ اس لئے ملتا ہے کہ انسان (آخری تباہی آنے سے پہلے) اس سے بچنے کا سامان کر لے۔ (جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے) قانونِ عدل کے ساتھ قانونِ ہمت، خدا کی بہت بڑی رحمت ہے لیکن غلط ہیں انسان اس سے فائدہ اٹھانے کی بجائے، الٹا گمراہی میں پڑ جاتا ہے۔ وہ کہتا یہ ہے کہ میں نے یہ ظلم و زیادتی کی۔ تم کہتے تھے کہ ظلم کرنے والا تباہ ہو جاتا ہے۔ لیکن مجھے دیکھو کہ میں اسی طرح دندنا مچھ رہا ہوں۔ بلکہ ہر روز اور زیادہ پینپتا چلا جاتا ہوں۔ اگر خدا کا قانونِ مکافات فی الواقعہ کہیں موجود ہے تو وہ میری گرفت کیوں نہیں کرتا۔ وہ اس سے خود بھی گمراہ ہوتا ہے اور دوسرے لوگوں کو بھی گمراہ کرتا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ غلط معاشرہ میں غلط اعمال اتنی سرعت اور شدت سے پھیلتے ہی اس لئے ہیں کہ معاشرہ کا قانون، غلط کام کرنے والوں کا مواخذہ نہیں کرتا اور خدا کا قانونِ مکافات بھی ان کی فوری گرفت نہیں کرتا۔ سورۃ سبأ میں ہے۔ وَ یَقُولُونَ مَتٰی هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۝ (۳۴/۲۹) یہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو کہ ہماری غلط روش پر ہماری گرفت ہوگی، تو پھر بتاؤ کہ وہ کب ہوگی؟ اب تک تو ہمیں کچھ ہوا نہیں۔ جواب میں کہا گیا کہ قُلْ لَّکُمْ مِیْنَعًا یُّؤْمِرُ اِنْ سَأَلْتُمْ عَنْهُ سَاعَةً ۝ لَا تَسْتَفِیْذُوْنَ عَنْهُ سَاعَةً ۝ (۳۴/۳۰) ہمت کی اس مدت میں ایک ساعت کی بھی کمی بیشی نہیں ہو سکتی۔ سورۃ ابراہیم میں اسی قسم کا اعتراض کرنے والوں سے کہا گیا کہ خدا نے یہ ہمت کا وقفہ تو اس لئے مقرر کیا تھا کہ تم اس دوران میں اپنی حفاظت کا سامان کر لو اور تم اٹلے شک میں پڑ گئے کہ جو کچھ کہا جا رہا ہے وہ

فی الواقعہ ہوگا بھی یا نہیں (۱۳/۱۰)۔ ظلم اور زیادتی کرنے والوں کو قطعاً یہ گمان نہیں کرنا چاہیے کہ انکا مواخذہ نہیں ہوگا۔ اِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِیَعَذِّبَهُمْ تَشْخِصٌ فِیْهِ اِلَّا بُصَاۡرُ ۝ (۱۳/۲۲)۔ اس کے وقت مقررہ تک کے لئے مؤخر کیا گیا ہے اور جب وہ اپنے وقت پر آئے گا تو ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی۔ سورہ عنکبوت میں ہے کہ یہ لوگ اپنی تباہی کے لئے جلدی مچا رہے ہیں۔ یعنی کہتے ہیں کہ اگر ہماری غلط روی کا نتیجہ ہماری تباہی ہے تو وہ تباہی آتی کیوں نہیں۔ وَ لَا اَجَلٌ مُّسَمًّى لِّجَآءِ هُمْ اِنْعَازٌ ۝ اگر ہمارے قانون مکافات میں مہلت کا وقفہ نہ رکھا جاتا تو ان پر یہ تباہی کبھی کی آچکی ہوتی۔ وَلَیَّا یَنْتَهِمُ بَخْتَةً ۚ وَ هُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ ۝ (۲۹/۵۳) جب یہ مدت پوری ہوگئی تو اس وقت یہ تباہی اس طرح اچانک آجائے گی کہ ان کی عقل و فکر میں بھی یہ بات نہیں آئے گی کہ وہ کیسے آگئی اور کہاں سے آگئی۔ خود نبی اکرمؐ سے کہا گیا کہ آپؐ ان لوگوں کے اس قسم کے اعتراضات سے پریشان نہ ہوں۔ قَدْ نَرٰی ۚ وَ مَنْ یُّکَذِّبُ بِهٰذَا الْحَدِیْثِ ۚ جو لوگ کہتے ہیں کہ یہ دھمکی جھوٹی ہے تم انہیں میرے قانون مکافات کے حوالے کر دو۔ سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَیْثُ لَا یَعْلَمُوْنَ ۝ ہم انہیں ہندریجہ آہستہ آہستہ ان کی تباہی کے اس مقام کی طرف لئے جا رہے ہیں جس کا انہیں اس وقت کچھ علم نہیں۔ وَ اٰمَنَّا بِهُمْ۔ میں نے انہیں مہلت دے رکھی ہے۔ اس کے بعد ان کی گرفت ہوگی۔ اِنَّ کَیْدَیْ مَبِیْنٌ ۝ (۴۳/۲۵-۴۸) میری تدابیر بڑی حکم ہوتی ہیں۔ ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ ناکام رہ جائیں۔ انیزم ۱۱: (۸۶/۱۶ : ۴۳/۱۱)

یہ مہلت کا وقفہ مختلف جب رائج کی صورت میں مختلف ہوتا ہے۔ کیلا چھ مہینے میں پھل دینے لگ جاتا ہے۔ کھجور کے درخت کے متعلق کہتے ہیں کہ چالیس سال میں جا کر پھل لاتا ہے۔ اس مہلت کے وقفہ کا علم کسی کو نہیں ہوتا۔ اسی لئے مخالفین کے اس سوال کے جواب میں (کہ یہ تباہی کب آئے گی) آپؐ نے کہا کہ اِنْ اٰذِیْنِیْ اَقْرَبُیْتُ مَّا تُوْعَدُوْنَ اَمْرٌ یَّجْعَلُ لَّہٗ رَیْحًا اَمَدًا ۝ (۶۲/۲۵) میں نہیں کہہ سکتا کہ جس تباہی کی بابت تم سے کہا جاتا ہے وہ قریب ہی ہے یا کچھ عرصہ بعد آئے گی۔

مخالفین تو اس قسم کے سوال اعتراض کے طور پر کرتے تھے، لیکن خود جماعت مومنین کے دل میں بھی اس قسم کے خیالات کا پیدا ہونا فطری تھا کہ ہم اتنے عرصہ سے اس کشمکش میں مسلسل

مصرفِ تگ و تاز میں معلوم نہیں یہ سلسلہ کب تک رہے گا اور کب ہماری کامیابی اور فریقِ مخالف کو شکست ہوگی۔ شہدائِ کریم شاہد ہے کہ خود نبی اکرمؐ کے دل میں بھی بعض اوقات اسی قسم کے خیالات اُبھرتے تھے کہ معلوم نہیں کہ میں اپنی زندگی میں وہ دن دیکھ سکوں گا یا نہیں جب ہماری مجاہدانہ کوششیں بار آور ہوں گی۔ جب حق کو غلبہ حاصل ہوگا اور باطل کی قوتیں سسڑنگوں ہوں گی۔ اس کے جواب میں حضورؐ سے کہا گیا کہ اِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِي نَعِدُ هُمْ اَوْ نَتَوَقَّيَنَّكَ هُوَ سَكْتَابُ۔ ہوسکتا ہے کہ تمہاری تگ و تاز کے محسوس نتائج تمہاری زندگی میں ہی سامنے آجائیں اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ تمہاری وفات کے بعد برآمد ہوں۔ تمہیں اس کا خیال نہیں کرنا چاہیے کہ ایسا کب ہوگا۔ فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلْغُ وَ عَلَيْنَا الْحِسَابُ ۝ (۱۳/۴۰) تمہارا کام یہ ہے کہ تم اس دعوت کو عام کرتے جاؤ۔ یہ ہمارا کام ہے کہ دیکھیں کہ اس کے نتائج کب برآمد ہوتے ہیں۔ لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ (۱۳/۳۸) ہر ميعاد کے لئے بھی ایک قانون مقرر ہے لیکن اس قانون کا علم خدا کے سوا کسی کو نہیں۔ (نیز ۲۶/۱۰، ۲۳/۹۵، ۲۳/۴۲، ۴۲/۴۲)۔ ظاہر ہے کہ جماعتِ مومنین کے لئے یہ مرحلہ بڑا صبر آزما اور ہمت طلب ہوتا ہے۔ وہ کونسی چیز ہے جو اس طولِ علی عرصہ میں ان کا حوصلہ بلند رکھتی ہے اور ان کی مجاہدانہ سعی و عمل میں فرق نہیں آنے دیتی، اسے ایک مثال سے سمجھئے۔ ایک کسان زمین درست کر کے اس میں بیج ڈال دیتا ہے۔ پھر اس کے بعد اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ ہر صبح گھر سے نکلتا ہے چیلپلاتی دھوپ میں سارا دن اپنا لہو پسینہ ایک کر کے مصرفِ محنت رہتا ہے اور شام کو خالی ہاتھ واپس گھر آجاتا ہے۔ اور دوسری صبح پھر گھر سے نکل کر اسی عزم اور ہمت سے کھیت کی طرف چل دیتا ہے۔ وہ ایسا ایک دن، دو دن، دس دن، مہینہ بھر نہیں کرتا۔ مہینوں ایسا ہی کرتا چلا جاتا ہے اور کسی مقام پر یہ کہہ کر نہیں بیٹھ جاتا کہ میں سارا دن محنت کرتا ہوں اور شام کو خالی ہاتھ گھر واپس چلا آتا ہوں۔ مجھے اس سے ملتا کیا ہے۔ میں اس سعی لا حاصل میں اپنی جان کیوں کھپاؤں! وہ کبھی ایسا نہیں کرتا۔ سوال یہ ہے کہ وہ کون سا ایسا جذبہ ہے۔ کون سا خیال ہے جو اسے اس سعی پیہم پر آمادہ کئے رکھتا ہے اور کبھی ہمت نہیں ہارنے دیتا۔ یہ جذبہ اور یہ خیال اس کا اس بات پر "ایمان" ہے کہ میری محنت رائگاں نہیں جائے گی۔ زمین میں بیج ڈالنے اور فصل تیار ہونے کے درمیان ایک ميعاد ہوتی ہے۔ اس ميعاد کے ختم ہونے پر میری ساری محنت کا پھل میری جھولی میں آپڑے گا۔ شہدائِ کریم کی اصطلاح میں اس قسم کے ایمان کو

”ایمان بالغیب“ کہتے ہیں۔ یعنی اپنی محنت کے ان نتائج پر ایمان جو ہنوز محسوس طور پر سامنے نہیں آئے جماعتِ مومنین کا یہی وہ ایمان بالغیب ہے جو انہیں اس قدر جاں گداز اور صبرِ آزما مراحل میں ہمت نہیں ہارنے دیتا۔ ان کا ایمان ہوتا ہے کہ **ذَیْنَحْ اِلٰہُ الْبَاطِلُ وَ یُحِقُّ الْحَقُّ بِکَلِمَتِہٖ** (۲۴/۲۲)۔ خدا کا قانون یہ ہے کہ حق آخر الامر قائم ہوتا ہے اور باطل مٹ جاتا ہے۔ لیکن اس میں وقت لگتا ہے اس قسم کی جماعت جو بن دیکھے نتائج پر ایمان رکھ کر مصروفِ سعی و عمل رہتی ہے **اَلَا وَاَنْتَ کَانَ عَلَیْکَ اَلْاَوَّلُ** کہلاتی ہے۔ یہ وہ (PIONEERS) ہیں جن کے مدارج یقیناً ان لوگوں سے بلند ہوتے ہیں جو اس اسکیم کے ورثہ نتائج کو اپنی آنکھوں کے سامنے مشہود دیکھ کر اس پروگرام میں شریک ہوں۔ قرآنِ کریم میں **اِنَّ السَّالِفِیْنَ** الاؤلون کے علوم تربیت اور رفعتِ مدارج کا ذکر متعدد مقامات پر آیا ہے۔

یہ بات ضمنتاً سامنے آگئی تھی۔ ہم کہہ رہے تھے کہ عمل اور اس کے نتیجے کے محسوس طور پر سامنے آنے میں ایک وقفہ ہوتا ہے۔ اس وقفہ کی مدت مختلف حالات میں مختلف ہوتی ہے۔ قوموں کی زندگی میں یہ مدت بڑی طویل طویل ہوتی ہے۔ کیونکہ قوموں کی عمر افراد کی عمر کی طرح، دنوں، مہینوں اور سالوں کے حساب سے نہیں پائی جاتی، وہ صدیوں اور قرون کے پیمانے سے پائی جاتی ہے۔ سورۃ حج میں ہے۔ **وَاِنْ تَسْتَجِیْزُوْکَ بِاَلْحَدِّ اَب۔** یہ لوگ تم سے پوچھتے ہیں کہ وہ تباہی جس سے تم نہیں ڈراتے ہو، جلدی کیوں نہیں آتی۔ ان سے کہو کہ **وَ لَنْ یُّخْلِیَنَّ اِلٰہُ وَ غَدَا۔** خدا کا قانون مکافات بالکل برحق ہے۔ اگر تباہی میں تاخیر ہو رہی ہے تو اس سے یہ نہ سمجھ لو کہ وہ قانون جھوٹا ہے، تمہیں یونہی دھکی دی جا رہی ہے۔ وہ قانون بالکل سچا ہے، یہ تباہی آکر رہے گی۔ بات صرف یہ ہے کہ عمل اور اس کے نتیجے میں مہلت کا وقفہ ہوتا ہے۔ اور جہاں تک قوموں کا تعلق ہے یہ وقفہ صدیوں کے حساب سے ماپا جاتا ہے۔ **وَ اِنَّ یَوْمًا عِنْدَ رَبِّکَ کَاَلْفِ سَنَۃٍ مِّمَّا تَعٰلٰی ذٰلٰکَ** (۲۲/۲۴) حقیقت یہ ہے کہ خدا کا ایک ایک دن تمہارے حساب و شمار سے ایک ایک ہزار سال کے برابر ہوتا ہے۔ لہذا اگر تمہاری تباہی تمہارے سامنے جلدی سے نہیں آرہی تو اس سے تم اس نتیجہ پر نہ پہنچ جاؤ کہ خدا کا قانون ہی غلط ہے۔ اس قانون کی صداقت کی شہادت چاہتے ہو تو تاریخ کے اوراق سے پوچھو۔ وہ تمہیں بتا دیں گے کہ **وَ کَا یٰقُ مَرِّ قَرْیَۃٍ اَمَلِیْمٰتُ لَهَا وَ هِیَ ظَالِمَۃٌ** کتنی ہی قومیں ایسی تھیں جو ظلم پر ظلم کئے جا رہی تھیں لیکن ان کی گرفت فوراً نہیں ہوتی تھی، انہیں مہلت دی جاتی تھی۔ **ثُمَّ اَخَذْنَا لَهَا** جب وہ مدت ختم

ہو جانی بھی تو انہیں پکڑ لیا جاتا تھا۔ ذِی الْقِیَاصِ الْمَصْنُوعِ (۲۲/۴۸) اس لئے کہ آخر الامر ہر قوم کا معاملہ ہمارے قانونِ سکافات کی رو ہی سے طے پاتا ہے۔

توبہ

- آپ نے کسی گاؤں جانا ہے۔ راستے میں ایک دورا ہے پر پہنچ کر آپ کا قدم غلط سمت کی طرف اٹھ گیا۔ کچھ عرصہ آپ چلتے رہے۔ اس کے بعد آپ کو قرآن سے احساس ہوا یا کسی سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ آپ غلط راستے کی طرف مڑ گئے تھے۔ آپ کو اس دورا ہے سے دوسری سمت مڑنا چاہیئے تھا۔
- اپنی غلطی کے اس احساس پر آپ کیا کرتے ہیں۔ آپ پچھلے پاؤں اسی دورا ہے پر واپس آتے ہیں اور اس کے بعد صحیح سمت کی طرف مڑتے ہیں۔ آپ نے غور فرمایا کہ آپ کو صحیح منزل پر پہنچنے کے لئے کیا کرنا پڑا۔
- ۱۔ سب سے پہلے آپ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ آپ کا قدم غلط سمت کی طرف اٹھ گیا تھا۔ اگر آپ کو اس کا احساس یا علم نہ ہوتا تو آپ اسی راستے پر چلے جاتے اور آپ کبھی منزلِ مقصود تک نہ پہنچ سکتے۔ آپ کا وقت اور توانائی جو اس مسافت کے طے کرنے میں صرف ہوتی سب رائیگاں جاتی۔
 - ۲۔ اگر غلطی کا احساس ہونے پر آپ آگے چلنا تو بند کر دیتے لیکن اسی مقام پر بیٹھ جاتے تو بھی آپ اپنی منزلِ مقصود تک کبھی نہ پہنچ سکتے۔
 - ۳۔ غلطی کے احساس پر آپ پچھلے پاؤں واپس لوٹے اور اس طرح اس مقام پر پہنچ گئے جہاں سے آپ صحیح سمت کی طرف مڑ سکتے تھے۔ اس طرح (غلطی کے احساس کے بعد) صحیح مقام کی طرف واپس لوٹنے کو عربی زبان (اور قرآنِ کریم کی اصطلاح) میں توبہ کہتے ہیں۔
 - ۴۔ لیکن اگر آپ اس دورا ہے پر واپس آکر صحیح سمت کی طرف نہ چلتے تو بھی آپ منزلِ مقصود تک نہ پہنچ سکتے۔ اس طرح صحیح سمت کی طرف چلنے کا نام اصلاً توبہ ہے۔ یعنی اپنی غلطی کے احساس و اعتراف کے بعد اپنے نقصان کی تلافی کے لئے صحیح قدم اٹھانا۔ قرآنِ کریم نے اس پر دو گرام کے دونوں اجزاء (غلط مقام سے دورا ہے کی طرف واپس اور وہاں سے صحیح راستے پر گامزن ہونے) کو ناکب و اصلح سے تعبیر کیا ہے۔ اس سے تلافیِ مافات ہو جاتی ہے۔

اس سے آپ نے دیکھ لیا کہ توبہ کے معنی ”کچھ پڑھ کر خدا سے بخشش مانگنے“ کے نہیں۔ اس سے مراد تلائی مافات کے لئے کچھ علا کر کے ہیں۔ جس مقام پر آپ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تھا، اگر آپ وہاں ٹیٹ کر سو سال تک بھی ”یا اللہ میری توبہ۔ یا اللہ میری توبہ“ کا درد کرتے رہتے، تو بھی آپ اپنی منزل مقصود تک کبھی نہ پہنچ سکتے۔ غلط اقدامات کے نقصان کی تلائی کی صورت یہ ہے کہ آپ اس کے بعد اتنے اچھے کام کریں جن کے تعمیری نتائج ان تخریبی نتائج کا ازالہ کر دیں۔ قرآن کریم نے اس سلسلہ میں یہ اصول بیان کیا ہے کہ

(إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ) ۱۱/۱۱۴

یاد رکھو! غلط کاموں کے تخریبی نتائج کی تلائی اچھے کام کرنے سے ہوتی ہے۔

ادھر کی مثال کے سلسلہ میں قرآن کریم میں ہے کہ غلط سمت کی طرف چلنے والے کے نقصان کا ازالہ اس طرح ہوتا ہے کہ مَنْ قَابَ وَ أَمِنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدَىٰ (۲۰/۸۲) جو غلط راستے سے واپس لوٹتا ہے (قَاب) وہاں پہنچ کر اس بات کا اطمینان کر لیتا ہے کہ منزل مقصود کی طرف کونسا راستہ جاتا ہے (أَمِنَ) اور اس کے بعد پھر جاوہ پیمانہ ہو جاتا ہے (عَمِلَ صَالِحًا) تو وہ منزل مقصود تک پہنچ سکتا ہے (اهْتَدَىٰ)۔ اُولَئِكَ يُبَدِّلُ اللَّهُ سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنَاتٍ ۖ (۲۵/۴۰) یہ وہ ہیں جن کی ناہمواریاں، ہمواریوں میں بدل جاتی ہیں۔ سورہ قصص میں ہے۔ فَأَمَّا مَنْ قَابَ وَ أَمِنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَحَسْبَىٰ أَنْ يَكُونَ مِنَ الْمُفْلِحِينَ ۝ (۲۸/۶۴) جو غلط راستے سے لوٹ آیا، پھر اس امر کا اطمینان کر لیا کہ صحیح راستہ کونسا ہے اور پھر اس پر چل پڑا، تو یہ لوگ ہیں کامیابیاں جن کے قدم چومیں گی۔ دوسری جگہ ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں (مَنْ) قَابُوا وَ احْتَبَعُوا سَبِيلَكَ (۳۶/۴) جو غلط راستے سے مڑ کر خدا کی طرف لے جانے والے راستے پر چل پڑے اور اس طرح انہوں نے بَدَّلَ حُسْنًا بَعْدَ شُوْرٍ (۱۱/۱۲۴) اچھے کام کر کے اپنی غلطیوں کا ازالہ کر لیا۔

قانونِ مکافاتِ عمل میں تلائی مافات کی گنجائش رکھنا خدا کی رحمت ہے۔ اس لئے خدا نے اپنے آپ کو تَوَّابٌ الرَّحِيمُ کہا ہے (۲/۲۴)۔ یعنی جو شخص غلط سمت سے مڑ کر صحیح سمت کی طرف قدم اٹھائے اسے منزل مقصود تک پہنچا دینے والا۔ یہ اس کی رحمت ہے۔ یاد رکھئے۔ خدا انہی کے لئے تَوَّابٌ وَرَحِيمٌ ہے جو غلط راستے سے واپس لوٹ کر صحیح راستہ اختیار کر لیں۔ سورہ بقرہ میں ہے۔

إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا وَآمَنُوا وَاتَّقَوْا فَآذَنَّاكَ أَتُوبُ عَلَيْهِمْ
وَ إِنَّا للتَّوَّابُ الرَّحِيمُ ۝ (۲/۱۶۰)

غلط اقدام کے نقصان سے وہی بچ سکتے ہیں جو غلط راستے سے واپس لوٹیں اور پھر صلاحیت بخش کام کریں اور اس طرح واضح کر دیں کہ وہ پھر غلط روش پر نہیں چلیں گے۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کی طرف خدا کا قانونِ مکافات پلٹ کر آ جاتا ہے۔ اس لئے کہ خدا تواب اور رحیم ہے۔

اس سے واضح ہے کہ اصلاح کا امکان اسی کے لئے ہے جو اس کا اعتراف کرے کہ اس سے غلطی ہو گئی ہے۔ جو اپنی غلطی کا اعتراف نہیں کرتا وہ اپنی اصلاح کبھی کر ہی نہیں سکتا۔ اس بنیادی حقیقت کو قرآن کریم نے قصۂ آدم کے تمثیلی انداز میں بڑے حسین انداز میں واضح کیا ہے۔ آدم سے غلطی ہوئی اور جب اسے اس کا احساس ہوا تو وہ پکارا کھٹاکہ رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنْفُسَنَا وَإِنْ لَمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ ۝ (۴/۲۳) اے ہمارے نشوونما دینے والے! ہم سے غلطی ہوئی، ہم اپنے آپ پر زیادتی کر بیٹھے۔ اگر تیری طرف سے سامانِ حفاظت نہیں ملے گا تو ہم تباہ ہو جائیں گے۔ اس کے جواب میں کہا گیا کہ جب تم نے اپنی غلطی کا احساس کر کے اپنی ذمہ داری کو قبول کر لیا ہے تو تمہارے لئے باز آفرینی کا امکان ہے۔

ایک غلطی ابلیس سے بھی ہوئی۔ جب اسے کہا گیا کہ تم نے ایسا کیوں کیا ہے تو اس نے کہا کہ یہ کچھ نہیں نے کہاں کیا ہے۔ قَالَ رَبِّ هَذَا غَوًیً لَّئِنْ لَمْ تَرْحَمْنِي أَكُونَ مِنَ الْخَاسِرِينَ ۝ (۱۵/۳۹) اے میرے مگر وہ کیا تو میں غلط راستے پر چل پڑا۔ اس کے جواب میں کہا گیا کہ جب تو غلط روی کے لئے اپنی ذمہ داری ہی قبول نہیں کرتا تو تو اپنی اصلاح کس طرح کر سکتا ہے۔ لہذا "ابلیس پر توبہ کے دروازے بند ہو گئے۔"

(۱۱)

ایک مثال اور سامنے لائیے۔ ایک شخص غلطی سے سنکھیا کھا جاتا ہے۔ جب اسے اس کا احساس ہوتا ہے تو وہ فوراً دوڑ دھوپ کرتا ہے۔ ڈاکٹر کے پاس جاتا ہے۔ اس کی ہدایت کے مطابق دوائی پیتا ہے اس کے بچ جانے کی امید کی جاسکتی ہے۔

لیکن ایک شخص خودکشی کی غرض سے دانت زہر کھاتا ہے۔ جب زہر کا اثر ظاہر ہونے لگتا ہے

تو وہ مطمئن ہو جاتا ہے کہ زہر اپنا کام کر رہا ہے، تھوڑے ہی عرصہ کے بعد اس کا مقصد حاصل ہو جائے گا یعنی اس کی زندگی کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اس شخص کے لئے ”غلطی کے ازالہ“ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ زہر کھانے کو غلطی سمجھتا ہی نہیں اس لئے اس کے ازالہ کی فکر کیوں کر لے لگا۔ سورۃ نسا میں ہے۔

إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللَّهِ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ الشُّوْءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوبُونَ
مِنْ قَرِيبٍ فَأُولَٰئِكَ يَتُوبُ اللَّهُ عَلَيْهِمْ ۖ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ۝
(۲/۱۷) (نیز ۴/۵۴، ۵/۱۱۹، ۱۶/۱۶)

توبہ اس کے لئے ہے جو کوئی غلط کام نادانستہ کر بیٹھے۔ پھر اس کا احساس ہونے پر فوراً واپس لوٹ آئے۔ یہ وہ ہیں جن کی طرف خدا لوٹ کر آتا ہے۔ وہ علیم و حکیم ہے۔ غلطی کے بعد باز آفرینی کا امکان فی الواقعہ خدا کی بہت بڑی رحمت ہے۔ ورنہ اگر صورت یہ ہو کہ جس سے کوئی لغزش ہو گئی ہے وہ ہمیشہ کے لئے راندہ درگاہ ہو گیا اور اس پر تلافی مافات کی تمام راہیں مسدود ہو گئیں، تو اس ابدی مایوسی سے انسان کی جو نفسیاتی کیفیت ہو سکتی ہے وہ ظاہر ہے۔ اسی لئے سورۃ زمر میں کہا گیا کہ

قُلْ يُعْبَادِي الَّذِينَ أَسْرَفُوا عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِنْ رَحْمَةِ اللَّهِ
إِنَّ اللَّهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا ۖ إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ۝ (۳۹/۵۳)
اے رسول! میرے بندوں سے کہہ دو کہ اگر تم اپنے آپ پر کچھ زیادتی کر بیٹھے ہو تو اس سے تم پر ابدی مایوسی نہیں چھاجانی چاہیے۔ تمہارے لئے باز آفرینی کے امکانات موجود ہیں۔ تمہیں تمہاری لغزشوں سے پیدا شدہ نقصان سے سامان حفاظت مل سکتا ہے۔ خدا سامان حفاظت عطا کرنے والا اور انہوں کے لئے اسباب نشوونما مہیا کرنے والا ہے۔

اس کے قانون مکافات میں یہ کچھ بھی موجود ہے۔ لیکن ان کے لئے جو اپنی غلطی کے احساس کے بعد اس کی اصلاح کے لئے عملاً کوشاں ہوں و لَمْ يُصِرُّوا عَلَىٰ مَا فَعَلُوا (۳/۱۳۴)۔ یہ نہیں کہ اپنی غلطی پر جھجے رہیں اور اس کی توقع کریں کہ

”خدا اپنی رحمت سے انہیں بخش دے گا۔“

مغفرت

قانونِ مکافاتِ عمل کی رو سے ”بخشش“ کا تصور ہی غلط ہے۔ اسے ایک مثال سے سمجھئے۔ آپ نے کسی شخص پر زیادتی کی۔ اس کے بعد آپ نے اس سے معافی مانگ لی اور اس نے آپ کو معاف کر دیا۔ اس ”معاف کر دینے“ کے معنی یہ ہیں کہ وہ آپ سے اس زیادتی کا بدلہ نہیں لے گا۔

اس نے آپ کو معاف نہیں کیا اور معاملہ عدالت تک پہنچ گیا۔ عدالت نے آپ کو معاف کر دیا یعنی آپ کو اس جرم کی سزا نہیں دی۔

ان دونوں صورتوں میں آپ اپنے جرم کی طبعی سزا سے بچ گئے۔ لیکن اس جرم کے ارتکاب سے جو اثر آپ کی ذات پر مرتب ہوا ہے وہ تو زائل نہیں ہو سکا۔ اسے کوئی دوسرا زائل کر ہی نہیں سکتا۔ اسے تو آپ خود ہی زائل کر سکتے ہیں۔ یعنی توبہ سے۔ بالفاظِ دیگر اپنے اس عمل سے کہ آپ اپنی غلطی کے احساس سے ناوم ہوں۔ پھر ایسے اچھے کام کریں جن کا تعمیری نتیجہ آپ کے اس غلط کام کے تخریبی اثر کا ازالہ کر دے۔ اسے (OUT-WEIGHT) کر دے، اسے مغفرت کہتے ہیں۔ مغفرت کے معنی ہیں سامانِ حفاظت۔

سامانِ حفاظت کی دو شکلیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ آپ شروع ہی سے غلط اقدام سے پرہیز کریں اور اس طرح غلط اقدام کے نقصان سے محفوظ رہیں۔ یہ زندگی کی بڑی ستھن اور محفوظ شکل ہے۔ (اسے تقویٰ کہتے ہیں)۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اگر آپ سے کوئی غلط کام ہو گیا ہے تو آپ حسنِ عمل کے خوشگوار نتائج کے زور سے اس غلط کام کے نقصان سے محفوظ رہ جائیں۔ یہ توبہ ہے۔ طبی اصطلاح میں پہلے انداز کو حفظِ اقدم (PREVENTIVE) اور دوسرے طریق کو معالجہ (CURATIVE) کہتے ہیں۔ لیکن ان دونوں صورتوں میں آپ کو حفاظت کا شامیانہ خود اپنے عمل سے مل سکے گا۔ (جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے) اسے قرآنِ کریم کی اصطلاح میں مغفرت کہتے ہیں۔ مغفرت اس آہنی ٹوپی (HELMET) کو کہتے ہیں جسے سپاہی بغرض حفاظت سر پہن لیتے ہیں۔ استغفار کے معنی ہیں سامانِ حفاظت طلب کرنا۔ شروع میں حفاظتی تدابیر اختیار کرنا اور غلط قدم اٹھ جانے کے بعد اس کے معالجہ کے لئے جدوجہد کرنا۔ اس سے واضح ہے

کہ قرآنِ کریم کی رو سے ”گناہوں کی بخشش“ کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ واضح رہے کہ ہم جب کوئی جرم کرتے ہیں (یعنی قانونِ خداوندی کی خلاف ورزی کرتے ہیں) تو ہم خدا کے خلاف کوئی زیادتی

نہیں کرتے جو وہ ہیں معاف کر دے۔ ہم خود اپنے خلاف زیادتی کرتے ہیں جسے کوئی معاف نہیں کر سکتا۔ اس کا ازالہ ہمیں اپنے حسن عمل سے خود ہی کرنا ہوگا۔ قرآن کریم میں جہاں خدا نے کہا ہے کہ "يَغْفِرُ الذُّنُوبَ" (یا اس نے اپنے آپ کو غفور کہا ہے) تو اس کا یہ مفہوم نہیں کہ "خدا گناہوں کو بخش دیتا ہے" اس سے مراد یہ ہے کہ اس نے اپنے قانونِ مکافات میں اس کی گنجائش رکھ دی ہے کہ انسان کو اس کے غلط اقدامات کے تخریبی اثرات سے سامانِ حفاظت مل جائے۔ يَغْفِرُ لِمَن يَشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَن يَشَاءُ۔ غلط قدم اٹھ جانے کے بعد جو شخص چاہے کہ اسے اس کے نقصانات سے حفاظت کا سامان مل جائے تو اسے اس کے حسن عمل کی بدولت ایسا سامان مل سکتا ہے۔ لیکن جو ایسا نہ چاہے تو وہ نقصان سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ خدا نہ تو کسی کو یونہی نقصان پہنچاتا ہے اور نہ ہی کسی کے حرام کو بخش دیتا ہے۔

خفت و ثقل موازین

صحت اور مرض کی اس مثال کو ایک بار پھر سامنے لائیے جسے شروع میں بیان کیا گیا ہے۔ تخریبی عناصر ہر آن ہمارے جسم پر حملہ آور ہوتے رہتے ہیں۔ جب تک جسم میں قوتِ مدافعت کافی ہوتی ہے وہ عناصر اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ انسان تندرست رہتا ہے۔ جب اس میں قوتِ مدافعت کی کمی ہو جائے تو تخریبی عناصر غالب آجاتے ہیں اور انسان بیمار ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر ایک تو ان تخریبی عناصر کی روک تھام کی تدبیر کرتا ہے اور دوسرے مریض کی قوتِ مدافعت کو بڑھانے کی کوشش کرتا ہے۔ جب قوتِ مدافعت غالب آجاتی ہے تو مریض اچھا ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر قوتِ مدافعت اس تناسب سے نہ بڑھے اور تخریبی عناصر کا غلبہ زیادہ ہو جائے تو ایک وقت ایسا آجاتا ہے جب ہر تدبیر ناکام رہ جاتی ہے اور انسان مر جاتا ہے۔ تخریبی اور تعمیری عناصر میں یہ کشمکش انسانی زندگی میں ہر آن جاری رہتی ہے۔ فیصلہ کن سوال یہ ہوتا ہے کہ اس میزان میں پلڑا کس کا بھاری ہے۔ اگر ہمارا تعمیری عناصر کا پلڑا بھاری ہے تو ہم تب اسی سے محفوظ رہتے ہیں۔ اگر تخریبی عناصر کا پلڑا بھاری ہو جاتا ہے تو ہم نقصان اٹھاتے اور آخر الامر تباہ ہو جاتے ہیں۔ قرآن کریم نے حفاظت اور تباہی کا یہی اصول بتایا ہے جہاں کہا ہے کہ

وَالْأَوْزُنُ يُوزَنُ بِالْحَقِّ ۖ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ

الْمُفْلِحُونَ ۝ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوا
أَنفُسَهُمْ بِمَا كَانُوا بِآيَاتِنَا يَظْلِمُونَ ۝ (۸۱-۷۹)

ظہورِ ستارے کے وقت، اعمال کا وزن ٹھیک ٹھیک سامنے آجائے گا۔ پھر جس کا تعمیری
اعمال کا پلڑا بھاری ہو گا وہ کامیاب ہوں گے اور جس کا پلڑا ہلکا ہو گا وہ تباہ ہو جائیں گے
یوہا اس کے کہ انہوں نے ہمارے قوانین کے ساتھ زیادتی کی۔

سورۃ مومنوں میں انہی الفاظ کے بعد کہا گیا ہے کہ یہ لوگ جہنم میں رہیں گے (۱۰۲-۱۰۳/۲۳) اور سورۃ
القارۃ میں ہے فَأَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ لَا يُغْنِي عَنْهُ كَيْفُ عِيشَةٍ رَّاٰ ضَيِّقَةٍ ۝ جس
کا پلڑا بھاری ہو گا وہ خوشگواہی کی زندگی بسر کرے گا۔ وَ أَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ ۝
فَأُمُّهُ هَاوِيَةٌ ۝ (۶۱-۱۰۱/۹) جس کا پلڑا ہلکا ہو گا تو اس کا ٹھکانہ ہاویہ ہو گا۔ یعنی شعلہ ریز جہنم۔

یہ ”ثقل و خفت موازین“ کا اصول ایک عظیم حقیقت اپنے اندر رکھتا ہے۔ لغزش کا امکان
ہر انسان کے ساتھ ہے۔ اگر کسی کی ایک لغزش سے اس پر ابدی تباہی وارو ہو جائے تو دنیا میں کوئی
انسان بھی سعادت و کامرانی سے بہرہ یاب نہ ہو سکے۔ عیسائیوں نے یہ عقیدہ وضع کیا کہ نسل انسانی
کے اولیں ماں باپ — آدم اور حوا — سے ایک لغزش سرزد ہوئی جس کی پاداش میں وہ جنت سے
نکال دیئے گئے۔ اب ان کا یہ گناہ، ہر انسانی بچہ اپنی پیدائش کے ساتھ اپنے ساتھ لاتا ہے جو کسی صورت
میں دھل ہی نہیں سکتا، بجز حضرت مسیح کے صلیب اور کفارہ پر ایمان لانے کے۔ اس ایک عقیدہ نے
نوع انسانی کو جن تباہیوں کے غاروں میں دھکیل دیا ہے اس پر تاریخ کے اوراق شاہد ہیں — وہ
گناہ جس کا ذمہ دار وہ انسانی بچہ نہیں، ایسا انمٹ کہ اس کے ہزار اعمال حسنہ بھی اس کی تباہی سے
اسے بچا نہیں سکتے۔ اور کفارہ کا عقیدہ گناہوں کے لئے ایسا ”اذن عام“ کہ جو جی میں آئے کرتے ہو،
تم سے کوئی باز پرس ہی نہیں ہوگی۔ جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں، ”مشرانِ کریم کی رُو سے“ اس دنیا میں
انسان کے لئے پروگرام یہ ہے کہ وہ اپنی ذات کی اس حد تک نشوونما کر لے جس سے وہ ”زندگی کی اگلی
ارتقائی منزل میں پہنچنے کے قابل ہو سکے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے نظامِ تعلیم میں طالب علموں کے امتحانات۔
یہ امتحان اس بات کے جانچنے کے لئے ہوتے ہیں کہ طالب علم میں اتنی صلاحیت اور استعداد پیدا ہو چکی
ہے یا نہیں جس سے یہ اگلی کلاس میں چلنے کے قابل ہو سکے گا۔ اس کے لئے ایک معیار مقرر کیا جاتا ہے۔

مثلاً ”ساتھ فی صد پاس مار کس“ جو لڑکا سو میں سے ساتھ نمبر حاصل کر لیتا ہے اس کی صلاحیتوں کا پلڑا جھکا ہوتا ہے اس لئے اسے اگلی جماعت میں ترقی دے دی جاتی ہے۔ بالفاظ دیگر اس کی چالیس فی صد کمی کی تلافی اس کے ساتھ فی صد نمبر کر دیتے ہیں۔ اس کے برعکس جو لڑکا چالیس فی صد نمبر حاصل کرتا ہے اسے اگلی جماعت میں ترقی نہیں دی جاتی۔ بالفاظ دیگر اس کے حاصل کردہ نمبر رائیگاں چلے جاتے ہیں۔

شَدَّانِ کریم کی اصطلاح میں اسے ”حَبِطُ اَعْمَال“ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ (موت کے وقت بھی انسان کے جسم میں کچھ نہ کچھ توانائی باقی ہوتی ہے۔ لیکن چونکہ وہ اس کی زندگی کی سہارا بننے کے لئے کافی نہیں ہوتی۔ اس لئے وہ رائیگاں چلی جاتی ہے اور انسان پر موت طاری ہو جاتی ہے۔ یہ بھی حَبِطُ اَعْمَال کی ایک مثال ہے)۔ اُولَئِكَ الَّذِیْنَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِی الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَةِ ذٰلِکَ (۳/۲۱)۔

یہ وہ لوگ ہیں جن کے اعمال دنیا اور آخرت دونوں میں رائیگاں چلے گئے۔ کیونکہ وہ ان کی مدافعت کرنے کے لئے ناکافی تھے۔ (نیز ۵/۵۹ : ۹/۹۹)۔ سورہ نور میں کہا کہ یہ اعمال سراب کی طرح ہوتے ہیں جن کی حقیقت کچھ نہیں ہوتی (۲۴/۳۹)۔ ان کا وزن پر کواہ جتنا بھی نہیں ہوتا (۲۵/۲۳)۔ منافقین کے اعمال کی یہی کیفیت ہوتی ہے۔ بظاہر بڑے وزنی دکھائی دیتے ہیں لیکن ان کی حقیقت اور اصلیت کچھ نہیں ہوتی (۳۳/۱۹)۔ یہ وہ لوگ ہیں جو قوانین خداوندی کی صداقت پر یقین نہیں رکھتے (۴۷/۹)۔ یہ خود بھی خدا کے متعین کردہ پروگرام کے مطابق نہیں چلتے اور دوسروں کو بھی اس راہ پر چلنے سے روکتے ہیں۔ اس راستے میں سنگ گراں بن کر حائل ہو جاتے ہیں (۴۷/۱)۔

کوئی فارمولا کیسا ہی صحیح کیوں نہ ہو اس کی کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ اس میں کوئی آمیزش نہ کی جائے۔ اس پر خالصتہ عمل کیا جائے۔ اگر کوئی شخص کچھ اجزاء ایک فارمولا کے لئے لے لے اور کچھ اجزاء کسی اور فارمولا کے، تو وہ اپنے پروگرام کے لئے کتنی ہی محنت کیوں نہ کرے اسے کبھی کامیابی حاصل نہیں ہو سکے گی۔ جو مریض کچھ دوائیاں ڈاکٹر کے نسخہ سے لے لیتا ہے اور کچھ کسی طبیب (یا عطائی) کے نسخے سے اور دونوں کو ملا کر اپنا علاج شروع کر دیتا ہے، وہ شفا کے بجائے موت کو آوازیں دیتا ہے۔ شَدَّانِ کریم کی اصطلاح میں اسے شرک کہا جاتا ہے۔ یعنی قوانین خداوندی کے ساتھ غیر خداوندی قوانین کی آمیزش۔ ظاہر ہے کہ اس کا نتیجہ ناکامی کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔ ایسا کرنے والے کا سب کیا کریا رائیگاں چلا جاتا ہے۔ اُولَئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ (۱۹/۱۶) : (۷/۸۹)۔ سورہ

زمر میں ہے۔

وَلَقَدْ أُوحِيَ إِلَيْكَ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكَ ۖ لَئِنْ اشْرَكْتَ
لَيُخْطَبَنَّ عَلَيْكَ ۖ لَتَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ ۝ (۳۹/۶۵)

یہ حقیقت ہے کہ ہم نے تیری طرف بھی یہ وحی کی ہے اور تم سے پہلے جن کی طرف وحی کی
تھی ان سے بھی یہی کہا تھا کہ اگر تم شرک کرو گے تو تمہارے اعمال رائیگاں چلے جائیں گے۔

امتحان میں کامیابی کے لئے کچھ مضامین لازمی ہوتے ہیں جن میں پاس ہونا ضروری ہوتا ہے اور کچھ اختیاری۔
اگر کسی طالب علم نے لازمی مضمون کا پرچہ ہی نہیں دیا یا وہ اس میں فیل ہو گیا ہے تو اس کے دوسرے
پرچے دیکھنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ "خداوندی نصاب تعلیم" میں بھی بعض "مضامین" لازمی ہوتے
ہیں۔ جو ان مضامین میں فیل ہو جائے اس کے دوسرے پرچے دیکھنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔
اس حقیقت کو قرآن کریم نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔ قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ
أَعْمَالًا ۚ ان سے کہو کہ کیا میں تمہیں بتاؤں کہ وہ لوگ کون ہیں جو اعمال کے معاملہ میں سب سے زیادہ
نقصان میں رہیں گے؟ الَّذِينَ صَلَّاهُ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ
أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا ۝ یہ وہ لوگ ہیں جن کے بیشِ نظر صرف دنیاوی زندگی کے مفاد و مقاصد کا
حصول ہوتا ہے اس سے زیادہ کوئی مقصد ان کے سامنے ہوا ہی نہیں۔ ان مفاسد کو وہ جائز و ناجائز ہر طریق سے
حاصل کرتے رہتے ہیں اور ہر جرمِ خوئس سمجھتے ہیں کہ وہ بہت بڑا تیرا رہے ہیں۔ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا
بِآيَاتِ رَبِّهِمْ ۚ وَلَٰفَاقَةُ ۚ یہ وہ لوگ ہیں جو قوانینِ خداوندی سے سرکشی برتتے ہیں اور اعمال
کے نتائج کے سامنے آنے سے یکسر انکار کرتے ہیں۔ فَخِطَّ لَهُمْ سَوَاسُ ان کے تمام اعمال
رائیگاں جائیں گے۔ فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ وَزْنًا ۝ (۱۸/۱۰۵-۱۰۳) ان
کے لئے اس کی بھی ضرورت نہیں پڑے گی کہ ان کے اعمال کا وزن کرنے کے لئے میزان کھڑی کی جائے۔
ان کی ناکامیاں ان کے ماتھے پر لکھی ہوں گی۔ واضح رہے کہ ان لوگوں کو دنیاوی زندگی کے مفاد ان
کی کوششوں کے مطابق مل جائیں گے۔ اس لئے کہ دنیاوی مفاد کا حصول طبعی قوانین کی رُو
سے ہوتا ہے۔ جو بھی ان قوانین کے مطابق کام کرے گا اسے اس کی محنت کا صلہ مل جائے گا۔ اس
میں کافر و مومن کی کوئی تفریق و تمیز نہیں۔ اس کے لئے حیاتِ بالآخرت پر ایمان کی بھی شرط نہیں۔

لیکن جہاں تک ان کی "انسانی زندگی" کے سنوارنے کا تعلق ہے، اس میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوگا۔ جو "انسانی زندگی" میں (BELIEVE) ہی نہیں کرتا۔ اس کا اس زندگی میں حصہ کیا ہو سکتا ہے؟ سورہ ہود میں ہے۔

مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَ زَيَّنَّا لَهَا تُوبَةً إِلَيْهِمْ أَعْمَالَهُمْ فِيهَا وَ هُمْ فِيهَا لَا يُبْغِضُونَ ۚ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ إِلَّا النَّارُ نَسُوا مَا صَنَعُوا فِيهَا وَ بَاطِلٌ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝ (۱۵ - ۱۱/۱۶) ذ (۱۸ - ۱۴/۲۱)۔

جو شخص دنیاوی زندگی کی آسائش و آرائش چاہتا ہے تو اس کے لئے وہ جس قدر کوشش کرے گا اس کے مطابق اسے حصہ ملے گا۔ اس میں کسی قسم کی کمی نہیں کی جائیگی۔ لیکن ان لوگوں کا آخری زندگی میں کوئی حصہ نہیں ہوگا۔ اس میں ان کے لئے تباہی ہوگی۔ وہاں کی زندگی کے سلسلہ میں ان کے سب کام رائگاں جائیں گے اور کوئی خوشگوار نتیجہ مرتب نہیں کریں گے۔

حیات بالآخرت پر یقین، نصاب تعلیم خداوندی میں لازمی مضمون ہے۔ اس کی روشنی میں انسانی اعمال کے دوسرے پرچوں کو دیکھا جاتا ہے (۱۴/۱۶)۔ جو اس طرح زندگی کے امتحان میں ناکام رہ جائے لَا يُغْنِي عَنْهُمْ مَا كَسَبُوا شَيْئًا (۱۵/۱۰) اسے اس کے کام کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکیں گے۔

(۱)

مہلت کے وقفہ کا فائدہ

یہ ہے قانونِ مکافاتِ عمل کی رُو سے کامرانی اور ناکامی کا معیارِ عمل اور اس کے نتیجے کے محسوس طور پر سامنے آنے کے درمیان جو مہلت کا وقفہ رکھا گیا ہے اور جو زیرِ نظر باب کا بنیادی موضوع ہے اس سے مفہوم یہ ہے کہ اگر کسی وقت کسی وجہ سے انسان کا تخریبی اعمال کا پلڑا جھک گیا ہے تو قبل اس کے کہ وہ انسان پر تباہی لے آئے اسے موقع دیا جاتا ہے کہ وہ تعمیری اعمال کے پلڑے میں کچھ ڈال کر اسے جھکالے۔ لیکن اگر وہ ایسا نہیں کرتا اور اس کی تباہی سامنے آن کھڑی ہوتی ہے تو

پھر اس سے کوئی چیز نہیں بچا سکتی۔ یہ وجہ ہے جو قرآن کریم نے کہا ہے کہ جب انسان کی موت سامنے آن کھڑی ہو تو پھر اس کی توبہ اسے کوئی فائدہ نہیں دے سکتی۔ "موت کے سامنے آجانے" کے معنی یہ ہیں کہ انسان کے لئے کچھ کرنے کا وقت باقی نہیں رہا۔ اور چونکہ توبہ کے معنی ہیں ہمت کے وقفہ سے فائدہ اٹھا کر حسن عمل کے پڑے میں کچھ اضافہ کر دینا، اس لئے جب کام کرنے کے لئے وقت ہی باقی نہ رہا تو زبان سے توبہ۔ توبہ کہہ دینے سے حاصل کیا ہوگا؟ سورہ نسا میں ہے۔

وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السَّيِّئَاتِ حَتَّىٰ إِذَا حَضَرَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ إِنِّي تُبْتُ اللَّهُنَّ وَلَا الَّذِينَ يُؤْذُونَ وَهُمْ كَافِرًا
أُولَٰئِكَ أَغْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ۝ (۴/۱۸)

توبہ کا دروازہ ان کے لئے کھلا نہیں ہوتا جن کی حالت یہ ہو کہ وہ ساری عمر غلط کام کرتے رہیں اور جب ان کے سامنے موت آن کھڑی ہو تو وہ کہہ دے کہ میں اب توبہ کرتا ہوں۔ نہ ہی توبہ ان کے لئے ہے جو بحالت کفری دنیا سے چلے جائیں۔ ان کے لئے الم انگیز تباہی ہے۔

موت (یا خطرہ) کو سامنے دیکھ کر گڑگڑانے لگ جانے کے یہ معنی نہیں ہوتے کہ انسان اپنے کئے پر نادم ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس میں اس صدمہ کی برداشت کی قوت (یا ہمت) نہیں ہوتی اور وہ فرار کی راہیں تلاش کرنے لگ جاتا ہے۔ یہ انسانی کیرکٹر کی بہت بڑی کمزوری ہے۔ اس نقطہ نگاہ سے بھی، موت کو سامنے دیکھ کر توبہ کی التجا بے معنی ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب فرعون نے ڈوبتے وقت یہ کہا کہ اَمَنْتُ بِآلِهَةِ لَا إِلَهَ إِلَّا الَّذِي آمَنْتُ بِهِ يَنُورُ إِسْرَٰئِيلَ وَ أَنَا مِنَ الْمُسْلِمِينَ ۝ میں اس بات پر ایمان لاتا ہوں کہ اس خدا کے سوا جسے بنی اسرائیل خدا مانتے ہیں، کوئی اور اللہ نہیں اور میں اس کے سامنے اپنا تسلیم خم کرتا ہوں۔ توبہ بوائے اس کے کہ اسے اس ایمان پر شاباش دی جاتی اس سے کہا گیا کہ آتُش۔ وَ قَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَ كُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِينَ ۝ (۱۰/۹۱-۹۰)۔ اب موت کو سامنے دیکھ کر ایمان کا اعلان کر رہے ہو حالانکہ ساری عمر تم قوانین خداوندی کی مخالفت کرتے رہے ہو اور دھاندلی مچاتے رہے! تم بنے پھرتے تھے اتنے بڑے اور کیرکٹر تمہارا یہ ہے کہ تم موت کے ڈر سے ایمان کا اعلان کر رہے ہو۔ میزان خداوندی میں اس ایمان کی وقعت کیا ہے؟

بہر حال موت (یا نتائج اعمال) کو سامنے دیکھ کر توبہ کچھ فائدہ نہیں دیتی۔ خواہ یہ توبہ نیک نیتی سے ہو اور خواہ موت کے ڈر سے۔ جب تلافیِ مافات کا وقت ہی گزر چکا تو پھر معذرت خواہی سے حاصل کیا!

فَيَوْمَئِذٍ لَا يَنْفَعُ الَّذِينَ ظَلَمُوا مَعْذِرَتُهُمْ وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُونَ ۝ (۲۰/۵۴ ذ ۳۰/۵۲ ذ ۴۴/۳۶)

جن لوگوں نے ظلم اور زیادتی کی ہوگی اس وقت ان کی کوئی معذرت انہیں فائدہ نہیں دے گی اور نہ ہی ان کا گڑگڑا کر استجائیں کرنا کچھ سودمند ہوگا۔

وہ ہزار کہیں گے کہ رَبَّنَا..... فَاَعْتَرَفْنَا بِذُنُوبِنَا فَهَلْ إِلَىٰ خُرُوجٍ مِّنْ سَبِيلٍ ۝ (۳۶/۱۱)۔
 اے ہمارے نشوونما دینے والے! ہم اپنے جرائم کا اعتراف کرتے ہیں۔ کیا اس عذاب سے بچ نکلنے کا کوئی راستہ مل سکتا ہے؟ ان سے کہا جائے گا کہ لَا يَخْرُجُونَ مِنْهَا وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُونَ ۝ (۳۵/۳۵)۔
 نہیں! اس سے بچ نکلنے کی اب کوئی سبیل نہیں۔ اب تمہارا گڑگڑانا بے سود ہے۔

پھر دنیا میں واپسی نہیں

اس وقت وہ یہ بھی کہیں گے کہ رَبِّ ارْجِعُونِ لَعَلِّي أَعْمَلُ صَالِحًا فِيمَا تَرَكْتُ ۚ اے میرے رب! مجھے دنیا میں ایک بار واپس بھیج دے۔ پھر دیکھ کہ میں کس قدر نیک عمل کرتا ہوں اور اس طرح تلافیِ مافات کر کے دکھاتا ہوں۔ کہا جائے گا کہ کَلَّا (۲۳/۱۰۰) ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ وہ وقت ختم ہو گیا۔ اب تم دنیا میں نہیں جاسکتے۔ عمل کا موقع تمہارے ہاتھ سے نکل گیا۔ قانونِ ارتقاء کی رو سے زندگی کا دھارا پیچھے کی طرف نہیں مڑا کرتا۔ اس میں آگے بڑھنے والے آگے بڑھ جاتے ہیں اور رکھنے والے اس مقام پر رُک جاتے ہیں۔ کوئی پیچھے لوٹ کر اپنی کمی کو پورا نہیں کر سکتا۔ زندگی کی حرکت دوری (CYCLIC) نہیں۔ یہ آگے کی طرف بڑھتی اور اوپر کی طرف اٹھتی ہے۔ اس لئے رجعت (واپسی)

اور تناسخ (TRANSMIGRATION) کا تصور غلافِ حقیقت اور انسانی ذہن کا وضع کردہ

ہے۔ لہذا ان لوگوں کی ہزار تمنائوں کے باوجود دنیا میں دوبارہ آنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ وہ باصد حسرت کہیں گے کہ فَلَوْ أَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتُخَدَّعُ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ (۲۶/۱۴)

اے کاش! اگر کہیں ایک بار پلٹ جانا ہو تو پھر ہم مومن بن کر دکھائیں۔ سورہ سجدہ میں ہے کہ بحرین اُس وقت کہیں گے کہ جو کچھ ہم سے کہا جاتا تھا ہم اسے سچا نہیں سمجھا کرتے تھے۔ اسے ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا اور کانوں سے سُن لیا ہے۔ فَانْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا۔ اے ہمارے پروردگار! ہمیں ایک بار واپس بھیج دے پھر دیکھ کہ ہم کیسے اچھے کام کرتے ہیں۔ اِنَّا مُوقِنُونَ ۝ (۳۲/۱۲) اب ہمیں قانونِ مکافات پر یقین ہو گیا ہے۔ ان سے کہا جائے گا کہ اب واپسی کا سوال ہی نہیں۔ تمہارے پاس ہمارے قوانین آئے۔ تم نے انہیں جھٹلایا۔ ان کی طرف متکبرانہ نگاہ سے دیکھا اور سرکشی برت کر اپنی معصیت کو شیوے میں آگے ہی آگے بڑھتے چلے گئے۔ اب وہ وقت ہاتھ سے نکل چکا ہے جب تم اپنی بگڑی بنا سکتے تھے (۵۹ - ۱۳۹/۵۸)۔

سورہ الحديد میں ہے کہ قیامت میں مومنین چل رہے ہوں گے تو ان کی پیشانیوں کا نور ان کے راستوں کو جگمگا رہا ہوگا۔ انہیں دیکھ کر منافقین ان سے کہیں گے کہ اُنْظُرُوا نَا نَقْتَبِسْ مِنْهُ فُؤَادُكُمْ ذُرَاؤُكُمْ! ہم تمہاری روشنی سے تھوڑی سی چمک ستعار لے لیں تاکہ ہماری زندگی کی تاریک راہیں بھی روشن ہو جائیں۔ مومنین ان سے کہیں گے کہ یہ چراغ تو انسان کے اپنے حُسنِ عمل کے تیل سے روشن ہوتے ہیں۔ یہ روشنی نہ کسی کو مانگے سے مل سکتی ہے نہ ہی کوئی اسے کسی دوسرے کی طرف منتقل کر سکتا ہے۔ اسے حاصل کر لے کا مقام تو دنیاوی زندگی کا میدانِ عمل تھا۔ رَقِیْلَ اَنْرِجُوا وَاَرَاَكُمْ فَاَلَمْ تَمْسُوْا فُؤَادًا ۚ (۵۴/۱۳) اگر تم جانتے ہو تو اسی دنیا کی طرف پلٹ کر جاؤ اور وہاں اپنی زندگی کی شمعیں روشن کر کے لاؤ۔ اور چونکہ دنیا کی طرف کوئی واپس جا نہیں سکتا اس لئے تمہاری تاریک راہیں اب کیسے روشن ہو سکتی ہیں۔

اس مقام سے یونہی آگے نہ بڑھ جانیے۔ یہ بڑا اہم مقام ہے اور گہری فکر کا محتاج — زندگی اپنے ارتقائی مراحل طے کرتی ہوئی، پیکرِ بشری میں پہنچی ہے۔ اب انسان کو اس کا موقع دیا گیا ہے کہ وہ قوانینِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کر کے اپنے آپ کو اس قابل بنالے کہ یہ زندگی کے اگلے ارتقائی مراحل طے کر سکے۔ اب سوچئے کہ جو شخص اس موقع کو ضائع کر دیتا ہے وہ اپنا ایسا نقصان کرتا ہے جس کی تلافی کی کوئی صورت ہی نہیں۔ اگر زندگی کو موت کے ساتھ ختم ہو جانا ہوتا تو پھر انسان جس طرح جی چاہتا اس زندگی کو گزار لیتا۔ مرنے کے بعد معاملہ ختم ہو جاتا۔ لیکن جب زندگی نے آگے

بھی چلنا ہو۔ انسان وہاں زندہ ہو۔ صاحبِ شعور و ذی احساس ہو۔ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہو کہ اس نے اپنے لئے کس قدر ہیبت بٹا ہی خرید لی ہے۔ نہ وہ الم انگیز تباہی ختم ہو اور نہ ہی اس کا موقع ہو کہ انسان تلافیِ مافات کر سکے۔ ذرا سوچئے کہ اس قسم کی زندگی — اور وہ بھی اس قدر طولِ طویل زندگی — کس طور پر ہو گی!

اس سنے آپ نے یہ بھی دیکھ لیا ہو گا کہ مشہور آن کریم حیاتِ بالآخرت پر ایمان (یقین) کو اس قدر اہمیت کیوں دیتا ہے اور اس دنیا کی اسٹیجِ انسانی زندگی میں کس قدر اہم مقام رکھتی ہے جس نے اسے ضائع کر دیا وہ ہمیشہ کے لئے تباہ ہو گیا۔



ساتواں باب

یَوْمِ الدِّینِ

سابقہ باب میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ مہلت کے دوران 'ہنوز اس کا موقع ہوتا ہے کہ انسان اپنے حسن عمل سے 'تخریبی اعمال کے نتائج سے محفوظ رہ جائے۔ لیکن جب یہ وقفہ ختم ہو جائے تو پھر میزانِ خداوندی کے پڑوں کے مطابق نتیجہ مرتب ہو کر سامنے آجاتا ہے۔ (جیسا کہ پہلے اختصاراً لکھا جا چکا ہے اور آگے چل کر اسے تفصیلاً بیان کیا جائے گا۔ یہ نتیجہ اس دنیا میں بھی سامنے آسکتا ہے اور آخروی زندگی میں بھی بالیقین سامنے آئے گا۔ اس ظہورِ نتائج کے وقت کو 'شہدِ انِ کریم' نے "یَوْمِ الدِّینِ" کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔ "الدِّین" ایک بڑا جامع لفظ ہے جس میں ضابطہ قوانین، ان قوانین کی اطاعت اور ان کے مطابق اعمال کے نتائج (سب کا) مفہوم شامل ہے۔ 'شہدِ انِ کریم' کے آغاز (سورۃ فاتحہ) میں خدا نے اپنے آپ کو مَالِکِ یَوْمِ الدِّینِ (۱/۳) کہا ہے۔ یعنی وہ جس کے قانونِ مکافات کے مطابق ظہورِ نتائج ہوتا ہے۔ اس قانون پر خلاصہً اس کا اقتدار و اختیار (کنٹرول) ہے اور نہ کوئی اور قوت اس میں دخیل ہو سکتی ہے اور نہ ہی کوئی اس کی گرفت سے باہر جاسکتا ہے۔ چنانچہ سورۃ الفطار میں یَوْمِ الدِّینِ کی توضیح ان الفاظ سے کی گئی ہے کہ

یَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا وَالْأَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِلَّهِ ۝ (۸۲/۱۹)

جس دن کوئی شخص کسی دوسرے کے لئے کوئی اختیار و اقتدار نہیں رکھے گا اور تمام معاملات کے فیصلے خدا کے قانون کے مطابق ہوں گے۔

یہ درحقیقت خدا کی حاکمیت کا فطری نتیجہ ہے۔ حاکمیت خداوندی کے معنی یہ ہیں کہ کائنات میں ہر بات خدا کے قوانین کے مطابق طے پاتی ہے اور ہر معاملہ کا فیصلہ اس کے قانونِ مکافات کے مطابق ہوتا ہے۔ اس لئے سورۃ النین میں کہا کہ فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّينِ ۝ (۹۵/۴) اے رسول! ان تصریحات کے بعد تمہارا اس دعوے کو کہ ہر عمل کا نتیجہ خدا کے قانونِ مکافات کے مطابق مرتب ہوتا ہے (کون جھٹلا سکتا ہے۔ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِأَحْكَمِ الْمُحْكِمِينَ ۝ (۹۵/۸) کیا یہ واقعہ نہیں کہ کائنات میں آخری اقتدار و اختیار صرف خدا کا ہے۔ جب کائنات میں قوانین اسی کے کارفرما ہیں تو پھر اس دعوے کے سچے ہونے میں کلام کسے ہو سکتا ہے کہ ”یوم الدین“ کا مالک وہی ہے۔ اعمال کے نتائج اسی کے قانون کے مطابق برآمد ہوتے ہیں۔ اسی لئے رسول اللہ سے کہا گیا کہ ان لوگوں سے (جو قانونِ مکافات کو جھٹلاتے ہیں) کہہ دو اور برطا کہہ دو پوسے حتم و یقین کے ساتھ کہہ دو کہ اِنَّمَا تُوْعَدُونَ لَصَادِقٌ ۝ جو وعدہ تم سے کیا جا رہا ہے وہ بالکل سچا ہے۔ وَ اِنَّ الدِّينَ لَوَاقِعٌ ۝ (۵۱-۵۱/۴) ظہورِ نتائج کا وقت اگر ہے گا۔ فَ رُبَّ السَّفَّاءِ وَ الْوَرِضِ اِنَّهُ لَخَيِّئٌ مِّثْلُ مَا اَتٰكُمْ تَنْطِقُونَ ۝ (۵۱/۲۳) کائنات کو سنبھالنے والا خدا خود اس حقیقت پر شاہد ہے کہ اس کا واقع ہونا اسی طرح یقینی ہے جس طرح جب تم آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ باتیں کرتے ہو تو تمہیں یقین ہوتا ہے کہ یہ باتیں سچ مچ ہو رہی ہیں۔ یہ تمہارا دہم و گمان یا خواب و خیال نہیں۔ قانونِ مکافات کے مطابق ظہورِ نتائج اسی طرح ایک حقیقتِ ثابتہ ہے۔ اس پر معترضین پوچھتے تھے ۱) اور اس قسم کے اعتراضات اور سوالات کی تفصیل پہلے آچکی ہے کہ اَيَّانَ يَوْمُ الدِّينِ ۝ یہ یوم الدین (ظہورِ نتائج کا) وقت کب آئے گا؟ کہا کہ اس کا وقت تو بتایا نہیں جاسکتا۔ لیکن ان کے لئے اتنا سمجھ لینا ہی کافی ہو گا کہ يَوْمَ هُمْ عَلَى النَّارِ يُفْتَنُونَ ۝ (۵۱/۱۳-۱۲) یہ وہ وقت ہو گا جب ان کی کشتِ امل جل کر رکھ کا ڈھیر ہو جائے گی۔

سورۃ الفطار میں اس حقیقت کو بڑے لطیف لیکن بصیرت افروز انداز میں سامنے لایا گیا ہے۔ کہا کہ يَصْلَوْنَهَا يَوْمَ الدِّينِ ۝ (۸۲/۱۵) يَوْمَ الدِّينِ وہ ہو گا جب یہ لوگ جہنم میں داخل کئے جائیں گے۔ اس سے ذہن میں یہ خیال آ سکتا تھا کہ عمل اور اس کے نتیجہ میں اس وقت کوئی باہمی رابطہ نہیں۔ مرنے کے بعد لوگوں کو یک لخت جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ کہا یہ غلط ہے۔ وَ مَا هُمْ عَنْهَا بِغَائِبِينَ ۝ (۸۲/۱۶) یہ تو اس وقت بھی جہنم کی نظروں کے سامنے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ

اس وقت یہ اُس جہنم کو محسوس نہیں کرے۔ اُس وقت یہ اُسے بالمشافہ اپنے سامنے دیکھ لیں گے ورنہ جہنم تو انسان کو ہر وقت دیکھ رہا ہوتا ہے۔ (تفصیل اس اجمال کی آگے چل کر آئے گی)۔ اسی حتم یقین کی رُو سے اسے یَوْمُ الْحَقِّ (۷۸/۳۹) کہا گیا ہے۔ کہیں اسے یَوْمَ يَقُومُ الْحِسَابُ (۳۳/۱۱) کہہ کر پکارا گیا ہے۔ یعنی جس دن حساب کے لئے میزان کھڑی کر دی جائے گی۔ سورہ صٰحٰہ میں نعمائے جنت کے تذکرہ کے بعد کہا ہے هٰذَا مَا تُوْعَدُوْنَ لِیَوْمِ الْحِسَابِ (۳۸/۵۳) یہ وہ ہے جس کا تم سے "حساب کے دن" کے لئے وعدہ کیا جا رہا ہے۔ دوسری طرف عذابِ جہنم کی تفصیل بیان کرنے کے بعد کہا هٰذَا نُزِّلُہُمْ یَوْمَ الدِّینِ (۵۶/۵۶) ظہور نتائج کے دن اس سے ان کی خاطر تواضع ہوگی۔

سُورَةُ الصَّفٰتِ میں ہے کہ یہ لوگ جو حیاتِ اُخروی سے انکار کرتے ہیں جب "عذابِ خداوندی" میں حاضر کئے جائیں گے تو کہیں گے یُوْنٰیئٰنَا هٰذَا یَوْمَ الدِّینِ ۵ اُوہ ہماری تباہی! یہ ہے یَوْمَ الدِّینِ! ان سے کہا جائے گا کہ ہاں! هٰذَا یَوْمَ الْفَصْلِ الَّذِیْ کُنْتُمْ بِہِ مُتَّکِلِیْنَ ۵ (۲۱-۳۷/۲) یہی ہے وہ فیصلہ کا دن جس کی تم تکذیب کیا کرتے تھے۔ یہ (یوم الفصل) وہ دن ہے۔ یَوْمَ لَا یُغْنِیْ مَوْلَا عَنْ مَّوْلٰی شَیْئًا وَّ لَا هُمْ یُنصَرُفُوْنَ ۵ (۳۰-۴۳/۳۱) جب کوئی دوست کسی دوست کے کام نہیں آ سکے گا اور مجرمین کی کوئی مدد نہیں کر سکے گا۔

سورہ مرسلٰت میں ہے۔ لِذٰی یَوْمٍ اُجِّلَتْ (۷۷/۱۲) ان کی تباہی کون سے دن پر اٹھا رکھی گئی ہے؟ لِیَوْمِ الْفَصْلِ۔ فیصلہ کے دن پر۔ وَاٰذْرٰکَ مَا یَوْمَ الْفَصْلِ تمہیں کچھ خبر بھی ہے کہ یَوْمَ الْفَصْلِ کسے کہتے ہیں؟ آؤ! تمہیں ہم بتائیں۔ قَوْلٌ یَوْمَئِذٍ لِّلْمُکَذِّبِیْنَ (۷۷/۱۵-۱۴) جس دن ان لوگوں کے لئے تباہی ہوگی جو خدا کے قانونِ مکافات کی تکذیب کیا کرتے تھے۔ (نیز ۷۷/۳۸)۔ سورہ نبا میں ہے۔ (اِنَّ یَوْمَ الْفَصْلِ کَانَ مِیقَاتًا) (۷۸/۱۷) یوم الفصل اپنے وقت پر آ کر رہے گا۔ کہیں یوم الدین کو یوم البعث بھی کہا گیا ہے (۷۸-۷۹/۳۸) ۲۵-۳۶/۱۵)۔

سابقہ باب میں یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ قانونِ مکافات کی رُو سے "کامیابی اور ناکامی کا معیار" "ثقل و خفت موازنہ" ہے۔ طالب علم سال بھر پڑھتے رہتے

(کام کرتے رہتے) ہیں۔ اس کے بعد امتحان ہوتا ہے اور نتیجہ نکلنے کے دن فیل ہو جانے والوں کو معلوم ہو جاتا ہے کہ ان میں کتنی کمی رہ گئی تھی جس کی وجہ سے وہ پاس نہیں ہو سکے۔ اس نہج سے اس فیصلہ کے دن کو **شَرَّ اَنْ كَرِيْم** نے یوم التغابن کہہ کر پکارا ہے (۹۴/۹)۔ تغابن کے معنی ہوتے ہیں 'ایک دوسرے کے مقابلہ سے اپنی کمی کا سامنے آ جانا۔ ان "فیل ہو جانے والوں" سے کہا جائے گا کہ

يَمْعَشَرُ الْجَنَّةَ وَالْاِنْسِ اَلَمْ يَأْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقْضُونَ عَلَيْكُمْ
اٰمَاتِي وَ يُنْذِرُوكُمْ لِقَاءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ۖ قَالُوا شَهِدْنَا عَلَى
اَنْفُسِنَا وَ غَرَّتْهُمْ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَ شَهِدُوْا عَلٰى اَنْفُسِهِمْ
اَنَّهُمْ كَاٰثِرٌ كٰفِرِيْنَ ۝ (۹۴/۱۱)

اے شہروں اور صحراؤں کے رہنے والو! کیا تمہارے پاس تمہارے اپنے بھائی بندوں
میں سے تمہارے پیغام رساں نہیں آئے تھے جو تمہارے سامنے ہمارے قوانین پیش
کرتے تھے اور تمہیں اس دن کے آنے کے متعلق متنبہ کیا کرتے تھے؟
وہ کہیں گے کہ ہاں! یہ واقعہ ہے۔ اس لئے آج ہم خود اپنے خلاف آپ گواہی
دیتے ہیں کہ ہمیں دنیاوی مفاد پرستی نے دھوکے میں رکھا اور ہم غلط راہوں پر
چلتے رہے۔ ہم اس کا اقرار کرتے ہیں کہ ہم نے ان قوانین سے انکار کیا اور ان سے
سرکشی اختیار کی تھی۔

"یوم الدین" کی اس طرح تکذیب کرنے والوں کا تذکرہ **شَرَّ اَنْ كَرِيْم** کے متعدد مقامات
میں آیا ہے۔ سورہ مدثر میں ہے کہ جب مجسم جہنم میں داخل ہو رہے ہوں گے تو ان سے پوچھنے
والے پوچھیں گے کہ

مَا سَلَكَكُمْ فِيْ مَقَرٍّ ۚ

تمہیں کونسی بات جہنم کی طرف کھینچ لائی؟ وہ کون سے ایسے
جرائم تھے جن کی وجہ سے تم یہاں آ پہنچے؟

قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمَصْلِيْنَ ۚ
وہ کہیں گے کہ تفصیل تو اس اجمال کی طول طویل ہے لیکن
مختصر الفاظ میں یوں سمجھو کہ ہم "مصلین" میں سے نہیں تھے۔

وَلَمْ تَكُنْ تُطْعِمُ الْمِسْكِينَ ۝

ہم ان لوگوں کی روٹی کا انتظام نہیں کیا کرتے تھے جو اپنی روٹی آپ کمانے کے قابل نہیں تھے۔

وَكُنَّا نَخُوضُ مَعَ النُّجَاةِ بِضِيْنٍ ۝

ہم کرتے کرتے کچھ نہیں تھے لیکن اپنے جیسوں کے ساتھ مل کر باتیں بڑی بنایا کرتے تھے۔

وَكُنَّا نَكْذِبُ رِيَوْمِ الدِّينِ ۝

اس طرح ہم خدا کے قانونِ مکافات اور ظہورِ نتائج کی حقیقت کو جھٹلاتے رہے۔

حَتَّىٰ آتَيْنَا الْيَقِيْنَ ۝ (۴۲/۴۴-۴۳)

تاکہ یہ حقیقت محسوس شکل میں ہمارے سامنے آگئی۔
سورۃ انفطار میں ہے کہ تم قحطِ الدین کی تکذیب کرتے ہو حالانکہ تمہارا ایک ایک عمل محفوظ کیا جا رہا ہے (۸۲/۱۰-۹)۔ ظہورِ نتائج کے وقت تمہارے لئے تباہی ہوگی (۸۳/۱۱-۱۰)۔

سورۃ المذثر کی طرح سورۃ الماعون میں بھی تکذیبِ دین کرنے والوں کا تفصیلی تعارف کرایا گیا ہے۔
سورۃ کی ابتدا ان الفاظ سے ہوتی ہے۔ اَرْءَيْتَ الَّذِي يَكْذِبُ بِالْذِّينِ ۝ ”کیا تو نے اس شخص کی حالت پر بھی غور کیا جو الدین کی تکذیب کرتا ہے؟ تمہیں معلوم ہے یہ کون ہے؟

فَذَلِكَ الَّذِي يَدْعُ الْيَتِيْمَ ۝

یہ وہ ہے کہ جو لوگ معاشرہ میں تنہا رہ جاتے تھے یہ نہیں دھکے دے کر نکال دیا کرتا تھا۔

وَلَا يَحْضُرُ عَلَى طَعَامِ الْمِسْكِيْنَ ۝

اور محتاجوں کی روٹی کا نہ خود انتظام کرتا تھا اور نہ ہی دوسروں کو اس کی ترغیب دیتا تھا۔

قَوْلٍ لِلْمُصَلِّيْنَ ۝

یہ ان مصلّین (نمازیوں) میں سے تھا جن کی نمازیں ان کی تباہی کا موجب بن جاتی ہیں۔

الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ۝

یعنی وہ لوگ جو صلوٰۃ کی حقیقت سے بے خبر رہتے ہیں۔
وہ نماز کی ظاہری شکل و صورت کی بڑی شدت سے پابندی کرتے ہیں تاکہ لوگ سمجھیں کہ یہ بڑے نیک لوگ ہیں۔

الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ ۝

اور کروت ان کی یہ ہوتی ہے کہ رزق کے جن چشموں کو بہتے پانی کی طرح رہنا چاہیے تاکہ ان میں سے ہر ایک اپنی ضرورت کے

وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ ۝

مطابق لے لے یہ ان پر بند لگا کر بیٹھ جاتے ہیں کہ سارے کا سارا انہی کی ملکیت میں آجائے۔

یہ ہیں وہ لوگ جو نمازیں پڑھنے کے باوجود تکذیب دین کرتے ہیں۔

(۱۰)

نتائج اعمال

یہ ہے مختصر اودہ طریق عمل جس کے مطابق انسانی اعمال کے نتائج سامنے آتے ہیں۔ عمل کا نرد ہونا۔ مہلت کا وقفہ۔ مہلت کے وقفہ میں بازیابی کا موقعہ۔ پٹروں کا جھکنا اور اکھٹنا۔ اور بالآخر نتیجہ کا سامنے آ جانا۔ شانِ کریم میں ہر مقام پر ان تمام مراحل کا ذکر نہیں کیا گیا، نہ ہی ہر مقام پر اس کے دہرانے کی ضرورت تھی۔ اس میں عام طور پر عمل اور اس کے نتیجے ہی کا ذکر کیا گیا ہے۔ مثلاً سورہ بقرہ میں ہے۔

بَلَىٰ قَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَىٰ النَّاسِ إِذْ أَنشَأَ مِنْهُمْ نَبِيًّا وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهُ أَجْرُهُ عِنْدَ رَبِّهِ ۖ وَلَا تَخُوفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝ (۲/۱۱۳)

نہیں بات یوں نہیں جس طرح یہ لوگ اپنے ذہن میں سمجھ بیٹھے ہیں۔ بات یہ ہے کہ جس نے بھی اپنے آپ کو قوانینِ خداوندی کے سامنے جھکا دیا اور حسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کی تو اس کا اجر اس کے نشوونما دینے والے کے ہاں ہے۔ اور اس اجر کا ماحصل یہ

ہے کہ ایسے لوگوں کو نہ کوئی خوف و خطر ہو گا نہ حزن و ملال۔

سورہ الزمر میں ہے۔ لَّهُمْ مَا يَشَاءُونَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ ذَٰلِكَ جَزَاءُ الْمُحْسِنِينَ ۝ (۳۹/۲۴) وہ جو چاہیں گے انہیں خدا کے ہاں سے ملے گا۔ یہ ان لوگوں کے اپنے حُسنِ عمل کا بدلہ ہے۔ انسانی کامیابی کا یہ منتہی ہے کہ وہ جو کچھ چاہے اسے مل جائے۔ لیکن شانِ کریم اس سے بھی آگے جاتا ہے اور کہتا ہے کہ لَّهُمْ مَا يَشَاءُونَ فِيهَا ۚ لَدَيْنَا مَزِيدٌ ۝ (۵۰/۳۵) اس میں انہیں وہ سب کچھ ملے گا جو وہ چاہیں گے۔ بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ۔ یہ ایک عظیم حقیقت ہے جسے ان چند لفظوں میں یوں بیان کیا گیا ہے۔ انسان کی آرزوؤں اور خواہشوں کے پیمانے اس کی زندگی کی موجودہ

سطح کے مطابق ہوتے ہیں۔ یہاں اسے اپنی پہچانوں کے مطابق ملے گا اور یہی اس کی کامیابیوں کا منتہی ہے۔ لیکن اس کے بعد جب اس کی زندگی اس سے بلند مقام پر پہنچ جائے گی تو اس زندگی کے تقاضے کیا ہوں گے اس کے متعلق یہ اپنے شعور کی موجودہ سطح پر احساس و قیاس تک نہیں کر سکتا۔ ایک بچہ اس کا تصور تک نہیں کر سکتا کہ جوانی کے زمانے میں پہنچ کر اس کی زندگی کے تقاضے کیا ہوں گے؟ اس لئے کہا کہ ان لوگوں کے حسنِ عمل کے نتیجہ میں انہیں وہ سب کچھ ملے گا جس کی یہ لوگ اپنی زندگی کے موجودہ تقاضوں کے مطابق آرزو کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ ان کا منتہی نہیں ہے۔ اس کے بعد جب ان کی زندگی کے تقاضے اور بڑھ جائیں گے تو انہیں ان تقاضوں کی تسکین کا سامان بھی ملے گا۔

وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِينَ الَّذِينَ يَعْمَلُونَ الصَّالِحَاتِ أَنَّ لَهُمْ أَجْرًا
حَسَنًا ۝ (۱۸/۲۱)

یہ لوگ جو خدا کے قوانین کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں اور صلاحیت بخش کام کرتے ہیں۔ ان کے لئے ان کے اعمال کے نہایت حسین اجر کی بشارت ہے۔

سورۃ ہود میں انسانی زندگی کا مقصود یہ بتایا گیا ہے کہ لِيَبْلُوكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا (۱۱/۴)۔ یہ انسان کے لئے حسنِ عمل کے مواقع بہم پہنچاتی ہے۔

یہ حسنِ عمل کا اجر تھا۔ دوسری طرف غلط اعمال کے متعلق اصولاً بتایا کہ

بَلَىٰ مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَ أَحَاطَتْ بِهِ خَاطِلُهُ فَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ
النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۝ (۲/۸۱)

نہیں بات یوں بھی نہیں جس طرح یہ لوگ اپنے ذہن میں سمجھے بیٹھے ہیں۔ بات یہ ہے کہ کہ جو شخص بھی ناہمواریاں پیدا کرنے والے کام کرے اور پھر اس کی کیفیت یہ ہو جائے کہ اس کی بغزشیں اسے چاروں طرف سے گھیر لیں، تو ایسے لوگوں کا ٹھکانہ جہنم ہوگا۔

سورۃ حم میں ہے۔ وَ لَنَجْزِيَنَّهُمْ أَشْرَٰءَ الَّذِي كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝ (۴۱/۲۴) ان کے غلط اعمال کا بدلہ انہیں یقیناً مل کر رہے گا۔ دوسرے مقام پر ہے۔ ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ
آسَاءُوا الشَّرَّ أَلَىٰ (۲۰/۱۰) غلط کاری کا انجام تباہی ہے۔ ایسی تباہی جسے دیکھ کر انہیں افسوس

اور صدمہ ہوگا کہ ہم نے ایسے کام کیوں کئے تھے۔ کَذٰلِكَ يُرِيهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرَاتٍ عَلَيْهِمْ ؕ (۲/۱۶۷) — وَ لَا يُرَدُّ بَأْسُهُ عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ ۝ (۶/۱۳۸) دنیا میں کوئی قوت ایسی نہیں جو اس تباہی کو ان سے ٹلا دے۔ سورۃ اعراف میں اس تباہی کے مختلف پہلوؤں کو سامنے لا کر کہا گیا کہ کَذٰلِكَ نُجْزِي الظّٰلِمِيْنَ (۴/۴۱؛ ۴/۴۰) ہم اس طرح مجرمین اور ظالمین کو اُن کی زیادتیوں کا بدلہ دیا کرتے ہیں۔ اور آگے چل کر کہا گیا کہ وَ اَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ؕ (۴/۸۶؛ ۴/۸۴؛ ۴/۱۰۳) تم دیکھو گے کہ ان مفسدین کا انجام کیا ہوا؟ آئندہ ابواب میں اس اجمال کی تفصیل آپ کے سامنے آئے گی۔



آٹھواں باب

عذاب۔ یعنی ہلاکت اور تباہی

جیسا کہ پہلے باب میں بتایا جا چکا ہے، شرّانِ کریم کی رو سے، انسانی اعمال کے نتائج اس دنیا میں بھی سامنے آجاتے ہیں اور آخری زندگی میں وہ بالیقین سامنے آئیں گے۔ جہاں تک دنیاوی زندگی کا تعلق ہے، انسان مدنی الطبع (SOCIAL-ANIMAL) واقع ہوا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ اجتماعی زندگی ہی میں اپنے آپ کو محفوظ خیال کر سکتا ہے۔ اجتماعی زندگی کو معاشرہ کہتے ہیں۔ معاشرہ یوں تو افراد ہی کے مجموعہ کا نام ہوتا ہے۔ لیکن یہ مجموعہ ریاضی کے قاعدے کی حاصل جمع کا نام نہیں ہوتا۔ ہمارے ہاں ایک محاورہ ہے کہ ”ایک اکیلا اور دو گیارہ“۔ یہ اس نکتہ کی تفسیر ہے کہ معاشرہ افراد کے ریاضی مجموعہ کا نام نہیں ہوتا۔ اس سے کچھ زیادہ ہوتا ہے۔ معاشرہ کا ایک نظام ہوتا ہے اور افراد کو اس نظام کے تابع زندگی بسر کرنی ہوتی ہے۔ اگر معاشرہ ان قوانین خداوندی کے مطابق متشکل ہوا ہے جو اس نے انسانی زندگی کی نشو و ارتقاء کے لئے متعین کئے ہیں، (آئندہ ہم انہیں ”مستقل اقدار“ کی اصطلاح سے تعبیر کریں گے)، تو افراد کی زندگی بہ ہیئتِ مجموعی ان اقدار کے مطابق بسر ہوگی۔ اس معاشرہ کو اس دنیا میں خوشگوار یا نصیب ہوں گی اور ان افراد کی آخری زندگی بھی کامرانیوں کی ہوگی۔ ہو سکتا ہے کہ اس معاشرہ میں ایسے افراد بھی ہوں جو بعض اقدار کی خلاف ورزی کریں۔ سو معاشرہ انہیں ان کے ایسے اعمال پر سزا دے گا کیونکہ ان کے اس قسم کے اعمال خود معاشرہ کے قوانین کی خلاف ورزی ہوگی۔ باقی رہی ان افراد کی آخری زندگی، سو اس کا تعین ان کے اعمال کے بلٹروں کی نوعیت کے مطابق ہوگا۔

اس قسم کے معاشرہ کی دنیاوی زندگی کو بھی جنتی زندگی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ بالفاظ دیگر اس معاشرہ کے افراد کی یہاں کی زندگی بھی جنت کی زندگی ہوگی اور اخروی زندگی بھی جنت کی زندگی۔ ایسا ہو سکتا ہے کہ بعض خارجی حوادث کی وجہ سے اس قسم کے معاشرہ پر کچھ دن مصائب و تکالیف کے آجائیں لیکن اسے تباہی اور جہنم سے تعبیر نہیں کیا جائے گا۔ قرآن کریم نے اسے حوادث کی گردش و دو لابی سے تعبیر کیا ہے (۳۱/۱۳۹)۔

اس کے برعکس دوسرا معاشرہ ہے جو مستقل اقدار خداوندی کے مطابق متشکل نہیں ہوتا۔ اس قسم کے معاشرہ کو دو شقوق میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ یعنی

(۱) ایسا معاشرہ جو فطرت کی قوتوں کو مستحضر نہیں کرتا۔ اس معاشرہ کے حصہ میں یہاں بھی ذلت و رسوائی کے جہنم کی زندگی ہوگی اور اُس کے افراد کی اخروی زندگی بھی جہنم کی ہوگی۔

(۲) ایسا معاشرہ جو فطرت کی قوتوں کو مستحضر کر کے ان سے مستمتع ہوتا ہے۔ ایسے معاشرہ کو کچھ عرصہ کے لئے دنیاوی سامان آسائش میسر آجاتا ہے لیکن چونکہ یہ مستقل اقدار کے مطابق زندگی بسر نہیں کرتا۔ اس لئے اس کا انجام اس دنیا میں تباہی اور بربادی ہوتا ہے۔ اس تباہی کی شکلیں مختلف ہو سکتی ہیں لیکن قرآن کریم اسے بہرہ نیست مجموعی جہنم سے تعبیر کرتا ہے۔ جہاں تک اس معاشرہ کے افراد کی اخروی زندگی کا تعلق ہے وہ تو جہنم کی زندگی ہوگی ہی۔

ان ہر دو اقسام کے معاشرہ میں ایسے افراد بھی ہو سکتے ہیں جو معاشرہ کی غیر خداوندی اقدار کی روشنی کے خلاف ہوں اور چاہتے ہوں (یا کوشاں ہوں) کہ معاشرہ صحیح اقدار کے مطابق متشکل ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ جب اس معاشرہ پر اس دنیا میں تباہی آئے گی تو اس قسم کے افراد بھی اس سیلاب کی پیٹ میں آجائیں گے۔ انہی افراد کے سلسلہ میں کہا ہے کہ

وَ اتَّقُوا فِتْنَةً لَا تُصِيبُنَّ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْكُمْ خَاصَّةً (۱۵۶)

اس تباہی سے بچاؤ کی تدبیر سوچ لو کہ جب وہ آیا کرتی ہے تو صرف انہی لوگوں تک محدود نہیں رہا کرتی جنہوں نے ظالمانہ روش اختیار کر رکھی تھی۔ وہ سارے معاشرہ کو محیط ہو جایا کرتی ہے۔ لہذا اس قسم کے افراد کو معاشرہ کی اجتماعی مصیبت میں تو برابر کا حصہ دار ہونا پڑتا ہے لیکن ان کی مستقبل کی زندگی ان کے حسن عمل کا پلڑا بچکنے کی وجہ سے جنت کی زندگی ہوگی۔

وَشَرَّ اَنْ كَرِيْمٌ نے اس تباہی اور بربادی کے لئے (خواہ وہ اس دنیا میں ہو یا آخری زندگی میں) عام طور پر "عذاب" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ عذاب الیم (الم انجیز تباہی)۔ عذاب مہین (ذلت آمیز تباہی)۔ عذاب الحریق (متاعِ حیات کو جلا کر راکھ کر دینے والی تباہی)۔ یہی مفہوم عذاب النار یا عذاب السعیر سے ہے۔ عذاب عظیم (بہت بڑی تباہی) عذاب شدید (بڑی شدت کی تباہی)۔

پھر شَرَّ اَنْ كَرِيْمٌ نے کہیں اسے متمیز طور پر دنیاوی زندگی میں تباہی کہا ہے اور کہیں اسی طرح متمیز طور پر آخری زندگی کی تباہی۔ کہیں اسے دنیا اور آخرت دونوں کی تباہی کہہ کر پکارا ہے اور کہیں بلا تمیز و تفریق محض تباہی کہا ہے۔ ہم پہلے ان آیات کو سامنے لاتے ہیں جن میں اس عذاب (تباہی) کا ذکر بلا تخصیص آیا ہے۔

دنیا اور آخرت کی تخصیص کے بغیر عذاب کا ذکر

(۱) محض عذاب۔ بعض آیات میں اسے "خالی عذاب" سے تعبیر کیا گیا ہے مثلاً سورۃ

الانعام میں ہے۔

وَالَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا يَشَهُمْ الْعَذَابُ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ ۝ (۶/۴۹)
جو لوگ ہمارے قوانین کی تکذیب کرتے ہیں اور بے راہ روی کی زندگی اختیار کر لیتے ہیں

ان پر تباہی اگر رہے گی۔ (نیز ۵/۸۰؛ ۷/۱۵۴؛ ۱۹/۷۹؛ ۳۰/۱۶؛ ۳۴/۸)۔

دوسرے مقام پر اسے سوء العذاب کہا گیا ہے (۶/۱۵۸) یعنی بدترین عذاب۔ اور سورۃ باندہ میں ہے کہ متبعین حضرت عیسیٰ سے کہہ دیا گیا تھا کہ اگر انہوں نے خدا کے نظامِ ربوبیت کی خلاف ورزی کی تو ان پر ایسا عذاب آئے گا جو اقوامِ عالم میں سے کسی پر نہیں آیا تھا۔ سورۃ مریم میں اسے عذاب من الرحمن کہا گیا ہے (۱۹/۴۵)۔ دیگر مقامات پر اسے خدا کا عذاب (عَذَابُهُ) یا عَذَابُ رَبِّكَ (۱۷/۵۷) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ (نیز ۲۷-۶۰/۲۸)۔ سورۃ فرقان میں اسے عذاب کہیں کہا گیا ہے (۲۵/۱۹) اور سورۃ غاشیہ میں عذاب اکبر (۸۸/۲۳)۔ اس تباہی کی شدت کے اظہار کے لئے اسے عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ (۱۷/۸۸) بھی کہا گیا ہے۔ یعنی تباہی بالائے تباہی۔

انسان کی متاعِ حیات کو جلا کر رکھ کر دے۔ اسی کو دوسرے مقامات پر عَذَابُ السَّعِیر بھی کہا گیا ہے (۲۲/۴۱ ذ ۵/۶۷)۔

اور عَذَابُ النَّار کی اصطلاح تو اس کثرتِ آتی ہے کہ اس کا احاطہ بڑی تفصیل چاہتا ہے مثلاً (۲/۱۲۶ میں)۔ مطلب اس سے بھی وہی ہے جو عذابِ الحریق یا عذابِ السعیر سے ہے۔

(۶) عَذَابُ الْيَمِّ

اس قسم کی دوسری کثیر الاستعمال اصطلاح — عَذَابُ الْيَمِّ کی ہے۔ یعنی الم انگیز اور دردناک تباہی سورہ بقرہ کے شروع ہی میں منافقین کے متعلق ہے۔ **يَفِي قُلُوبِهِمْ مَّرَضٌ ۖ فَزَادَهُمُ اللَّهُ مَرَضًا ۚ ذَٰلَهُمُ عَذَابُ الْيَمِّ ۖ بِمَا كَانُوا يَكْذِبُونَ** (۲/۱۰۵) ان کے دلوں میں منافقت کا مرض ہے اور نفاق کا غامضہ ہوتا ہے کہ جوں جوں انسان اس میں آگے بڑھتا جاتا ہے اس مرض کی شدت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ ان لوگوں کی زندگی بڑی ہی الم انگیز تباہی میں گزرتی ہے۔

سورہ سبأ میں ہے۔ **وَالَّذِينَ سَعَوْا فِي آيَاتِنَا مُنْجِبِينَ ۚ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مِّن رَّجْزٍ ۖ أَلَيْسَ ۚ** (۳۴/۵۱) جو لوگ اس مقصد کے لئے بھاگ دوڑ کرتے رہتے ہیں کہ قوانینِ خداوندی کو شکستِ بدل جائے۔ ان کا انجام اس قسم کی الم انگیز تباہی ہوتا ہے جو خود ان کی قوت کو مضلل کر دے۔ اسی قسم کی تباہی ان کے لئے ہوگی جو ان قوانین سے سرکشی اختیار کرتے ہیں (۴۵/۱۱)۔



فَسَّانِ کریم میں تباہی کی ان مختلف نوعیتوں کے ساتھ یہ بھی کہا گیا ہے کہ **إِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ**

لہ "عذابِ الیم" کی اصطلاح کے لئے حسبِ ذیل آیات دیکھئے۔ (۲/۱۶۶ ذ ۹/۶۱ ذ ۳۲/۲۱ ذ ۳۱/۸۷ ذ ۱۴/۶۳ ذ ۱۴/۱۰۴ ذ ۱۴/۱۱۶ ذ ۵۸/۴ ذ ۲/۱۰۳ ذ ۲/۱۶۸ ذ ۵/۶۳ ذ ۳/۲۰ ذ ۳/۳۲ ذ ۹/۲۳ ذ ۸۲/۲۳ ذ ۳۱/۷ ذ ۴۵/۸ ذ ۲۲/۲۵ ذ ۴۶/۲۸ ذ ۶۱/۱۰ ذ ۴۶/۳۱ ذ ۲۳/۶۵ ذ ۱۵/۵۰ ذ ۲۶/۳۸ ذ ۸/۱۳۸ ذ ۴/۱۶۳ ذ ۱۶/۱۰ ذ ۳۳/۸ ذ ۶۶/۳۱ ذ ۱۲ — ۶۳/۱۳)۔ ان آیات سے یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ اس قسم کی تباہی کن لوگوں کے حصّے میں آتی ہے۔

کَوَاقِعٌ (۵۲/۴)۔ یاد رکھو! یہ حقیقت ہے کہ تیرے رب کی طرف سے یہ تباہی واقع ہو کر رہتی ہے۔ یہ یونہی (خالی) دھمکی نہیں۔ سورۃ المعارج میں اسے عَذَابٌ ذَاقِمٌ (۴۰/۱۱) سے تعبیر کر کے کہا ہے کہ لَئِنْ لَفَ ذَاقِمٌ (۴۰/۲۱) دنیا کی کوئی قوت اسے روک نہیں سکتی۔ سورۃ الشوریٰ میں ہے وَ تَرَى الظَّالِمِينَ لَمَّا رَأَوْا الْعَذَابَ يَقُولُونَ هَلْ اِلٰى مَرَجٍ مِّنْ سَبِيلٍ (۲۲/۴۳) تو کہیں اس منظر کو دیکھتا جب یہ ظالمین اس تباہی کو سیلابِ بلا کی طرح اپنی طرف آتے دیکھ کر بے ساختہ چلا اٹھتے کہ کیا اس کے لوٹ جانے کی کوئی سبیل ہو سکتی ہے؟

لیکن چونکہ تباہی آتی ہی اس وقت ہے جب مہلت کا وقفہ ختم ہو جاتا ہے اس لئے اس کے واپس جانے یا اس سے بچ نکلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

یہ اس تباہی کا ذکر تھا جسے قرآن کریم نے دنیا اور آخرت کی تخصیص کے بغیر بیان کیا ہے۔ اگلے باب میں اعمال کے ان نتائج کا ذکر آئے گا جو اس دنیا میں سامنے آجاتے ہیں۔



نواں باب

دنیاوی زندگی میں اعمال کی جزا اور سزا

جو کچھ سابقہ باب میں اصولاً لکھا گیا ہے اسے چند الفاظ میں دہرایا جاتا ہے تاکہ بات اور نکھر کر سامنے آجائے۔

(۱) دنیا میں افراد، معاشرہ کے جزو کی حیثیت سے زندگی بسر کرتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ جہاں تک متاعِ زیست سے متمتع ہونے کا سوال ہے ان کا معیار معاشرہ کے معیار کے مطابق ہوتا ہے۔ اگر معاشرہ خوشحال ہے تو افراد بھی خوشحال ہیں اور اگر معاشرہ مصیبت میں مبتلا ہے تو افراد بھی تکلیف کی زندگی بسر کرتے ہیں۔

(۲) دنیاوی متاعِ حیات فطرت کی قوتوں کو مسخر کر لینے سے حاصل ہو جاتی ہے۔ اس میں مومن اور کافر کا کوئی امتیاز نہیں۔ جو قوم بھی ان قوانین کے مطابق کوشش کرے گی، اس کا پھل اسے مل جائے گا۔

(۳) لیکن جو قوم فطرت کی قوتوں کے حاصل کو مستقل اقدار کے مطابق صرف کرے گی وہ خود بھی امن و سکون سے رہے گی اور باقی دنیا بھی اطمینان کی زندگی بسر کرے گی۔ اس کے برعکس جو قوم

لے اس قوم کے افراد کی مرنے کے بعد کی زندگی بھی کامرانہوں کی زندگی ہوگی۔ اس نکتہ کی تشریح آگے چل کر اپنے مقام پر آئیگی۔

ان اقدار سے اعراض ہوتے گی متاعِ زینت کی فراوانی کے باوجود وہ خود بھی جہنم کی زندگی بسر کرے گی اور اس کی وجہ سے دوسری قوموں کو بھی قلبی سکون حاصل نہیں ہوگا اور آخر الامر اس قوم کی خوشحالیاں تباہیوں میں بدل جائیں گی۔

قرآن کریم نے ان حقائق کو بڑی شرح و بسط سے بیان کیا ہے اور زیرِ نظر باب میں یہی حقائق مقابلۂ اختصار اور اجمال کے ساتھ ہمارے سامنے آئیں گے۔ اس ضمن میں اس حقیقت کا پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے کہ قرآن کریم دو قسم کے نظریات کا ذکر کرتا ہے جو ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ایک نظریہ زندگی یہ ہے کہ مقصودِ حیات فقط دنیاوی متاع و اسبابِ حصول ہے۔ اس میں کسی مستقل قدر کے پیشِ نظر رکھنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اسے قرآن ”حیات الدنیا یا عاجلہ“ سے تعبیر کرتا ہے۔ دوسرا نظریہ زندگی یہ ہے کہ متاعِ حیات کے حصول اور ان کے صرف کرنے کے لئے مستقل اقدارِ خداوندی کو سامنے رکھا جائے۔ اسے قرآن کریم ”حیاتِ آخرت“ سے تعبیر کرتا ہے۔ ”حیاتِ آخرت“ کی اصطلاح سے یہ مراد نہیں کہ انسان دنیاوی مفاد کو نیاگ کر صرف ”آخرت“ کی فکر کرے۔ یہ تو نظریہ خانقاہیت ہے جس کی قرآن سختی سے مخالفت کرتا ہے۔ ”حیاتِ آخرت“ سے مراد ہے فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے انہیں مستقل اقدارِ خداوندی کے مطابق صرف کرنا۔ قرآن کریم کی ان دونوں اصطلاحوں کو سامنے رکھ کر آگے بڑھتے۔

(۱۱)

دنیاوی مفاد کا حصول

قرآن کریم میں متعدد مقامات پر اس قسم کی آیات آئی ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ

وَمَن يَخْرُجْ لِكُفْرٍ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيعًا مِّمَّنْهُ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝ (۲۵/۱۳)

کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے خدا کی طرف سے تمہارے لئے مسخر کر دیا گیا ہے۔

اس میں غور و فکر کرنے والی قوم کے لئے منزل تک پہنچنے کی بہت سی نشانیاں ہیں۔

ان آیات میں مخاطب صرف مومنین سے نہیں تمام انسانوں سے ہے اور مقصد یہ ہے کہ جو قوم بھی

مفاو کا حصول ہوتا ہے۔ انہیں وہ مفاو تو مل جاتے ہیں لیکن ان کا مستقبل تاریک ہوتا ہے۔ ان کے برعکس وَ مِنْهُمْ مَنْ يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَ فِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَ قَدْ قَنَّا عَذَابَ النَّارِ ۝ (۲/۲۰۱) وہ لوگ بھی ہیں جن کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ انہیں دنیاوی خوشگواریاں بھی حاصل ہو جائیں اور ان کے ساتھ آخروی سرفرازاں بھی۔ اور اس طرح وہ تباہی سے بچ جائیں۔ اُولَٰئِكَ لَهُمْ نَصِيبٌ مِّمَّا كَسَبُوا ۖ وَ اللَّهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ ۝ (۲/۲۰۲) ان کی سعی و عمل کا نتیجہ انہیں مل جاتا ہے۔ خدا تو بہت جلد حساب کر دیتا ہے۔ سورہ آل عمران میں ہے وَ مَنْ يَرْزُقْ ثَوَابَ الدُّنْيَا فُوَّتِهِ مِنْهَا ۖ وَ مَنْ يَرْزُقْ ثَوَابَ الْآخِرَةِ فُوَّتِهِ مِنْهَا ۖ وَ سَتَجِدُنِي الشَّاكِرِينَ ۝ (۳/۱۴۴) جو قوم دنیاوی مفاو چاہتی ہے اسے دنیاوی مفاو مل جاتے ہیں۔ جو قوم اس کے ساتھ آخروی زندگی بھی چاہتی ہے اسے اس کا حصہ بھی مل جاتا ہے۔ ہم ہر ایک کی کوشش کو ثمر بار کر دیتے ہیں۔ اول الذکر گروہ کے حصہ میں صرف مفاو عاجلہ آتے ہیں مستقبل کی زندگی میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ لیکن ثانی الذکر گروہ کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ

فَاَتَاهُمْ اللَّهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَ حُسْنَ ثَوَابِ الْآخِرَةِ ۖ وَ اللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ۝ (۳/۸۴)

انہیں دنیا کا حصہ بھی مل جاتا ہے اور آخرت کا حصہ بھی۔ اس لئے کہ انہوں نے اپنی کوششوں میں 'عاجلہ اور آخرہ' میں صحیح صحیح توازن برقرار رکھا۔ اور یہی روش قانون خداوندی کی رو سے مستحسن ہے۔

مومنین کی اس دنیا کی زندگی

اس خیال کے پیش نظر کہ "حیات آخروی کے تابناک" ہونے سے کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ عبادت مومنین کی اس دنیا کی زندگی (نظر یہ خالقانیت کے مطابق) عسرت اور مغلوک السالی کی زندگی ہوگی لیکن ان کی آخرت کی زندگی بڑی درخشندہ اور تابناک ہوگی۔ قرآن کریم نے متعدد مقامات میں اس حقیقت کی وضاحت کر دی ہے کہ "ایمان و اعمالِ صالحہ" کا لازمی نتیجہ اس دنیا میں عزت اور حکومت خوشحالی و فارغ البالی کی زندگی ہے۔ سورہ نمل میں ہے۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ أَوْ اُنْثَىٰ وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً وَ لَنَجْزِيَنَّهُمْ أَجْرَهُمْ بِأَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ (۱۷/۹۴)۔
جو کوئی بھی تو ان میں خداوندی کی صداقت پر ایمان رکھے گا اور صلاحیت بخش کام کرے گا — وہ مرد ہو یا عورت، ہم اس کی زندگی کو بڑا اسی خوشگوار بنادیں گے اور اسے اس کے اعمال کا نہایت عمدہ اجر دیں گے۔

اس کی وضاحت سورۃ زمر میں ان الفاظ میں کر دی کہ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً (۳۹/۱۰) اچھے کام کرنے والوں کی اس دنیا کی زندگی خوشگوار ہوتی ہے۔ سورۃ نور میں واضح الفاظ میں بتایا گیا ہے کہ ایمان و اعمال صالح کا لازمی نتیجہ اس دنیا میں حکمرانی کی زندگی ہے۔ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ عَمِلُوْا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِى الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (۲۴/۵۵) جو لوگ ایمان کے ساتھ اعمال صالح کریں گے، ان سے خدا کا وعدہ ہے کہ وہ انہیں اس زمین پر حکومت عطا کرے گا جس طرح ان سے پہلے اسی قسم کی اقوام کو حکومت عطا کی گئی تھی۔ ”وین کے تمکن“ سے یہی مراد ہے (۱۱۵/۲۱) سورۃ انبیاء میں ہے کہ خدا نے زبور میں اسی اصل الاصول کو بیان کر دیا تھا کہ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِىَ الصّٰلِحُوْنَ ۝ (۲۱/۱۱۵) ”زمین کی وراثت ہمارے صالح بندوں کو ملے گی۔“ اس قسم کی زندگی کو جس میں مستقل اقدار کے مطابق چلنے والی حکومت قائم ہو جائے، اس دنیا میں ”جنت کی زندگی“ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ سورۃ زمر میں کہا گیا ہے کہ جنت میں داخل ہونے والے کہیں گے کہ

الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ صَدَقْنَا وَ عَدَاۤءُ وَاَوْرَثْنَا الْاَرْضَ نَتَبَوَّۤا مِنَ الْجَنَّةِ حَیْثُ نَشَآءُ فَنَجْعَزُ اَجْرُ الْعَمِلٰیۡنَ ۝ (۳۹/۷۴)۔

کس قدر مستحق حمد و ستائش ہے خدا کی وہ ذات جس نے اپنے وعدوں کو سچ کر دکھایا اور ہمیں زمین کا اس طرح وارث بنادیا کہ ہم اس میں جہاں جی چاہے با اختیار زندگی بسر کریں کام کرنے والوں کا یہ کیسا اچھا اجر ہے۔

دوسرے مقام پر ہے کہ کَتَبَ اللّٰهُ لَا غَلِبَتْنَا اَنَّا وَ رُسُلٰی (۵۸/۲۱) خدا نے یہ لکھ دیا ہے (اس کا اٹل قانون یہ ہے) کہ خدا اور اس کے رسول، مخالفین پر ضرور غالب آکر دیں گے۔ ”خدا اور رسول“

کے غلبہ سے مراد ہے اس جماعتِ مومنین کا غلبہ جو خدا کے قوانین کے مطابق معاش و مشکل کرنے کے لئے رسول (اور رسول کے بعد اس کے جانشینوں کی قیادت میں) مخالفین کے مقابلہ کے لئے اٹھے۔ اسی کو ذرا آگے چل کر حزبِ اللہ (خدا کی پارٹی) کہا گیا ہے اور اعلان کیا گیا ہے کہ **إِنَّ حِزْبَ اللَّهِ هُمُ الْمُفْلِحُونَ** (۵۸/۲۲) یا **وَرَكِبُوا خِطَابَ اللَّهِ** (۵۸/۲۲) ہی آخر الامر کامیاب ہوگی۔ ”یہ کامیابی“ محض ذہنی اور اعتقادی نہیں ہوگی۔ اس دنیا میں غلبہ اور ممکن کی زندگی ہوگی چنانچہ سورۃ ابراہیم میں واضح الفاظ میں بتا دیا کہ جب ہمارے رسول دعوتِ حق و صداقت کی بناء پر انقلابِ آفرینی کے لئے اٹھے تو اس دعوت سے انکار کرنے والوں نے ان کی سخت مخالفت کی اور انہیں سخت دھمکیاں دیں۔ لیکن ہم نے ان کی طرف وحی بھیجی کہ اس میں گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ **لَنُفْلِحَنَّ الظَّالِمِينَ** (۱۳/۱۳) ہم ان مستبدین کو یقیناً تباہ کر دیں گے۔ **لَنُفْلِحَنَّ** کے لفظی معنی **اَلَا تَرْضَوْنَ مِنْ بَعْدِ هُمْ** (۱۳/۱۳) اور ان کے بعد اس سرزمین میں تمہیں بسا دیں گے۔ اس کی عملی مثال کے لئے ایک مقام پر بنی اسرائیل کی تاریخ سے شہادت پیش کی گئی کہ ہم نے فرعون اور اس کے جیوش و عساکر کو ان کے باغات اور باعزت مقامات سے نکال باہر کیا۔ **وَ اَوْزَيْنَاهُمَا بَنِي إِسْرٰٓءِیْلَ** (۲۶/۵۹) اور ان کا وارث بنی اسرائیل کو بنادیا۔ اور دوسری مثال خود عہدِ رسالتِ مآب کی جماعتِ مومنین کی پیش کی کہ اس قدر طول طویل کشمکش کے بعد مخالفین مغلوب ہو گئے۔ **وَ اَوْزَيْنَاهُمْ اَرْضَهُمْ وَاٰدَاهُمْ** (۲۶/۵۹) **وَ اَمْوَالَهُمْ وَ اَرْضًا لَّهُمْ تَطْوٰهُمُ** (۲۶/۵۹) اور ان کی زمینوں کا اور شہروں کا اور مال و دولت کا وارث جماعتِ مومنین کو بنادیا اور اس کے بعد ان ممالک میں بھی ان کی حکومت قائم کر دی جن تک وہ ہنوز پہنچ بھی نہیں پائے تھے۔

تم اپنی جگہ کام کرو میں اپنی جگہ کام کرتا ہوں

حق و باطل کی اس کشمکش کے ابتدائی ایام میں جماعتِ مومنین تعداد کے لحاظ سے بھی قلیل ہوتی تھی اور اسباب و ذرائع کے اعتبار سے بھی بہت کمزور۔ لیکن بایں ہمہ انہیں اپنے پروگرام کی صداقت اور آخر الامر اپنی کامیابی پر اس قدر یقین محکم ہوا تھا کہ مخالفین سے کہہ دیا جاتا تھا کہ

اَعْمَلُوا عَلٰی مَا كُنْتُمْ اِتٰی عَامِلًا ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ ۚ مَنْ تَكُونُ

لَهُ عَاقِبَةُ الدَّارِ ۚ اِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ (۵/۱۳۶) (۱۱/۳۹) (۳۹/۳۹)۔

تم اپنے پروگرام کے مطابق کام کرو۔ مجھے میرے پروگرام کے مطابق کام کرنے دو۔ عنقریب تم دیکھ لو گے کہ انجام کار کامیابی کس کے حصے میں آتی ہے۔ میں تم سے ابھی کہہ دینا چاہتا ہوں کہ خدا کا قانون یہ ہے کہ ظالم کی کمیتی کبھی پتپ نہیں سکتی۔

دوسری جگہ کہا کہ قُلْ اَنْتَظِرُوْا اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ۝ (۱۵۹/۴) ان سے کہہ دو کہ تم بھی اپنے پروگرام کے نتیجہ کا انتظار کرو، ہم بھی انتظار کرتے ہیں۔ (نیز ۱۷۱/۱۷، ۱۷۲/۲۰، ۱۷۳/۱۰، ۱۷۴/۱۱، ۱۷۵/۲۹، ۱۷۶/۳۲) سورہ ہود میں ہے کہ رسول نے قوم مخالف سے کہہ دیا کہ تم اپنے پروگرام کے مطابق کام کرو، میں اپنے پروگرام کے مطابق کام کرتا ہوں۔ سَوَفَا نَعْمُوْنَ ۚ مَنْ يَّاتِيْهِ عَذَابٌ يُخْزِيْهِ وَ مَنْ هُوَ كَاذِبٌ ۚ عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ کس پر وہ تباہی آتی ہے جو اسے ذلیل و خوار کر دے گی اور کون اپنے دعوے میں جھوٹا ہے۔ وَ اِنْ تَعِجُوْا اِنِّيْ مَعَكُمْ رَقِيْبٌ ۝ (۱۱/۹۳) تم بھی دھیان رکھو میں بھی تمہارے ساتھ دھیان رکھتا ہوں۔ انجام کار نتیجہ خود شہادت دے دے گا۔ یہ جو کہا گیا ہے کہ عنقریب تم دیکھ لو گے کہ کون ذلیل و خوار ہوتا ہے۔ تو ظاہر ہے کہ یہ ذلت و خواری اسی دنیا کی ہے۔ مرنے کے بعد کی نہیں۔ اس لئے کہ مرنے کے بعد کی ذلت و خواری اس دنیا میں کسی کے سامنے نہیں آ سکتی اس لئے اسے اس طرح اپنی صداقت کے لئے بطور چیلنج پیش نہیں کیا جاسکتا۔ یہ نتائج اسی دنیا میں سامنے آنے والے ہیں۔ سورہ یونس میں اس نکتہ کی وضاحت یہ کہہ کر کر دی کہ

فَهَلْ يَنْتَظِرُوْنَ اِلَّا مِثْلَ اَيَّامِ الدِّیْنِ خَلَوْا مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ قُلْ فَانْتَظِرُوْا اِنِّيْ مَعَكُمْ مِنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ۝ (۱۰/۱۲)

انہیں اس کے سوا اور کس بات کا انتظار ہے کہ جو شران سے پہلی اقوام کا ہوا تھا وہی حشران کا ہو سوان سے کہو کہ تم بھی انتظار کرو اور میں بھی انتظار کرتا ہوں۔ اس سے ظاہر ہے کہ اقوام سابقہ کے جس انجام کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ اسی دنیا میں سامنے آیا تھا امر لے کے بعد نہیں۔ اس لئے جماعت مومنین اور ان کے مخالفین کے پروگرام کا نتیجہ اس دنیا میں سامنے آ جانا تھا۔ اور یہ نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ یہ کہ

فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۚ وَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ۝ (۱۱/۱۲)

ظلم کرنے والی قوم کی جڑ کاٹ جاتی ہے اور یہ حقیقت ساری دنیا کے سامنے آ جاتی ہے کہ

خدا کا پروگرام ہی مستحق حمد و ستائش ہوتا ہے۔

اس لئے کہ هَلْ يَهْلِكُ إِلَّا الْقَوْمَ الظَّالِمُونَ (۶/۴۱) تباہی آتی ہی ظالم قوم پر ہے۔ یہاں جو کچھ ہوتا ہے خدا کے قانونِ مکافات کی رو سے ہوتا ہے۔ یونہی دھاندلی یا اتفاق (CHANCE) سے نہیں ہو جاتا۔ لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَ يُخْلِي مَنْ تَحَىٰ عَنْ بَيِّنَةٍ (۸/۴۲) جو تباہ ہوتا ہے وہ بھی دلیل و برہان کے مطابق تباہ ہوتا ہے۔ جو زندہ رہتا ہے وہ بھی دلیل و برہان کی رو سے زندہ رہتا ہے۔ یہی قوموں کے عروج و زوال کا اصول اور ان کے استبدالِ استخلاف کا قانون ہے (۹/۳۹ : ۴۴/۳۸)۔

قوموں کی تباہی کی شکلیں

اس دنیا میں قوموں کی تباہی بہر حال مادی اسباب کے ذریعہ ہی واقع ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن کریم نے (سورۃ بقرہ میں) ایک عظیم بنیادی حقیقت کی طرف توجہ منعطف کرائی ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں)۔ وہ کہتا ہے کہ انسانوں کی راہ نمائی کے لئے جو قوانین دیئے گئے ہیں، ان کے دو حصے ہیں۔ ایک حصہ قوانینِ فطرت پر مشتمل ہے جن سے طبعی نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ دوسرے حصہ کا تعلق مستقل اقدار سے ہے جن کا اطلاق انسان کی "انسانی زندگی" پر ہوتا ہے۔ ان دونوں قسموں کے قوانین کا نام الکتاب یا ضابطہ قوانینِ خداوندی ہے۔ جو قوم اس پورے کے پورے ضابطہ قوانین کے مطابق عمل کرتی ہے اس کی زندگی میسر توں کے جھولے جھولتی ہے۔ جو ان میں سے ایک حصہ پر عمل کرتی ہے ان کے حصہ میں ذلت و خواری آتی ہے۔ ان میں سے کسی ایک حصہ پر عمل کرنے کے معنی یہ ہیں کہ

(۱) جو قوم اخلاقی ضوابط کو تو پیش نظر رکھتی ہے لیکن طبعی قوانین سے پہلو تہی کرتی ہے وہ خانقاہیت کی زندگی بسر کرتی ہے جس سے وہ دنیا میں زندہ قوموں کی صف میں کھڑے ہونے کے قابل نہیں رہتی۔ اس کے برعکس

(۲) جو قوم صرف طبعی قوانین پر انحصار کرتی ہے اور اخلاقی قوانین (مستقل اقدار) سے اعراض

برستی ہے اس کا معاشرہ اخلاقی ناہمواریوں کی نذر ہو جاتا ہے اس لئے یہ قوم بھی تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔
 قرآن کریم اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَاءُ مَنْ
 يَفْعَلُ ذَلِكَ مِنْكُمْ إِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْوَعْدِ يُرَدُّونَ
 إِلَىٰ أَشَدِّ الْعَذَابِ ۚ وَمَا أَمَلُكُمْ بِغَارِلٍ عَمَّا تَخْمَلُونَ ۝ (۲/۸۵)

کیا تم اس ضابطہ قوانین کے ایک حصہ پر ایمان لاتے ہو اور دوسرے حصہ سے انکار کرتے
 ہو؟ جو قوم بھی ایسی روش اختیار کرے گی اس کا انجام اس کے سوا کچھ نہیں ہوگا کہ وہ اس
 دنیا میں ذلیل و خوار ہوگی اور آخرت میں سخت ترین عذاب میں ماخوذ۔ خدا تمہارے تمام
 اعمال سے باخبر ہوتا ہے۔

جو قوم معاشرہ میں اخلاقی ناہمواریاں پیدا کرتی ہے اس میں (CORRUPTION) عام ہو جاتی ہے۔
 اس کا ایک نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے ہاں کی انتظامی مشینری بگڑ جاتی ہے اور طبعی استحکامات اس
 قدر ناقص اور کمزور ہو جاتے ہیں کہ وہ ارضی یا سماوی حوادث کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں رہتی۔ قرآن کریم نے
 اقوام سابقہ کی سرگزشتیں بیان کرتے ہوئے جو کہا ہے کہ فلاں قوم سیلاب کی وجہ سے تباہ ہو گئی، فلاں آندھی کے
 طوفان کا مقابلہ نہ کر سکی، فلاں کو آتش فشاں کی آتش ریزی اور سنگ باری نے ہلاک کر دیا۔ تو وہ اس نوعیت
 کی تباہی کی مثالیں ہیں۔ (تفصیل ان امور کی آگے چل کر ملے گی)۔

اس تباہی کی دوسری شکل یہ ہوتی ہے کہ اس قوم میں خانہ جنگی شروع ہو جاتی ہے۔ سورہ
 انعام میں ہے۔

قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلَىٰ أَنْ يَبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ أَوْ
 مِنْ تَحْتِ أَرْجُلِكُمْ أَوْ يَلْبَسَكُمْ لُتُفًا وَيُذِيقَ بَعْضُكُم بَأْسَ
 بَعْضٍ ۚ أُلْظِرُّ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْآيَاتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُونَ ۝ (۶/۶۵)

ان سے کہو کہ خدا اس پر تدریجی طور پر اس کی تباہی کے اسباب بھجودے یا نیچے سے۔

یہ تمام مختلف پارٹیوں میں بٹ کر گڈ مڈ ہو جاؤ اور باہمی غانہ جنگی شروع کر دو۔ دیکھو! ہم کس طرح حقائق کو مختلف انداز سے تمہارے سامنے لاتے ہیں تاکہ تم بات سمجھ جاؤ۔

ان حالات سے کوئی دوسری قوم فائدہ اٹھا کر اس پر حملہ کر دیتی ہے اور اس طرح اس کی تباہی کا موجب بن جاتی ہے۔ اگر یہ (حملہ آور) قوم بھی مستقل اقدارِ خداوندی پر ایمان نہیں رکھتی تو یہ مقابلہ دونوں قوموں کی صرف طبعی قوتوں کا ہوتا ہے اور نفع انسان کو ایک کی شکست اور دوسری کی کامیابی سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ کیونکہ اس سے ایک مستبد قوت کی جگہ دوسری مستبد قوت برسرِ اقتدار آ جاتی ہے۔ لیکن اگر یہ دوسری قوم اقدارِ خداوندی کی متبع ہو تو اس کا غلبہ انسانیت کے لئے موجب برکت و سعادت ہوتا ہے کیونکہ اس کا غلبہ عدل و احسان کی برتری کے لئے ہوتا ہے۔ بہر حال یہ ہیں مختلف شکلیں جن میں قوموں کی غلط روش کے نتائج ان کی تباہی بن کر اس دنیا میں ان کے سامنے آ جاتے ہیں۔

شُرّانِ کریم میں تباہی کی ان مختلف شکلوں کا ذکر بڑی تفصیل سے آیا ہے۔ ہم یہاں ان کا تذکرہ اجمالاً کرتے ہیں۔

اقوام سابقہ کی تباہی

شُرّانِ کریم میں اقوام سابقہ کی تاریخی سرگزشتوں کا اندازہ کچھ اس قسم کا ہے کہ وہ ایک قوم کے جرائم (اخلاقی ناہمواریوں) میں اس جرم کو نمایاں طور پر سامنے لاتا ہے جو اس قوم میں سب سے زیادہ عام ہو چکا تھا اور ان میں طرح طرح کی خرابیوں کا موجب بن رہا تھا۔ ایسے میں ان کی طرف خدا کا ایک پیغام سا (رسول) آتا ہے جو انہیں ان کی اس روش کے ہلاکت آفریں نتائج سے آگاہ کر کے انہیں صحیح روش پر چلنے کی تلقین کرتا ہے۔ وہ اس کی ہدایات پر کان نہیں دھرتی اور اپنی غلط روش میں آگے ہی آگے بڑھے چلی جاتی ہے تاکہ کوئی ارضی یا سماوی حادثہ اسے تباہ کر دیتا ہے۔ بظاہر ان کے اُس اخلاقی جرم اور اس حادثہ میں کوئی ربط نظر نہیں آتا اس لئے عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ خدا نے اس قوم کی تباہی کے لئے اس "عذاب" کو فوق الفطرت (SUPER-NATURAL) طریقہ سے بطور معجزہ

نازلی کر دیا۔ لیکن درحقیقت بات یہ نہیں۔ اس قوم کی اس روش اور اس تباہی میں گہرا ربط ہوتا ہے۔ اس قوم کی اخلاقی ناہمواریوں کی وجہ سے اس کے معاشرہ میں اس قدر خرابیاں عام ہو جاتی تھیں کہ وہ فطری حوادث سے محفوظ رہنے کی حفاظتی تدابیر کی طرف سے غافل اور لاپرواہ ہو جاتی تھی۔ خدا کا رسول انہیں صرف ”اخلاقی نصائح“ نہیں کرتا تھا وہ انہیں متنبہ کرتا تھا کہ ان اخلاقی ناہمواریوں کی وجہ سے ایک تو ان کے معاشرہ میں بے اطمینانی پھیل رہی ہے اور دوسرے وہ اپنی حفاظتی تدابیر کی طرف سے لاپرواہ ہو چکے ہیں۔ اس لئے اگر فطری حوادث میں سے کوئی ایک حادثہ بھی آپہنچا تو وہ انہیں تہس نہس کر کے رکھ دیگا۔ فطری حوادث آج بھی کچھ کم نہیں ہوتے لیکن ایک تو اُس زمانے کے عام جغرافیائی حالت کی وجہ سے اور اُس زمانے میں اساتذہ تفک تحقیقات و ایجادات کے فقدان کے باعث یہ حوادث بڑی سخت تباہی کا موجب بن جاتے تھے۔ آج بھی جن قوموں میں معاشرتی خرابیاں عام ہو جاتی ہیں اور وہ طبعی حوادث کی روک تھام کے لئے مناسب اقدامات نہیں کرتیں، اس قسم کے حوادث انہیں بُری طرح تباہ کر دیتے ہیں۔ اس کے برعکس جو قومیں ان حوادث کی روک تھام کی حفاظتی تدابیر کر لیتی ہیں، وہ ان کی تباہیوں سے محفوظ رہتی ہیں۔ معاشرتی خرابیوں کی وجہ سے ان کی تباہی کی شکلیں اور پیدا ہو جاتی ہیں۔ یہ تباہی ان اقوام کی معاشرتی خرابیوں اور خارجی حوادث سے ان کی تباہی میں — اس قوم کے خواہ فرد، رسول کی باتوں کو سچا سمجھتے تھے (وہ اگر اتنی قوت نہیں رکھتے تھے کہ اس قوم کے معاشرہ میں انقلاب پیدا کر دیں یا انفرادی طور پر اپنی حفاظت کا سامان کر لیں تو) وہ اس حادثہ کے رونما ہو جانے سے پہلے وہاں سے کسی دوسری جگہ منتقل ہو جاتے اور وہاں اپنے معاشرہ کی تشکیل نو کر لیتے تھے۔ اسے قرآن کریم کی اصطلاح میں ہجرت کہا جاتا ہے۔

قوم نوح

شُرآنِ کریم اس انداز سے قوموں کی تباہی کے تذکرہ کا سلسلہ، قوم نوح سے شروع کرتا ہے۔ وہ ہمیں بتاتا ہے کہ اس قوم میں طبقاتی امتیاز اس قدر شدید ہو چکا تھا کہ دو متمند طبقہ محنت کشوں اور مزدوروں کو بڑی ذلت کی نگاہ سے دیکھتا تھا اور ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے تک کو اپنے لئے باعثِ ذلت سمجھتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس بستی کی جغرافیائی پوزیشن ایسی تھی کہ وہ نشیب میں واقع تھی۔

اور بارش کے وقت ارد گرد کی پہاڑیوں کا پانی اس راستے سے گذرتا تھا۔ چونکہ قوم کا اوپر کا طبقہ اپنی دولت کے نشہ میں بہرست تھا اس لئے وہ اس خطرہ کی مدافعت کے لئے کوئی حفاظتی تدبیر نہیں سوچتا تھا۔ حضرت نوحؑ ان میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے قوم کی توجہ ان خرابیوں کی طرف منعطف کرائی۔ لیکن قوم کے اوپر کے طبقہ نے ان کی سخت مخالفت کی۔ جہاں تک سیلاب کے خطرہ کا تعلق تھا، انہوں نے اس سے بھی قوم کو متنبہ کیا لیکن انہوں نے اس کی طرف دھیان ہی نہ دیا۔ خطرہ اس طرح سر پہ منڈلا رہا تھا کہ حضرت نوحؑ نے خدا کی بتائی ہوئی تدبیر کے مطابق ایک کشتی بنانی شروع کر دی۔ وہ لوگ اس پر بھی انکار مذاق اڑاتے رہے تا آنکہ ایک دفعہ بڑے زور کی بارش ہوئی اور ارد گرد سے پانی اُمنڈ کر آگیا۔ کشتی نے حضرت نوحؑ اور ان کے ساتھیوں کو بچا لیا اور باقی بستی والے تباہ ہو گئے۔ (اس تذکرہ کے لئے دیکھئے آیات ۷۵/۷۶) :

۲۶/۱۱ : ۳۹/۱۱ : ۳۷/۲۵ : ۷۱/۱۱

قوم عباد

قوم عاؤ کے متعلق قرآن کریم نے بتایا ہے کہ وہ بڑی قوت و حشمت اور دولت و سطوت کی مالک تھی۔ سامانِ زیست کی فراوانیاں، وسیع و عریض مملکتیں، مستحکم قلعے۔ لیکن ان کے ظلم و استبداد کا یہ عالم تھا کہ **وَإِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِينَ** (۲۶/۱۳۰) وہ اپنے پنجہٴ فولادی کی گرفت سے کمزوروں اور مظلوموں کی ہڈیاں توڑ ڈال کر تے تھے۔ دولت و قوت کی فراوانی اور ظلم و استبداد کی حدود فراہموشی سے معاشرہ میں جو خرابیاں پیدا ہو سکتی تھیں وہ ظاہر ہیں۔ حضرت ہودؑ نے ہزار کوشش کی کہ وہ اپنی غلط روش کو چھوڑ کر قوانینِ خداوندی کی محکومی اختیار کر لیں لیکن انہوں نے ان کی ایک نہ سنی اور خرابیاں بڑھتی اور حفاظتی تدابیر کی طرف سے غفلت اور لاپرواہی عام ہوتی چلی گئی۔ ایک دفعہ آندھی کا ایسا خطرناک طوفان آیا کہ اس نے ہفتہ بھر تک اس علاقہ کو اپنی لپیٹ میں لئے رکھا اور یوں وہ

ہے اس نے اپنی تصانیف جوئے نور۔ برقی طور۔ اور شعلہ مستور میں ان اقوام سابقہ کی داستانیں پوری تفصیل کے ساتھ بیان کی ہیں اس لئے اس مقام پر میں انہیں تفصیلاً بیان نہیں کر رہا۔ اس وقت میرے پیش نظر صرف قانونِ مکاتفا علی کی اصولی بحث ہے جو احباب ان اقوام کی تفصیلی داستانیں دیکھنا چاہیں وہ ان کتابوں میں ملاحظہ فرمائیں۔

قوم تباہ ہو گئی۔ دولت و قوت کے نشہ نے ان کو ایسا اندھا اور بہرہ کر دیا تھا کہ ان کی عقل و فکر ان کے کسی کام نہ آ سکی۔ قرآن کریم ان کی تباہی کا تذکرہ کرنے کے بعد نبی اکرمؐ کے مخالفین کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ

وَلَقَدْ مَكَنَّهُمْ فِيمَاۤ اِنْ مَّكَّنَّاكُمْ فِيْهِ وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَنَآءًا وَّ اَبْصَارًا
وَّ اَفْصَحَۃً ۙ فَمَا اَعْنٰی عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَّ لَا اَبْصَارُهُمْ وَّ لَا
اَفْهَامُهُمْ مِّنْ شَيْءٍ ۚ اِذْ كَانُوْا يَمْجُدُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ وَحَقِّ
بَیِّنٰتٍ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَفْهِمُوْنَ ۝ (۳۶/۲۶)۔

ہم نے انہیں ملک میں اس قدر قوت اور تمکن عطا کر رکھا تھا کہ ایسی قوت و تمکین تھیں
بھی نصیب نہیں۔ انہیں دیکھنے، سننے، سمجھنے، سوچنے کی ساری صلاحیتیں حاصل تھیں لیکن
چونکہ انہوں نے قوانین خداوندی کے خلاف روش اختیار کر رکھی تھی اس لئے ان کی صلاحیتیں
سب بیکار ہو کر رہ گئیں اور جس تباہی کے ذکر تک کی وہ ہنسی اڑا یا کرتے تھے اس نے
انہیں چاروں طرف سے گھیر لیا۔

قوم ثمود

قوم عاد کے بعد قوم ثمود کا تذکرہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ اس زمانے میں حیثیت کا بیشتر دار و مدار
گلہ بانی (مویشی پالنے) پر تھا۔ یہ مویشی چراگا ہوں میں چرتے اور چشموں سے پانی پیتے تھے۔ لیکن قوم
کے ذی قوت و اقتدار طبقہ نے ان چراگا ہوں اور چشموں پر ذاتی قبضہ ہمارکھا تھا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ کمزوروں
اور غریبوں کے مویشیوں کو نہ پیٹ بھر لے کو چارہ ملتا تھا نہ پینے کو پانی۔ حضرت صالحؑ نے ان کی توجہ ان
خرابیوں کی طرف منعطف کرائی اور ان سے کہا کہ لَا تَخْشَوْا فِی الْاَرْضِ مُفْسِدِیْنَ ۝ (۲۱/۷۱) خدا
کی زمین خدا کی مخلوق کے لئے یکساں طور پر کھلی رہنے دو اور اس قسم کی ناہمواریاں مست پیدا کرو۔ ان
ناہمواریوں کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ اوپر کا طبقہ بلا محنت و مشقت امیر سے امیر تر ہوتا چلا جا رہا ہے اور دولت
کی فراوانی نے انہیں ایسا بدست کر دیا ہے کہ وہ ملک کی رفاہی تدابیر کی طرف سے مدہوش ہو چکے ہیں اور

نیچے کا طبقہ اپنی مصیبتوں سے اس قدر پریشان ہے کہ اسے کسی دوسری طرف دھیان دینے کی فرصت ہی نہیں۔ تمہارے علاقے میں آئے دن زلزلے آتے رہتے ہیں۔ اگر تم نے حفاظتی تدابیر اختیار نہ کیں تو تم تباہ ہو جاؤ گے۔ انہوں نے ان کی ایک دشمنی اور آخر زلزلے کے جھٹکوں نے انہیں تباہ کر دیا۔ حضرت صالحؑ اور ان کے ساتھی اس سے قبل (حضرت ہودؑ کی طرح) کسی محفوظ علاقے کی طرف منتقل ہو چکے تھے۔ (اس سلسلہ میں دیکھئے۔ (۴/۶۳؛ ۱۱/۶۴؛ ۱۵۴/۲۶؛ ۲۱/۱۶)۔

قوم لوطؑ

یہ قوم 'بحیرہ میت' (DEAD SEA) کے اس علاقہ میں آباد تھی جو آتش فشاں پہاڑی کے دامن میں تھا۔ رہزنی اور قزاقی ان کا شایہ تھا اور جنسی بدنہادی اس قدر عام ہو چکی تھی کہ لوطؑ کو معاشرہ میں محبوب ہی نہیں سمجھا جاتا تھا (۲۹/۲۹)۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی وحشی اور جاہل قوم، معاشرہ کے لئے حفاظتی تدابیر کیا سوچتی؟ حضرت لوطؑ نے ہزار کوشش کی کہ انہیں راہ راست پر لے آئیں لیکن انہوں نے ان کی ایک نہ مانی اور اپنی انسانیت سوز حرکات میں آگے ہی آگے بڑھتے چلے گئے۔ معاشرہ کا نظم و نسق تہس نہس ہو گیا اور کوہ آتش فشاں کی سنگ باری نے انہیں تباہ کر دیا۔ حضرت لوطؑ اپنے چند ساتھیوں کو لے کر قبل از وقت وہاں سے ہجرت کر چکے تھے۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے ۱۱/۷۶؛ ۲۹/۲۹؛ ۵۱/۳۶؛ ۱۵۴/۳۸)۔

قوم شعیبؑ

مدین میں بسنے والی اس قوم کو بڑا کاروباری فروغ حاصل تھا لیکن ان کا یہ فروغ ان کے نظام سرمایہ داری کا رہین منت تھا۔ ان کی انتہائی کوشش یہ ہوتی تھی کہ "دوسروں سے لیا زیادہ جائے اور دیا کم جائے"۔ حضرت شعیبؑ انہیں اس غلط معاشی نظام سے روکتے اور ان سے کہتے کہ

يَقَوْمِ اَذْكُرُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيزَانَ بِالْقِسْطِ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ

اَشْيَاءَهُمْ وَلَا تَقْبَلُوا فِي الْكُتُبِ مُمْسِكِينَ ۝ (۱۱/۸۵)۔

تم اپنے ماپ تول کے پیمانے صحیح رکھو۔ دھوکا اور فریب سے لوگوں کی چیزیں نہ ہتھیا لیا کرو۔ اس سے

معاشرہ میں سخت ناہمواریاں پیدا ہو جاتی ہیں جن کا نتیجہ تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں۔ دولت کے نشہ میں بدمست سرمایہ دار طبقہ ان کا مذاق اڑاتا اور ان سے کہتا کہ ”میاں! تم خدا پرست انسان ہو تو اپنے نماز روزے سے کام رکھو۔ تمہیں ان دنیاوی دھندوں سے کیا واسطہ۔ یہ ہمارا کاروبار ہے اسے ہم جس طرح چاہیں سرانجام دیں۔ غریبوں اور ناداروں کا سارا درد تمہارے ہی جگر میں کیسے جاگزیں ہو گیا۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ کس سلوک کے مستحق ہیں اور انہیں کتنا دینا چاہیے۔ اس قسم کی باتیں کر کے تم انہیں یونہی سر نہ چڑھاؤ (۱۱/۸۶)۔ اس قسم کے غلط معاشی نظام سے معاشرہ کے نظم و نسق میں جو ابتری پھیل سکتی ہے وہ ظاہر ہے۔ اس کا نتیجہ تباہی کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا (۱۱/۸۴ : ۱۱/۸۹)۔

قوم تباہ

یہ قوم بین میں رہتی تھی۔ ابتدائے ان کی معیشت کا انحصار زراعت پر تھا۔ اس کے لئے انہوں نے اپنی بستی سے اوپر پہاڑی علاقہ میں پانی کا ایک بہت بڑا بند (DAM) تعمیر کر رکھا تھا جس سے ارد گرد کا علاقہ بڑا سرسبز و شاداب رہتا اور انہیں جھولیاں بھر بھر کر پھل دیتا تھا۔ انہیں کسی طرح تجارت کا چسکا پڑ گیا اور ہر سرمایہ دار کی طرح ان کی ہوس زردن بدن بڑھتی چلی گئی۔ دولت سمیٹنے کی اس مسابقت (RACE) میں یہ اس قدر مہمک ہوئے کہ ملک کا نظم و نسق تباہ ہوتا چلا گیا۔ بند میں شگاف پڑنے شروع ہو گئے لیکن ان کی طرف کسی نے توجہ ہی نہ دی۔ چنانچہ ایک سال اس کے سامنے کی دیوار جو ٹوٹی ہے تو ان کی بستیاں اور سارا علاقہ خس و خاشاک کی طرح بہہ گیا۔ ذَلِکَ حَزَنٌ لِّہُمْ بِمَا کَفَرُوْۤا (۳۲/۱۷) انہوں نے جو غلط روش اختیار کی تھی تو یہ اس کا نتیجہ تھا۔ وَ ظَلَمُوْۤا اَنْفُسَہُمْ اِنہوں نے اپنے آپ پر زیادتی کی تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فَجَعَلْنٰہُمْ اَحَادِیْثًا وَ مَزَقْنٰہُمْ کُلَّ مُسَیِّۃٍ (۳۲/۱۹) ان کی اجتماعیت کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ وہ خس و خاشاک کی طرح بکھر گئے اور وہی قوم جو کسی وقت اس قدر ممتاز زندگی بسر کرتی تھی اس طرح مٹ گئی کہ لوگوں کی زبانوں پر بس ان کی کہانیاں باقی رہ گئیں (۱۷-۳۲/۱۹)۔

یہ ہیں اس تباہی کی مثالیں جو نظم و نسق کی خرابی کی وجہ سے حوادثِ ارضی و سماوی سے حفاظت کی تدابیر اختیار نہ کرنے کے باعث قوموں پر وارد ہوتی ہے۔

تباہی کی دوسری شکل

تباہی کی دوسری شکل یہ ہے کہ جب کوئی قوم اپنی داخلی خرابیوں کی وجہ سے کمزور ہو جائے تو کوئی دوسری مستبد قوم جو قوت میں اس سے زیادہ ہو اسے آکر چھٹ لے۔ اس کے لئے قرآن کریم بنی اسرائیل (یہودیوں) کی عبرت آمیز داستان ہمارے سامنے لاتا ہے۔

وہ سب سے پہلے ان کی قومی زندگی کے اس گوشے کا تذکرہ کرتا ہے جس میں وہ فراعنہ مصر کی محکومی میں ذلت کے دن گزارتے تھے۔ اسے بھی قرآن کریم نے "عذاب" قرار دیا ہے۔ چنانچہ جب حضرت موسیٰ فرعون کے دربار میں گئے ہیں تو اس نے ان کی ابتدائی زندگی کو سامنے لا کر اپنے احسانات گنوائے شروع کئے۔ اس پر حضرت موسیٰ نے جواب میں ایک ہی بات کہی اور وہ یہ کہ

وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ أَنْ عَبَّدْتُ بَنِي إِسْرَءِيلَ ۝ (۳۶/۲۲)

تمہاری سب سے بڑی نعمت جس کا تو مجھ پر احسان جتلاتا ہے یہ ہے کہ تو نے بنی اسرائیل کو اپنی محکومیت کے شکنجے میں جکڑ رکھا ہے۔

اس کے برعکس اس قوم پر خدا کی طرف سے جو احسان ہونے والا تھا وہ یہ تھا کہ اسے فرعون کی محکومی سے نجات دلا کر وراثت حکومت و سلطنت بنا دیا جائے۔

وَشَرِينَا أَنْ كُنَّا عَلَى الَّذِينَ اسْتَظْفَرُوا فِي الْأَرْضِ وَ
جَعَلْنَاهُمْ آيَةً وَجَعَلْنَاهُمُ الْوَارِثِينَ ۝ وَكُنَّا لَهُمْ فِي
الْأَرْضِ وَ شَرِيًّا فَزَعُونَا وَ هَامُنَا وَ جُنُودَهُمَا مِنْهُمْ مَا
كَانُوا يَحْتَدِرُونَ ۝ (۲۸/۶-۵)

اور ہم چاہتے تھے کہ جس قوم کو اس طرح کمزور و ناتواں بنا دیا گیا ہے اسے اس قدر ذلت سے نکال کر دوسری قوموں کا امام (لیڈر) بنائیں اور اسے قوم غالب کے تخت و تاج کا وراثت قرار دیں اور انہیں ملک میں حکومت عطا کر دیں اور فرعون اور ہامان اور ان کے شکر اپنے اعمال کے اس مال کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں جس کے تصور تک سے وہ لرزاں رہتے تھے۔

حضرت موسیٰ و حضرت ہارونؑ کی قیادت میں ساہا سال کی مسلسل جدوجہد کے بعد یہ قوم اہل فرعون کی محکومی کے شکنجے سے آزاد ہوئی۔ پھر اسے وہ عروج نصیب ہوا جو تاریخ میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ یہ بھی ان کے اپنے حسن عمل کا نتیجہ تھا۔ پھر جب انہوں نے اس روش کو چھوڑ کر غلط روش اختیار کر لی تو ان پر وہ تباہی آئی جس کی مثال تاریخ اُمم میں بہت کم ملے گی۔ سب سے پہلے ان کی تباہی بابل کے شہنشاہ بخت نصر کے ہاتھوں ہوئی۔ اس سلسلہ میں قرآن کریم میں ہے کہ

فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ أُولَٰئِهِمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَا أُولِي بَأْسٍ
شَدِيدٍ فَجَاسُوا خِلَالَ الدِّيَارِ وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُولًا ۝ (۱۷/۵)۔

جب ان کی تباہی کے دو مواقع میں سے پہلا موقع سامنے آیا تو اے بنی اسرائیل! تم پر ایسے
لوگ پرھو دوڑے جو بڑے ہی خوفناک اور جنگ جوتھے۔ وہ تمہاری بستیوں کے اندر پھیل گئے
اور یوں خدا کا قانون سکافات نتیجہ خیز ہو کر رہا۔

اس سے اس قوم نے عبرت پکڑی۔ اپنی سابقہ روش پر نادم ہوئے اور اپنی اصلاح کی کوشش کی چونکہ
ابھی ان کی خرابیوں کا پلڑا بہت زیادہ جھکانہ تھا اس لئے ان کی باز آفرینی کا امکان تھا۔ فارس کا شاہنشاہ
خوسر (ذوالقرنین) بابل کی مستبد شاہنشاہیت کے خلاف برقی خاطر بن کر اُبھرا۔ انہیں ان کے غلط
اعمال کی سزا دی اور بنی اسرائیل کو بیت المقدس میں دوبارہ بسادیا۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد انہوں نے
پھر قوانین خداوندی کی خلاف ورزی شروع کر دی۔ اقدارِ سماوی کو پامال کر دیا، تو ان کی آخری تباہی کا
وقت آگیا۔ قرآن کریم کے الفاظ میں۔

فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ الْآخِرَةِ لِيَسُوءُوا وُجُوهَكُمْ وَلِيَتَلَطَّوْا عَلَى أَعْقَابِكُمْ فَجَاءَ قُرْآنُ رَبِّكَ
أَوَّلَ صَرْفٍ ۖ لِيُتْلَىٰ نَسِيمًا ۝ (۱۷/۷)۔

جب تمہاری تباہی کا دوسرا وقت آیا تو تم پر وہ لوگ حملہ آور ہوئے جنہوں نے مار مار کر تمہارا
حلیہ بگاڑ دیا۔ انہوں نے میکہ میں داخل ہو کر اسے اسی طرح تباہ و برباد کر دیا جس طرح پہلے
حملہ آوروں نے کیا تھا۔ اور جو کچھ سامنے نظر آیا اسے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔

بنی اسرائیل کی اس تباہی کی ابتدا پامپتی (رومی) کے ہاتھوں ہوئی اور ٹائٹس کی یورش سے اختتام تک
پہنچ گئی۔ قرآن کریم نے بڑی تفصیل سے ان جرائم کو گنایا ہے جن کا نتیجہ اس قوم کا یہ عبرت انگیز انجام تھا۔

اس کے بعد ان کی حالت یہ ہو گئی کہ ضَرِیْبَتْ عَلَیْھُمْ الدِّلَّةُ اَیْنَمَا تُقْفُوْا (۳/۱۱۱) وہ جہاں گئے ذلت و محکومی سایہ کی طرح ان کے ساتھ چپکی رہی۔ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَعِبْرَتًا لِّمَنْ یَّخْشٰی (۹/۲۶) اقوام سابقہ کی ان تاریخی یادداشتوں میں ان لوگوں کے لئے صد ہزار سالانہ عبرت ہے جو قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی کے تباہ کن نتائج سے غافل رہتے ہیں۔

بنی اسرائیل کا یہ انجام قوموں کی تباہی کی دوسری شکل ہے جس میں زیادہ قوت والی قوم کمزور قوم کو تباہ و برباد کر دیتی ہے۔

قوموں کی تباہی کی تیسری شکل

قوموں کی تباہی کی تیسری شکل یہ ہے کہ غلط روش پر چلنے والی قوم کے مقابلہ میں ایک ایسی قوم کھڑی ہو جائے جو مستقل اقدار کی علمبردار ہو اور دنیا میں عدل و احسان کا نظام قائم کرنے کے لئے مصروفِ سعی و عمل اسے حق و باطل کی کشمکش یا دو متخالف نظریاتِ زندگی (IDEOLOGIES) کی جنگ کہا جائے گا۔ اس کشمکش کے دوران یہ ہو سکتا ہے کہ حق کی علمبردار جماعت کی عارضی طور پر پستی ہو جائے لیکن اگر وہ استقامت سے کام لے گی تو اپنے سے دس دس گنا زیادہ طاقتور دشمن پر بھی کامیابی حاصل کر لے گی (۸/۴۵)۔ یاد رہے کہ اس جنگ میں حق کی حامی جماعت کو بھی پوری پوری قوت فراہم کرنی ہوگی (۸/۶۰) اور ان کی کامیابی ان کی اپنی جدوجہد کا نتیجہ ہوگی جسے "نصرتِ خداوندی" یا "تائیدِ غیبی" کہا جاتا ہے وہ یہی ہوتی ہے کہ اپنے مقصد کے مبنی برحق و صداقت ہونے پر یقین محکم اس تمام جدوجہد میں اخلاقی اقدار کی پوری پوری نگہداشت ان میں ایسا محکم کیے کہ کٹر پیدا کر دیتی ہے جو مادی قوتوں کی کمی کا ایک حد تک ازالہ کر دیتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی تسلسلِ حیات پر ایمان (یعنی اس حقیقت پر یقین محکم کہ موت کے ساتھ زندگی کا خاتمہ نہیں ہو جاتا۔ ہم مرنے کے بعد بھی زندہ رہتے ہیں اور وہ زندگی موجودہ زندگی

لے بنی اسرائیل پر اس دنیا میں "عذاب" کے سلسلہ میں یہ آیات بھی دیکھئے (۲/۲۹)؛ ۵/۱۸؛ ۱۴/۴۱؛

۱۴۳ — ۱۴۴ — ۱۴۵/۴؛ ۶ — ۱۴/۴؛ ۲۰/۴۴) اور قومِ فرعون کی تباہی کے سلسلہ میں (۱۰/۸۸)؛ ۲۰/۴۸ — ۲۰/۴۹؛

کے مقابلہ میں کہیں زیادہ حسین و تابناک ہوگی) ان کے دل سے موت کا ڈر قاطبہ نکال دیتی ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جس شخص کو موت کا ڈر نہ ہو اس کی قوتِ بازو کا کون مقابلہ کر سکتا ہے۔ یہ جنگ بھی درحقیقت ”ثقل و خفت موازین“ (پلڑوں کے جھکنے اور اٹھنے) کی جنگ ہوتی ہے۔ چونکہ حق و صداقت کی علمبردار جماعت کاحسنات کا پلڑا، فریقِ مخالف کے مقابلہ میں بھاری ہوتا ہے اس لئے اسے کامیابی ہو جاتی ہے۔ سورۃ اعراف میں اس حقیقت کو بڑے بلیغ انداز میں سامنے لایا گیا ہے۔ بات یوں شروع کی گئی ہے کہ کتنی قومیں اس سے پہلے تباہ ہو گئیں اور ہمارا عذاب ان پر کبھی رات کے وقت آگیا کبھی دوپہر کے وقت جب وہ آرام کر رہے تھے۔ جب تباہی ان کے سامنے آن کھڑی ہوئی تو ان کی چیخ و پکار اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ — ہاں! ہم نے بڑے مظالم کئے اور یہ نتیجہ انہی کا ہے۔ یہ تباہی یونہی نہیں آ جاتی۔ حق و صداقت کی علمبردار جماعت جس کی قیادت خود رسول کریم ہوتا ہے کی ذمہ داریوں کا بھی جائزہ لیا جاتا ہے اور فریقِ مقابل سے بھی اسی طرح باز پرس ہوتی ہے (۲۱-۶/۷)۔

اس کے بعد ہے۔

وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذٍ بِالْحَقِّ ۖ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ
الْمُفْلِحُونَ ۝ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنفُسَهُمْ
بِمَا كَانُوا بِآيَاتِنَا يَظْلِمُونَ ۝ (۸-۷/۹) (نیز ۳۵-۲۱/۳۷)

اس وقت ہماری میزانِ عدل ٹھیک ٹھیک فیصلہ دے دیتی ہے۔ جس کا پلڑا جھکا ہوتا ہے وہ کامیاب ہو جاتا ہے جس قوم کا پلڑا ہلکا ہوتا ہے وہ اپنے مظالم کی وجہ سے تباہ ہو جاتی ہے۔

شرآن کریم نے حق و صداقت کی علمبردار قوم کے ہاتھوں مجرم قوم کی تباہی کے سلسلہ میں نمایاں طور پر ایک تو حضرت موسیٰ اور اہل فرعون کی کشمکش کا ذکر کیا ہے۔ اور اس سے بھی زیادہ تفصیلی طور پر نبی اکرم (اور حضور کے رفقاء) کی مخالفینِ عرب کے ساتھ کشمکش کا ذکر۔ شرآن کریم کا ایک معتد بہ حصہ اسی کشمکش کی بصیرت افروز اور عبرت انگیز داستان پر مشتمل ہے۔ قومِ مخالف کی پے درپے شکستوں اور آخر الامر ان کی قوت کے خاتمہ کو ان کی غلط روشِ زندگی کے فطری نتیجہ سے تعبیر کیا گیا ہے جو خدا

کے قانونِ مکافات کی رو سے سامنے آگیا۔ اسی کو ”خدا کا عذاب“ کہا گیا ہے اور بار بار اس امر کی وضاحت کی گئی ہے کہ ”ان پر اس قسم کا تباہی کا عذاب کیوں آتا؟ جبکہ ان کی حالت یہ تھی کہ وہ یہ کرتے تھے اور وہ کرتے تھے (۳۲-۸/۳۷)۔ اس سلسلہ میں ان سے کہا گیا کہ

وَمَا تُرْسِلُ الْمُرْسَلِينَ إِلَّا مُبَشِّرِينَ وَ مُنْذِرِينَ ۚ فَمَنْ أَضَلَّ
أَضَلَّ فَلَا خَوْفَ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝ وَالَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا
يَمَسُّهُمْ الْعَذَابُ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ (۶/۴۹-۴۸)۔

ہمارے پیغام بر آتے ہی اس لئے ہیں کہ لوگوں کو اس حقیقت سے آگاہ کر دیں کہ غلط روش زندگی کا نتیجہ تباہ کن ہوتا ہے اور صحیح روش کا مال بڑا خوش آئند۔ سو جو قوم ان کی بات مان لیتی ہے اور اس کے مطابق اپنی اصلاح کر لیتی ہے تو ان پر کسی قسم کا خوف وحشت نہیں ہوتا۔ لیکن جو لوگ کہتے ہیں کہ نہیں! یہ سب جھوٹ ہے ان پر ان کی غلط روش کی وجہ سے تباہی آجاتی ہے۔

اس ٹکراؤ میں پہلی بار ہی قوم مخالف کا خاتمہ نہیں ہو جاتا، انہیں نقصان پہنچتا ہے اور اس طرح انہیں موقع مل جاتا ہے کہ وہ اپنی غلط روش چھوڑ کر صحیح راستہ اختیار کر لیں، لیکن جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، یہ لوگ اس ہمت کے وقفہ سے غلط فائدہ اٹھاتے ہیں اور اپنی مخالفت میں شدت اختیار کر لیتے ہیں اس طرح رفتہ رفتہ ان کی آخری تباہی کا وقت آ جاتا ہے۔ حضور رسالت مآب کے ساتھ فریقِ مخالفت کے تصادمات کی یہی کیفیت تھی (۱۰۱-۹/۱۰۲) (۲۰۱-۲۴/۲۰۳) (۴۱-۲۵/۴۲) (۵۱-۴۳/۴۷)۔ (۹/۱۲۶) (۱۱/۸)۔

رسول اللہ کی بعثت سے پہلے ان لوگوں (عربوں) کے گرد و پیش جو قومیں بستی تھیں ان میں سے کسی کا معاشرہ بھی قوانینِ خداوندی پر مشتمل نہیں تھا، اس لئے اُس وقت نظریات کے درمیان کشمکش کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اُس وقت معاملہ خالص ”دنیاوی سیاست“ کا تھا جس کی رو سے ان (اہل عرب) نے ایسا انتظام کر رکھا تھا کہ کوئی قوم انہیں نقصان نہ پہنچائے۔ لیکن ظہورِ اسلام کے بعد تصادمِ نظریات کا تھا۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ انہیں پہلے واضح طور پر بتا دیا جاتا کہ صحیح روش کونسی ہے اور غلط کونسی۔ پھر انہیں اس کا موقع دیا جاتا کہ وہ اپنی غلط روش کو چھوڑ کر صحیح روش

اختیار کر لیں۔ ایسا کیا گیا۔ اور کافی لمبے عرصہ تک کیا گیا۔ (جماعتِ مومنین کی مکتی زندگی اسی تبلیغ و تبیینِ حقیقت کے لئے وقف رہی)۔ لیکن اس کے باوجود جب انہوں نے اپنی غلط روش کو نہ چھوڑا، بلکہ اپنی مخالفت میں اور متشدد ہوتے گئے تو پھر ان کی تباہی کا آغاز ہو گیا۔ بدر کی جنگ سے فتح مکہ تک کا عرصہ اس پروگرام کی دوسری کڑی تھی۔ یہ ہے مقصود ان آیات سے جن میں کہا گیا ہے کہ جب تک کسی بستی میں رسول نہیں بھیجا جاتا اس کی تباہی نہیں ہوتی۔ یعنی ان پر تباہی کی یہ تیسری شکل وارد نہیں ہوتی۔ وَ مَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّىٰ نَبْعَثَ رَسُولًا (۱۵/۱۷) ہم کسی بستی کو (اس طرح) تباہ نہیں کرتے جب تک وہاں اپنا پیغامبر نہ بھیج دیں۔ دوسری جگہ ہے۔ ذٰلِكَ اَنْ لَّمْ يَكُنْ رُسُلًا مِّنْكَ الْقُرٰی يَظْلِمُوْنَ اَهْلُهَا غٰفِلُوْنَ (۱۳۲/۶) یہ پیغام بر اس لئے بھیجے جاتے تھے کہ خدا کا قانون یہ ہے کہ کسی بستی کو (اس طرح) تباہ نہ کر دیا جائے کہ انہیں معلوم ہی نہ ہو کہ صحیح راہ کونسی ہے (۱۳۲/۶)۔ اسی اصول کے مطابق رسول اللہ سے کہا گیا کہ

وَاِنَّا اَهْلَكْنٰهُمْ بَعْدَ اَبٍ مِّنْ قَبْلِهِ لَقَالُوْا رَبَّنَا لَوْ لَا اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰیٰتِكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ نَّذِلَّ وَنَخْزٰی ۝ وَ نَحْزٰی ۝ مَثَلٌ مَّا تَرَبَّصُوْا فَاَنْتَرَبَصُوْا ۚ فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ اَصْحٰبُ الصِّرَاطِ السَّوِیِّ وَ مَنِ اهْتَدٰی ۝ (۱۳۵-۱۳۶/۲۶)

اگر ہم اس قوم کو تمہاری بعثت سے پہلے ہی تباہ کر دیتے تو ان کا یہ کہنا حتیٰ بجانب ہوتا کہ ہماری طرف کوئی پیغامبر کیوں نہ بھیجا تا کہ ہم تیرے قوانین کا اتباع کر لیتے اور اس طرح اس ذلت و خواری سے بچ جاتے۔ لہذا اے رسول! تم یہ بیانِ حقیقت کے بعد دیکھو کہ یہ لوگ کونسی روش اختیار کرتے ہیں۔ اس کے بعد بات واضح طور پر سامنے آجائے گی کہ کون غلط راستے پر چلتا رہتا ہے اور کون صحیح راہ اختیار کر لیتا ہے۔

رسول اس طرح دونوں راستوں کی وضاحت کرتا چلا جاتا ہے۔ اور بات کچھ ایسی مشکل نہیں ہوتی کہ سمجھ میں نہ آ سکے۔ لیکن چونکہ قوم کے صحیح روش اختیار کرنے سے اس طبقہ کے مفاد پر زبرد پڑتی ہے جو دوسروں کی محنت کی کمائی پر عیش کی زندگی بسر کرتے ہیں اس لئے وہ (یعنی مترفین) اس دعوت کی مخالفت کرتے ہیں۔ انہیں اپنی دولت کی افراط اور اپنے جتنے کی کثرت پر اس قدر ناز ہوتا ہے کہ وہ

حق و صداقت کی اس کمزوری جماعت کو خاطر ہی میں نہیں لاتے (۳۴/۲۵-۳۴)۔ وہ سمجھتے یہی ہیں کہ یہ تصادم محض طبعی قوتوں کا ہے اس لئے یہ بات ان کے تصور میں بھی نہیں آتی کہ ہم (اس قدر قوتوں کے مالک) اس کمزور جماعت کے ہاتھوں شکست کھا جائیں گے۔ وہ اپنی دولت کے نشہ میں بدست اور اپنے مفادات کے تحفظ کی جدوجہد میں مدہوش یہ سمجھ ہی نہیں پاتے۔ بلکہ یوں کہتے کہ ایسا سمجھنا ہی نہیں چاہئے کہ اس تصادم میں شکست و فتح کے معیار بدل گئے ہیں۔ اب صورت یہ ہو گئی ہے کہ

وَمَا أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ بِالَّتِي تُقَرِّبُكُمْ عِندَنَا زُلْفَىٰ إِلَّا مَنَ
وَعَمِلَ صَالِحًا ۖ فَاُولَٰئِكَ لَهُمْ جَزَاءُ الضَّعْفِ بِمَا عَمِلُوا وَهُمْ فِي
الْعُرْفِ أَوْنُونٌ ۝ وَالَّذِينَ يَسْعَوْنَ فِي آيَاتِنَا مُجْعِبِينَ ۚ أُولَٰئِكَ
فِي الْعَذَابِ مُخَضَّرُونَ ۝ (۳۴/۲۸-۳۴) نیز (۵۸/۱۷-۱۸)۔

فتح و کامرانی کا مدار مال و دولت کی فراوانی اور جتھ اور افراد خاندان کی کثرت پر نہیں۔ اس کا مدار اس پر ہے کہ خدا کے قوانین کی صداقت پر کس کا یقین محکم ہے اور کون ان کے مطابق اپنے اندر زندہ رہنے کی صلاحیت پیدا کر لیتا ہے، جو ایسا کرے گا اسے (عام اندازوں کے مقابلہ میں) دُگنی کامیابیاں حاصل ہوں گی۔ ان کے برعکس، جو لوگ قوانین خداوندی کی مخالفت کریں گے اور انہیں بے بس کر دینے کی سعی لا حاصل میں اپنی توانائیاں ضائع کریں گے، ان کے سامنے تباہی آن کھڑی ہوگی۔

قرآن کریم میں 'اقوام عالم کے سلسلہ میں جہاں هُوَ يُخَيِّئُ وَيُمِيتُ کا ذکر آیا ہے (۲۴/۸)۔ اس سے مراد یہی ہے کہ قوموں کی موت اور زندگی کا فیصلہ خدا کے قانونِ مکافات کے مطابق ہوتا ہے۔

یہ ہے قوموں کی تباہی کی تیسری شکل، یعنی غلط روش پر چلنے والی قوم کی تباہی، اس قوم کے ہاتھوں جو حق و صداقت کا نظام قائم کرنے کے لئے کارزارِ حیات میں آئے۔ اسے بھی خدا نے 'عذاب' سے تعبیر کیا ہے۔ جنگِ بدر میں قریش کی عبرت آموز شکست کے سلسلہ میں کہا کہ

ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ شَاتُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ ۚ وَمَنْ يُشَاقِقِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ
فَإِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ۝ ذَٰلِكُمْ فَذُوقُوا ۚ وَأَنَّ لِلْكَافِرِينَ

عَذَابُ النَّارِ ۝ (۸/۱۳-۱۴)

یہ اس لئے ہوا کہ یہ لوگ حق و صداقت پر مبنی نظام کے قیام کی مخالفت کرتے تھے اور یہ کچھ انہی کے ہاتھوں مختص نہیں ہو لوگ بھی ایسا کریں گے ان کا انجام ایسا ہی ہوگا۔۔۔ ان سے کہو کہ یہ ہے عذاب (تباہی) جس سے تمہیں متنبہ کیا جاتا تھا۔ سواب تم اس کا مزہ چکھو اور اپنی آنکھوں سے دیکھ لو کہ حق و صداقت کی مخالفت کرنے والوں پر کس طرح "عذاب النار" آتا ہے۔

ضمنیاً یہاں یہ بھی دیکھئے کہ "عذاب النار" یا جہنم کے متعلق عام تصویر یہ ہے کہ اس کا تعلق صرف آخری زندگی سے ہے۔ لیکن قرآن کریم کی رو سے جنت اور جہنم کا سلسلہ اس دنیا سے شروع ہو جاتا ہے۔ جو معاشرہ مستقل اقدار کے مطابق متشکل ہو جاتا ہے اس کی زندگی جنت بداہل ہوتی ہے جو اس کی مخالفت کرتے ہیں وہ جہنم کے عذاب میں ماخوذ ہوتے ہیں۔ یہی وہ جہنم ارضی ہے جس میں نااہل لیڈر قوموں کو دھکیل کر لے جاتے ہیں (۲۸-۱۴/۲۹)۔

ہاں! تو ہم کہہ رہے تھے کہ حق و صداقت کے مقابلہ میں قوم مخالفت کی شکست کو "خدا کا عذاب" کہا گیا ہے جو اس دنیا میں سامنے آ جاتا ہے۔ سورہ توبہ میں جماعت مومنین سے کہا گیا کہ

قَاتِلُوهُمْ يُعَذِّبُهُمُ اللَّهُ بِأَيْدِيكُمْ وَ يَخْزِيهِمْ وَ يَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ (۹/۴۴)

"تم ان کے ساتھ جنگ کرو خدا انہیں تمہارے ہاتھوں سے "عذاب" دے گا انہیں ذلیل و خوار کرے گا اور تمہیں ان پر کامیابی حاصل ہوگی۔" وَ ذَلِكَ جَزَاءُ الْكَافِرِينَ (۹/۲۶) اور جو لوگ بھی حق و صداقت کے نظام کی مخالفت میں جنگ پُر اترتے ہیں ان کا انجام ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔ صلح حدیبیہ کے وقت جماعت مومنین کو قریش کے خلاف جنگ کرنے سے روک دیا گیا تھا۔ کہا کہ یہ اس لئے تھا کہ مکہ میں کچھ مسلمان بھی بستے تھے۔ جنگ کی صورت میں وہ بھی مصیبت میں مبتلا ہو جاتے۔ قَدْ تَزَيَّلُوا لَعَذَابُ اللَّهِ الَّذِي يَنْ كَفَرُوا مِنْهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا (۴۸/۲۵) اگر یہ مسلمان وہاں نہ ہوتے تو پھر ان مخالفین کو "الم انگیز عذاب" کا مزہ چکھایا جاتا۔ (نیز ۵۹/۱۵)۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ یہ خیال کہ انسانی اعمال کا نتیجہ صرف آخری زندگی میں سامنے آتا ہے صحیح نہیں۔ آخری زندگی میں اعمال کے نتائج کا سامنے آنا اپنی جگہ برحق ہے۔ اس کی تفصیل آگے چل کر ہمارے سامنے آئے گی۔ لیکن اس دنیا میں بھی اعمال کے نتائج سامنے آ جاتے ہیں۔ یہ صحیح

نہیں کہ خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کا حیظہ اقتدار (JURISDICTION) صرف اخروی زندگی ہے اور دنیا اس کے دائرہ کار سے باہر ہے۔ خدا کے قوانین دنیا اور آخرت دونوں میں یکساں کار فرما ہیں، البتہ اعمال کے مشہود شکل میں سامنے آنے کے لئے (خود خدا کی طرف سے) کچھ ضوابط مقرر ہیں۔ ان ضوابط کے مطابق ایسے اعمال بھی ہیں جن کا نتیجہ اس دنیا میں سامنے آجاتا ہے۔ قوموں کا عروج و زوال اس کی بین مثال ہے۔

قوموں کی اجل

ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ قرآن کریم نے قوموں کی موت و حیات کے لئے بھی "خفت و نقل موازین" کا اصول بتایا ہے۔ اس اصول کے معنی یہ ہیں کہ جب تک کسی قوم کے تعمیری کاموں کا پلڑا بھاری رہتا ہے وہ قوم زندہ رہتی ہے۔ جب تخریبی امور کا پلڑا بھاری ہو جاتا ہے تو قوم پر تباہی مسلط ہو جاتی ہے۔ کبھی یہ تباہی وقتی ہوتی ہے جس میں ہنوز گنجائش ہوتی ہے کہ وہ قوم مزید تعمیری کاموں سے اس پلڑا کو جھکالے۔ لیکن جب اس قوم میں اس پلڑے کے جھکانے کی صلاحیت نہیں رہتی تو وہ ہلاک ہو جاتی ہے۔ اس وقفہ کو اس قوم کی اجل کہا جاتا ہے۔ یعنی اس کی زندگی کے عرصہ کو بھی اور جب اس کی ہلاکت کا وقت آپہنچے اسے بھی اس کی اجل سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ نہ اس سے پہلے وہ قوم ہلاک ہوتی ہے نہ اس کے بعد زندہ رہ سکتی ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن کریم نے اصولی طور پر بتا دیا کہ

بِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ ۖ إِذَا جَاءَ أَجْلُهُمْ فَلَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً
وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ ۝ (۱۰/۴۹)؛ (۴/۳۴)۔

ہر قوم کی زندگی کی ایک مدت ہوتی ہے۔ جب وہ مدت ختم ہو جاتی ہے تو پھر اس کے خاتمہ میں ایک ثانیہ کی بھی کمی بیشی نہیں ہو سکتی۔

"ایک مدت ہوتی ہے" سے یہ مراد نہیں کہ یہ بات پہلے سے مقدّر ہو چکی ہوتی ہے کہ فلاں قوم نے اتنا عرصہ تک زندہ رہنا ہے اور فلاں نے اتنا عرصہ۔ ہر قوم اپنی اجل آپ متعین کرتی ہے۔ اس کے لئے ایک قانون مقرر ہے بِكُلِّ أَجَلٍ كِتَابٌ (۱۳/۳۸)۔ يَمْحُوا اللَّهُ مَا يَشَاءُ و

ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دَلِيًّا قَتَلْتَهُمْ بَغْتَةً وَ هُمْ لَا يَشْعُرُونَ ۝ ایک دن وہ تباہی ان کے سامنے اچانک آن کھڑی ہوگی اور ان کی عقل و فکر میں بھی یہ بات نہیں آسکے گی کہ یہ آکس راستے سے گئی! اس کے بعد کہا (اور کس قدر لطیف انداز میں کہا) کہ يَسْتَعْجِلُوْا نَذْرًا ۝ یہ لوگ جلدی مچاتے ہیں کہ وہ تباہی آکیوں نہیں جاتی۔ اگر ان کی آنکھوں میں بصارت کے ساتھ بصیرت بھی ہوتی تو انہیں نظر آجاتا کہ اِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌ۬ بِالْكَافِرِيْنَ ۝ (۵۳۱-۲۹/۵۴) تباہی کا جہنم تو انہیں اس وقت بھی چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ لیکن یہ اسے دیکھ نہیں پاتے۔ جسے یہ تباہی کہہ کر پکارتے ہیں وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ وَ بُرِيْرَتِ الْجَحِيْمُ لَمَنْ يُّؤَي ۝ (۴۹/۳۶) یہی جہنم جو اس وقت انہیں دکھائی نہیں دیتا اس وقت محسوس شکل میں ان کے سامنے آجاتا ہے۔

السَّاعَةُ

جب کسی قوم پر اس قسم کے انقلاب کا وقت آجاتا ہے۔ (یعنی اس کی اجل ختم ہو کر تباہی اس کے سامنے نمودار ہو جاتی ہے) خواہ اس کی شکل کچھ بھی ہو (قرآن کریم اسے السَّاعَةُ سے تعبیر کرتا ہے۔ یعنی انقلاب کی گھڑی — ہمارے ہاں عام طور پر "السَّاعَةُ" سے مراد قیامت لی جاتی ہے) اور اس کا ترجمہ ہی قیامت کی گھڑی کیا جاتا ہے۔ لیکن قرآن کریم میں یہ اصطلاح ظہورِ ستارے کے وقت کے لئے آئی ہے، خواہ اس دنیا میں ہو یا بعد کی زندگی میں۔ چونکہ اس وقت ہم اعمال کے صرف انہی نتائج کا ذکر کر رہے ہیں جن کا ظہور اس دنیا میں ہو جاتا ہے۔ اس لئے سرِ دست السَّاعَةُ کے بھی صرف اسی گوشے کو سامنے لایا جائے گا جس کا تعلق اس دنیا میں "الانقلاب کی گھڑی" سے ہے۔

سورۃ جاثیہ میں ہے يَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ يُنْفَخُ السُّبُّطُونَ ۝ جب السَّاعَةُ سامنے آن کھڑی ہوگی تو جو لوگ حق کو چھوڑ کر باطل کی روش اختیار کئے ہوئے تھے وہ تباہ ہو جائیں گے۔ وَ تَرَى كُلَّ اُمَّةٍ جَاثِيَةً ۝ تَقَفَ تَوْاسٍ وَتٍ دِيَكْهُمُ كَاكُمُ بَاظِلٍ پُرَسْتِ ۝ اَوَمِمْ غُفْلُوْنَ كَالْبُحْبُكِ هُوَ اُوْىٰ ۝ اَمَمِ قُدْعٰى اِلٰى كِتٰهٰفَا ۝ بَرُوْمُ كُوَا سِ كَالْعَمٰلِنَامَةِ كِي طَرَفٍ بِلَا يَا جَا ۝ اَوَمِ كَا كَالْاَيُّوْمِ تَجْزُوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ (۲۴۱-۲۵/۲۸) اب تمہارے اعمال

ہے جب ان کی تخریبی کارروائیوں کا پڑا جھک جائے گا تو وہ انقلاب آجائے گا۔ وَمَا يُذِرُكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ قَرِيبٌ ۝ ہو سکتا ہے کہ وہ وقت قریب ہی ہو۔ يَسْتَعْجِلُ بِهَا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِهَا ۚ اس لئے جلدی وہی مچاتے ہیں جنہیں اس کے آنے کا یقین نہیں۔ وَ الَّذِينَ آمَنُوا مُشْفِقُونَ مِنْهَا وَ يَعْلَمُونَ أَنَّهَا آتِيَةٌ الْحَقُّ ط (۸۱-۱۷۲/۴۲) ان کے برعکس جو لوگ خدا کے قانونِ مکافات پر یقین رکھتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ وہ ایک حقیقت ہے جو واقع ہو کر رہے گی لیکن چونکہ انہیں اس کا بھی علم ہے کہ انقلابی کشمکش میں کس قدر جگرگداز تصادمات ہوتے ہیں، اس لئے وہ اس سے خائف بھی رہتے ہیں۔

دوسری جگہ کہا کہ انتظار کرنے کے لئے تو معلوم انہیں کتنے عرصہ تک انتظار کرنا پڑے لیکن جب وہ آئے گی تو بَعَثْنَا آتٰی (۱۶/۳۱) یعنی اس طرح اچانک کہ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ ہو کہ ان کی تباہی کا وقت آگیا ہے۔ سورہ یوسف کی ایک آیت سے مترشح ہوتا ہے کہ قوموں کی زندگی میں پہلے چھوٹے چھوٹے جھٹکے آتے رہتے ہیں تاکہ وہ ان سے عبرت لیں لیکن جب وہ اپنی اصلاح نہیں کرتے تو پھر آخر میں وہ انقلاب (السَّاعَةُ) آجاتا ہے جس سے ان کی داستانِ حیات کا آخری ورق الٹ جاتا ہے۔ (۱۲/۱۰۶)

سِيرُوفِي الْأَرْضِ

یہی ان قوموں کا عبرت انگیز انجام ہے جس کے متعلق قرآن کریم میں متعدد مقامات پر کہا گیا ہے کہ

أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۖ كَانُوا أَكْثَرَ مِنْهُمْ وَأَشَدَّ قُوَّةً وَ أَثَارًا فِي الْأَرْضِ فَمَا أَغْنَىٰ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ۝ (۴۰/۸۲)۔

کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں جو انہیں اقوامِ سابقہ کی تباہ شدہ بستیوں کے کھنڈرات سے نظر آجاتا کہ ان سے پہلے جو قومیں گزر چکی ہیں ان کا انجام کیا ہوا تھا؟ وہ تعداد میں ان سے زیادہ تھے اور قوت و شہمت اور وسائل و ذرائع میں بھی ان سے کہیں آگے۔ لیکن جب ان کی غلط روش کے نتائج کا وقت آیا تو یہ چیزیں ان کے کسی بھی کام نہ آسکیں۔

اس کے بعد کہا کہ یہ کوئی اتفاقی حادثات نہیں تھے۔ مُنذَرًا لِّلَّذِينَ كَانُوا فِي عِبَادَةٍ ۚ وَ

خَيْرَ هُنَالِكَ الْكَافِرُونَ ۝ (۳۰/۸۵) یہ تو خدا کا اٹل قانون ہے جو شروع سے اسی طرح چلا آ رہا ہے۔
دوسری جگہ ہے کہ

أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَتَكُونَ لَهُمْ قُلُوبٌ يَعْقِلُونَ بِهَا أَوْ آذَانٌ
يَسْمَعُونَ بِهَا ۖ فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلَكِنْ تَعْمَى الْقُلُوبُ
الَّتِي فِي الصُّدُورِ ۝ (۲۲/۴۶)

کیا یہ لوگ دنیا میں چلے پھرے نہیں تاکہ ان کھنڈرات کی اینٹوں پر منقوش عبرت آموزات سناؤ
کو دیکھ کر ان کے دیکھنے سننے اور سمجھنے سوچنے کی صلاحیتیں بیدار ہو جاتیں۔ انسان کے
چہرے کی آنکھیں تو طبعی طور پر کام کرتی رہتی ہیں لیکن دل کی آنکھیں جو اندھی ہو جائیں تو ان
میں بینائی پیدا کرنے کے یہی طریق ہیں۔

یہ ان کے انجام کو دیکھیں اور پھر اچھی طرح سمجھ لیں کہ یہ چیز کسی خاص زمانے اور خاص مقام سے مختص نہیں
وَلِلْكَافِرِينَ أَمْثَالُهَا ۝ (۴۴/۱۰)۔ دنیا میں جو لوگ جس زمانے میں بھی مستقل اقدار خداوندی سے انکار
کریں گے ان کا انجام ایسا ہی ہوگا۔

ان آیات سے یہ حقیقت آئینہ کی طرح سامنے آ جاتی ہے کہ اقوام کے اعمال کے نتائج اس دنیا میں
ان کے سامنے آ جاتے ہیں۔ اس سلسلہ میں آیات تو اور بھی بے شمار ہیں لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ ان کے درج کرنے
کی چنداں ضرورت نہیں۔ اس لئے ہمیں اب آگے بڑھ جانا چاہیئے۔



سوالِ باب

دنیا اور آخرت دونوں میں عذاب

دنیاوی زندگی میں ظہورِ نتائج کے تذکرہ کے بعد ہمیں اُخروی زندگی کی طرف آجانا چاہیے۔ مگر قرآن کریم میں ایسی آیات بھی ہیں جن میں دنیاوی اور اُخروی دونوں زندگیوں میں جزائے اعمال کا ذکر ہے۔ اس سلسلہ میں اتنی وضاحت ضروری ہے کہ (جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے) قرآن کریم اس دنیا کی زندگی کو بڑی اہمیت دیتا ہے اور اس کے سامان و متاع سے فائدہ اٹھانے کو ضروری قرار دیتا ہے لیکن وہ اس کے ساتھ یہ بھی کہتا ہے کہ جب کسی دنیاوی فائدہ اور مستقل قدر میں ٹکراؤ ہو جائے اور ان میں سے ایک ہی باقی رہ سکتا ہو، تو اس وقت دنیاوی مفاد کے مقابلہ میں مستقل قدر کے تحفظ کو ترجیح دینی چاہیے۔ اسے وہ ”مفادِ آخرت“ سے تعبیر کرتا ہے۔ یعنی عاجلہ مفاد کو قربان کر کے مستقبل کے مفاد کو حاصل کر لینا۔ اس مستقبل کی زندگی (حیاتِ اُخروی) کا تفصیلی تذکرہ آئندہ ابواب میں سامنے آئے گا۔ اس جگہ آپ صرف ان ہر دو اصطلاحات کا قرآنی مفہوم سامنے رکھ کر متعلقہ آیات کو دیکھئے۔

دنیا اور آخرت دونوں چاہنے والے

ہم اس سے پہلے ضمتا لکھ چکے ہیں کہ قرآن کریم کی رو سے انسان کی صحیح زندگی یہ ہے کہ اسے اس دنیا کی سرفرازیوں اور خوشگواریاں بھی حاصل ہوں اور مستقل اقدار سے ہم آہنگی کی وجہ سے آخرت کی زندگی کی سربلندیاں اور مرفہ الحالیاں بھی۔ ربطِ مضمون کی خاطر اس سلسلہ میں چند ایک

اور آیات کا سامنے لانا غیر از محل نہ ہوگا۔ سورۃ آل عمران میں ہے کہ جو جماعتیں حق و صداقت کی خاطر نہرو آزا ہوتی ہیں۔ فَإِنَّهُمْ اللَّهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْآخِرَةِ ۗ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ۝ (۳/۱۳۸) اللہ انہیں دنیاوی آسائشوں کا حصہ بھی دیتا ہے اور آخر روی زندگی کی نعمت کا حصہ بھی جو اول الذکر سے کہیں زیادہ اچھا ہوتا ہے۔ حسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کرنے والوں کو خدا پسند کرتا ہے۔ سورۃ اعراف میں حضرت موسیٰ کی یہ دعا مذکور ہے کہ وَ اَلْتُبْ لَنَا فِي هَذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَ فِي الْآخِرَةِ ۖ (۷/۱۵۶) ہمارے لئے اس دنیا کی خوشگواریاں بھی لکھ دے اور آخرت کی خوشگواریاں بھی۔ سورۃ ابراہیم میں ہے۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الَّذِيْ رَفَعْنَا لِحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِي الْآخِرَةِ ۚ (۱۴/۲۷) جو لوگ قوانین خداوندی کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں خدا انہیں اپنے محکم قانون حیات کی رو سے اس دنیا کی زندگی میں بھی ثبات و استحکام عطا کرتا ہے اور آخر کی زندگی میں بھی۔

سورۃ نمل میں ہے کہ مخالفین جماعتِ مومنین سے پوچھتے ہیں کہ تمہارے خدا نے جو ضابطہ حیات تمہیں عطا کیا ہے اس کے اتباع سے تمہیں ملے گا کیا؟ اس کے جواب میں کہا گیا کہ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً ۖ وَلَآ اَرْۤاُ الْآخِرَةَ خَيْرًا ۚ (۱۶/۳۰) اس کے اتباع سے اس دنیا کی خوشگواریاں بھی حاصل ہوں گی اور آخرت کی خوشگواریاں بھی۔ ذرا آگے چل کر مہاجرین کے متعلق کہا کہ لَنَبُوِّنَهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ۖ وَ الْآخِرَةُ الْآخِرَةُ ۚ اَكْبَرُ ۝ (۱۶/۴۱) انہیں اس دنیا میں بھی بڑا عمدہ ٹھکانہ ملے گا اور آخرت کے اجر کا تو پوچھنا ہی کیا۔ وہ اس سے کہیں زیادہ بڑا ہوگا۔

خدا نے جماعتِ مومنین کو ”اولیاء اللہ“ کہہ کر پکارا ہے۔ ان کی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ لَهُمْ الْبُشْرٰی فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِي الْآخِرَةِ۔ ان کے لئے دنیاوی زندگی میں بھی خوشگوار یوں کی نویدِ جانفر ہے اور آخروی زندگی میں بھی۔ اس کے بعد کہا کہ یہ کوئی ہنگامی بات نہیں کہ کبھی ایسا ہو گیا اور کبھی نہ ہوا۔ یہ خدا کا قانون ہے۔ لَا تَبْدِلُ نٰیْلَ لِّیْکَلٰتِ اللّٰہِ ۖ (۱۰/۶۴) اس کے قانون میں کوئی تبدیلی

لے واضح رہے کہ قرآن کریم کی رو سے ”اولیاء اللہ“ کا کوئی الگ گروہ نہیں۔ جماعتِ مومنین جو قوانین خداوندی کا اتباع کرتی ہے، اولیاء اللہ کہلاتی ہے۔

نہیں کر سکتا۔ ان کی زندگی اس قسم کی ہوگی کہ **وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهُیْ اَنْفُسُكُمْ وَ لَكُمْ فِيهَا مَا تَتَّعُونَ** ۵ (۳۱-۴۱/۲) وہ جو کچھ چاہیں گے ہوگا، جو کچھ مانگیں گے ملے گا۔ یہ دنیا اور آخرت دونوں میں خدا کی نصرت سے بہرہ یاب ہوں گے (۲۲/۱۵)۔ حضرات انبیائے کرامؑ تو جماعتِ مسلمین کے سرخیل ہوتے تھے اس لئے ان کی بھی اس دنیا کی زندگی سرفرازیوں کی زندگی ہوتی تھی۔ حضرت ابراہیمؑ کے متعلق فرمایا کہ **وَلَقَدْ اصْطَفَيْنَاهُ فِي الدُّنْيَا وَ اِنَّهُ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ** ۵ (۲/۱۳۰) ان کی اس دنیا کی زندگی بھی برگزیدگی کی زندگی تھی اور آخرت میں بھی ان کا شمار صالحین کے زمرے میں ہوگا۔ یہ دنیا میں برگزیدگی کی زندگی کیا تھی؟ اس کی تفسیر میں کہا کہ **فَقَدْ اَتَيْنَا اِلَ اِبْرٰهِيْمَ الْکِتٰبَ وَ الْحِکْمَةَ وَ اَتَيْنٰهُمْ مُّمْلَکًا عَظِيْمًا** ۵ (۴/۵۳) آل ابراہیمؑ کو ضابطہ حیات دیا گیا تھا اور اس کے ساتھ عظیم مملکت بھی۔ اسی کو **فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً** سے تعبیر کیا گیا ہے (۱۶/۱۲۲)۔ یہ اس دنیا میں ان کے اعمال کا اجر تھا (۲۹/۲۶)۔ حتیٰ کہ حضرت عیسیٰؑ جن کے متعلق اناجیل کا بیان ہے کہ انہوں نے (معاذ اللہ، معاذ اللہ) دنیا میں بڑی بے کسی و بے بسی اور ”ذلت و خواری“ کی زندگی بسر کی۔ ان کے متبعین بڑے فخر سے ایسا کہتے ہیں اور دنیا کے سامنے ان کی ایسی تصاویر پیش کرتے ہیں جن میں دکھایا جاتا ہے کہ ان کی ساری زندگی بے نوافیروں کی سی گذری اور عمر کے آخری لمحات میں یہودیوں اور رومی سپاہیوں نے ان سے سخت ہتک آمیز سلوک کیا۔ قرآن کریم ان کے متعلق بھی کہتا ہے کہ **یَہِیْطُ لَہٗ فِی الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ** (۳/۴۴) انہوں نے اس دنیا میں بھی نہایت باعزت زندگی بسر کی اور آخرت میں بھی وہ ایسے ہوں گے۔

متاعِ حیات (دنیاوی آسائشوں اور آرائشوں) سے بہرہ یاب ہونا تو اس کے نزدیک اتنا ضروری ہے کہ وہ ان سرمایہ دارانہ ذہنیت رکھنے والے لوگوں سے جو دولت سمیٹنے کی ہوس میں اتنا آگے بڑھ جاتے ہیں کہ (اور تو اور) خود اپنی ذات پر بھی چار پیسے خرچ نہیں کرتے، حسرت آمیز انداز میں کہتا ہے کہ بد نصیبو! تم نے اپنی آخرت کو تباہ کر ہی لی تھی، کم از کم دنیاوی زندگی ہی آرام سے گذار لی ہوئی! (۲۸/۷۷)۔

صرف دنیا طلبی

اس کے بعد ہمارے سامنے وہ لوگ آتے ہیں جن کا منہمٹائے زندگی صرف دنیا طلبی ہوتا ہے

اور وہ اسکی ہوس میں متقل اقدار خداوندی کو یکسر نظر انداز کر دیتے ہیں ان کے متعلق کہا کہ اُولَٰئِكَ الَّذِیْنَ اشْتَرَوْا الْحَیٰوَةَ الدُّنْیَا بِاَلْآخِرَةِ (۲/۸۶) یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے حیاتِ اخروی کے بدلے دنیاوی زندگی خرید لی ہے۔ (نیز ۴/۴۴) کہیں کہا کہ یہ لوگ حیاتِ اخروی کے مقابلہ میں دنیاوی زندگی کو زیادہ ترجیح دیتے ہیں (۱۴/۳ : ۱۶/۱۰۴ : ۴۹/۳۸ : ۱۶/۱۰۴ : ۸۴/۱۴) اور سورہ کہف میں کہا کہ ان کی ساری سعی و کاوش دنیاوی مفاد کے حصول میں ضائع ہو جاتی ہے (۱۸/۱۰۳) اس لئے کہ انہیں دنیاوی زندگی بڑی خوشنما بن کر دکھائی دیتی ہے (۲/۲۱۲)۔ یہ اس پر مطمئن ہو کر بیٹھ جاتے ہیں (۱۱/۴)۔ (جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے) انہیں ان کی سعی و کاوش کے بدلہ میں دنیاوی سامانِ زیست حاصل ہو جاتا ہے۔ لیکن مستقبل کی زندگی میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ مَا لَهُ فِی الْآخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ (۲/۱۳۳) : (۳/۴۶)۔ سورہ ہود میں ہے۔

مَنْ كَانَ یُرِیدُ الْحَیٰوَةَ الدُّنْیَا وَ زِیْنَتَهَا تُؤْتٰ اِلَیْهِمْ اَعْمَالُہُمْ فِیْہَا وَ هُمْ فِیْہَا لَا یُبْخَسُوْنَ ۝ اُولَٰئِكَ الَّذِیْنَ لَیْسَ لَہُمْ فِی الْآخِرَةِ اِلَّا النَّارُ ۖ وَ حَبِطَ مَا صَنَعُوا فِیْہَا وَ لَبِطُوْا مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ۝ (۱۱/۱۶ : ۱۵) (نیز ۲۰/۴۲)۔

جو شخص اس دنیا کا ساز و سامان اور آرائش و زیبائش چاہتا ہے اور اس کے لئے کام کرتا ہے تو اسے اس کے کام کا پورا پورا بدلہ مل جاتا ہے۔ اس میں ذرا بھی کمی نہیں کی جاتی۔ لیکن ان لوگوں کا مستقبل کی زندگی میں کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ یہاں کا سب کیا کر لیا وہاں رانگیاں چلا جاتا ہے۔

سورہ احقاف میں کہا گیا کہ یہ لوگ اخروی زندگی میں کہیں گے کہ ہمیں اس سے کچھ حصہ کیوں نہیں دیا جاتا تو اس کے جواب میں ان سے کہا جائے گا کہ تم نے اپنی سعی و کاوش کا مقصد دنیاوی مفادات کو قرار دیا تھا۔ وہ تمہیں مل گئے اور اس طرح تمہاری محنتوں کا حاصل وہیں ختم ہو گیا۔ اب اس میں سے کچھ باقی ہی نہیں رہا تو تمہیں ملے کیا؟ تم نے تو اپنا سارے کا سارا حصہ وہیں ختم کر لیا تھا۔ اب کیا مانگتے ہو؟ (۵۳/۲۹ : ۴۶/۲۰)۔ دنیاوی مفادات کے دروازے مومن و کافر سب کے لئے کھلے تھے۔ وہاں دونوں گرد ہوں کو ان کی سعی و کاوش کے تناسب سے حصہ مل گیا۔ اخروی زندگی کے لئے یہ انہی کے لئے مخصوص

میں جنہوں نے وہاں 'دنیاوی مفادات کے ساتھ ساتھ اُخروی زندگی کے مفاد کا بھی خیال رکھا تھا (۴/۳۲)۔ تم سے وہاں کہا جاتا تھا کہ تم صرف مفادِ عاجلہ ہی کیوں مانگے ہو۔ خدا کے ہاں سے مفادِ عاجلہ اور حیاتِ مستقبل کے مفادات دونوں مل سکتے ہیں۔ تم ان دونوں کے لئے کوشش کیوں نہیں کرتے؟ تمہیں بڑی وضاحت سے بتایا جاتا تھا کہ دنیاوی زیبائش و آرائش اور ساز و راقِ بڑے ہاذب ہیں۔ تم انہیں ضرور حاصل کرو۔ لیکن اس حقیقت کو نہ بھولو کہ مستقبل کی زندگی اس سے کہیں زیادہ گراں بہا ہے اس لئے اس کے ساتھ اسے بھی طلب کرو (۳/۱۳۱)۔ متاعِ حیات کے حصول کے ساتھ آخرت طلبی سے مراد یہ ہے کہ جب کبھی ایسا ہو کہ کسی دنیاوی مفاد اور مستقل قدر میں ٹکراؤ پیدا ہو جائے تو اس وقت تم دنیاوی متاع کو یہ کہہ کر چھوڑ دو کہ 'یہ حیاتِ اُخروی کے مقابلہ میں کوئی شے ہی نہیں۔ اس وقت تم یہ کہہ دو کہ

وَمَا هَذِهِ الْحَيَوةُ الدُّنْيَا إِلَّا لَهْوٌ وَ لَعِبٌ ۚ وَإِنَّ الدَّارَ الْآخِرَةَ
لَهِیَ الْحَيَوةُ ۚ مَن كَانُوا يَعْلَمُونَ (۴۲/۴۳ تا ۴۶/۳۹)

اس دنیا کا ساز و سامان بایں ہر کمش و جاذبیت، کھیل تماشے سے زیادہ کچھ حیثیت نہیں رکھتا۔ اس لئے کہ زندگی بھلانے کی مستحق تو اُخروی زندگی ہی ہے۔ وہ کونسا سمجھ دار آدمی ہے جو زندگی کو بیچ کر کھیل تماشے کا ٹکٹ خریدے گا؟

ان دونوں کے تقابل میں 'متاعِ حیات کی مثال برسات کی روئیدگی کی سی ہے جو چند دنوں تک لہلہانے کے بعد پڑ مردہ ہو کر خس و خاشاک کی طرح اڑ جاتی ہیں (۱۰/۲۴ تا ۵۴/۲۰)۔ اسی تقابل کو سامنے لانے کے لئے کہا کہ جنگِ احد میں ایک طرف مالِ غنیمت نگاہوں میں چمکا چوند پیدا کر رہا تھا اور دوسری طرف اپنے فرض کا تقاضا تھا کہ اپنا مقام نہ چھوڑا جائے۔ وہ "متاعِ دنیا" تھی 'یہ' متاعِ آخرت"۔ سو تم میں سے بعض پر مالِ غنیمت کی کشش غالب آگئی اور انہوں نے اپنی ڈلوٹی کا خیال نہ کرتے ہوئے اپنی پوزیشن چھوڑ دی (۳/۱۵۱)۔ ایسے تصادات کے وقت ترجیح متاعِ آخرت کو دینی چاہیئے۔ ورنہ عام حالات میں دنیاوی مفاد کے حصول کی نہ صرف اجازت ہوتی ہے بلکہ اس کے لئے سعی و کوشش کرنا مومنین کے فرائض میں داخل ہوتا ہے۔ (۹۲/۱۰)

لے اسی سلسلہ میں ان آیات کو بھی دیکھئے (۴/۷۷ تا ۴/۳۲ تا ۵۴/۱۹ تا ۹/۳۸ تا ۱۰/۷۰ تا ۱۳/۲۴ تا ۲۰/۱۲)۔
۲۸/۹۰ تا ۳۰/۷۰ تا ۴۲/۳۴۔

دنیا اور آخرت دونوں میں عذاب

اب ہمارے سامنے تیسرا گروہ آتا ہے جس کے متعلق کہا کہ انہیں دنیا اور آخرت دونوں میں عذاب ملتا ہے۔ ان میں ایک گروہ تو ان کا ہوتا ہے جو فطرت کی قوتوں کو مسخر کرنے کی طرف دھیان ہی نہیں دیتے اس لئے دنیا میں مغلسی اور محتاجی، ناداری اور لاچاری، بے کسی و بے بسی، محکومی و غلامی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہ گروہ بالعموم مذہب پرست لوگوں کا ہوتا ہے جنہیں اس فریب میں مبتلا رکھا جاتا ہے کہ دنیا اور اس کی جاذبتیں قابل نفرت ہیں۔ ان سے دور رہنا اللہ والوں کا شیوہ ہے۔ یہ دنیا کفار کے لئے ہے۔ خدا پرستوں کے حصے میں اگلی دنیا آتی ہے۔ دوسرا گروہ ان قوموں پر مشتمل ہوتا ہے جو عروج کے بعد قہر مذلت میں گر جاتی ہیں اور اس طرح محتاجی و محکومی کی زندگی بسر کرتی ہیں۔ یہ دونوں گروہ اس دنیا میں عذاب کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اور جن لوگوں کی اس دنیا کی زندگی عذاب کی ہو (اور وہ اسے دُور کرنے کو شش نہ کریں) ان کی آخری زندگی بھی عذاب کی ہوتی ہے۔ سورہ طہ میں ہے۔

وَمَنْ أَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنْكًا وَنَحْشُرُكَ يَوْمَ الْقِيَمَةِ آغْطٰی ۵ (۲۰/۱۲۳)۔

جو ہمارے قوانین سے اعراض برتنا ہے تو ہم اس کی روزی تنگ کر دیتے ہیں۔ (وہ اس دنیا میں بھی عذاب کی زندگی بسر کرتا ہے اور) قیامت میں بھی اسے اندھا اٹھائیں گے۔

دوسری جگہ ہے مَنْ كَانَ فِي هَذِهِ أَعْمٰی فَهُوَ فِي الْآخِرَةِ أَعْمٰی وَ أَصْلُ سَبِيلِهِ (۱۴/۷۲) جو اس دنیا میں اندھا ہے وہ آخرت میں بھی اندھا ہی رہے گا۔ بلکہ وہاں اس کی حالت یہاں سے بھی زیادہ گئی گذری ہوگی۔ اس لئے کہ عاقبت تو سنورتی ہی اس کی ہے جس نے کائنات کو سنوارنے میں کچھ حصہ لیا ہو جو اپنی اس زندگی کو سنوار نہیں سکا اس کی اخروی زندگی کس طرح سنوری ہوئی ہوگی۔

اس دنیا میں ”خدا کا عذاب“ کن شکلوں میں آتا ہے اس کی تفصیل تو طول طویل ہے لیکن قرآن کریم نے اسے دو لفظوں میں سمٹا دیا ہے جہاں کہا کہ قَدْ أَفْأَا اللَّهُ لِبَاسَ الْجُوعِ وَ الْحَوْثِ (۱۶/۱۱۲) ان لوگوں پر ”خوف اور بھوک“ کا عذاب طاری ہو جاتا ہے۔ خوف اور بھوک کا عذاب آپ نے دیکھا کہ مُشْرَکِینِ کریم لے ان دو بنیادی لفظوں میں عذاب کی ساری تفصیلات کو کس طرح سمٹا کر

رکھ دیا ہے۔ یہ ہے اس دنیا کا عذاب۔ اُخروی عذاب کی نوعیت کیسی ہوگی اسے اپنے مقام پر بیان کیا جائے گا۔ اس مقام پر صرف اتنا دیکھئے کہ جو لوگ اس دنیا میں عذاب میں مبتلا ہوں گے ان کی آخرت کی زندگی بھی عذاب کی ہوگی اور یہ خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کے عین مطابق ہوگا۔ سورۃ بقرہ میں ہے کہ جو لوگ غلط روش اختیار کریں گے ان کا انجام اس کے سوا کچھ نہیں ہوگا کہ *يَخْزِي فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَكُومَرُ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰى اَشَدِّ الْعَذَابِ* ۵ (۲/۸۵) دنیا میں زلت و رسوائی ان کے حصّہ میں آئے گی اور آخرت میں اس سے بھی زیادہ سخت عذاب میں مبتلا ہوں گے۔ (نیز ۱۱۴/۲ : ۵/۴۱ : ۲۲/۹ : ۲۹/۲۶)۔

سورۃ قلم میں غلط معاشی نظام کا نتیجہ تباہی اور بربادی بتانے کے بعد کہا کہ یہ تو اس دنیا کا عذاب تھا۔ *وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ* ۵ *كَاُوْلَا يَخْلُكُوْنَ* ۵ (۹۸/۳۳) اور آخرت کا عذاب اس سے بھی بڑا ہوگا۔ سورۃ مائدہ میں کہا گیا ہے کہ اسلامی مملکت کے باغیوں کو اس دنیا میں بھی ان کے جرم کی سزا ملے گی اور آخرت میں بھی (۵/۳۳)۔ (نیز دیکھئے ۲۲/۱۹ : ۲۲/۲۳)۔

حق و باطل کی کشمکش میں حق کے مخالفین کو جماعتِ مومنین کے ہاتھوں جو شکست ہوتی ہے اسے بھی ”عذابِ دنیا“ سے تعبیر کیا گیا ہے اور اس کے بعد ان کے لئے اُخروی عذاب کی بھی تصریح آئی ہے۔ مثلاً سورۃ توبہ میں اسلام کے مخالفین، کفار اور منافقین عرب کے خلاف جنگ کرنے کے احکام کے سلسلہ میں کہا گیا کہ اگر یہ لوگ اپنی مخالفانہ روش سے باز آجائیں تو ان کے لئے اچھا ہوگا۔ *وَ اِنْ يَتَوَلَّوْا يَعْذٰبُهُمُ اللّٰهُ عَذَابًا اَلِيْمًا فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ۚ وَ مَا لَهُمْ فِي الْاَرْضِ مِنْ دَلِيٍّ وَ لَا نَصِيْرٍ* ۵ (۹/۴۴) لیکن اگر یہ اس سے روگردانی کریں تو اللہ انہیں دنیا اور آخرت میں الم انگیز عذاب دیگا اور پھر دنیا میں ان کا کوئی دوست اور مددگار نہیں ہوگا۔ انہی کے متعلق آگے چل کر کہا ہے کہ انہیں دو مرتبہ عذاب دیا جائے گا اور پھر انہیں عذابِ عظیم کی طرف لوٹایا جائے گا (۹/۱۰۱)۔ سورۃ رعد میں ہے کہ ان کی تمام تدابیر ناکام ہو کر رہ جائیں گی اور ”انہیں دنیاوی زندگی میں بھی عذاب ملے گا اور آخرت کا عذاب اس سے بھی زیادہ شدید ہوگا“ (۱۳/۳۴)۔ سورۃ کہف میں ہے کہ ذوالقرنین نے قوم مخالف سے کہا کہ اگر وہ ظلم و استبداد سے باز نہیں آئے گی تو ہم اسے سزا دیں گے اور اس کے بعد وہ خدا کی طرف جائیں گے تو

انہیں عبرت انگیز سزا ملے گی (۱۸/۸۷)۔ سورۃ احزاب میں ہے کہ جو لوگ رسول اللہ (اور جماعتِ مومنین) کو اذیت پہنچاتے ہیں، ان کے لئے دنیا اور آخرت دونوں میں محرومی کی زندگی ہے (۳۳/۵۷)۔ مخالفینِ عرب کے متعلق کہا گیا کہ ان سے پہلے بھی مختلف اقوام نے انبیائے کرام کی دعوت کی تکذیب کی تھی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قَدْ أَفْلَحَ اللَّهُ الْخَزِيءُ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۚ وَ لَعَذَابُ الْآخِرَةِ الْكَبِيرُ ۚ كَوْكَأُوا يَعْلَمُونَ ۝ (۳۹/۲۶) اللہ نے ان پر دنیاوی زندگی میں ذلت و خواری کا عذاب وارد کر دیا اور آخرت کا عذاب اس سے کہیں بڑا ہو گا۔ اے کاش! یہ مخاطبین اس سے سبق سیکھتے۔ جب مدینہ کے یہودیوں (بنی نضیر) نے عہد شکنی کی، تو ان کے متعلق فیصلہ کیا گیا کہ انہیں جلا وطن کر دیا جائے۔ اس سلسلہ میں کہا کہ اگر ان کے لئے جلا وطنی کا فیصلہ نہ کیا جاتا تو لَعَذَابُهُمْ فِي الدُّنْيَا ۚ وَ لَعَذَابُ الْآخِرَةِ عَذَابُ النَّارِ (۵۹/۳) انہیں اس دنیا میں سخت سزا ملتی اور آخرت میں ان کے لئے جہنم کا عذاب ہوتا۔ ظاہر ہے کہ یہاں دنیاوی سزا سے مراد جنگ میں ہزیمت خوردگی ہے۔ دوسرے مقام پر بہ ہیئتِ مجموعی اصولی طور پر کہہ دیا کہ جو لوگ حق و صداقت کی مخالفت کرتے ہیں اور قانونِ مکافاتِ عمل پر یقین نہیں رکھتے اُولَئِكَ الَّذِينَ لَعَنُوهُمْ سَوَاءٌ الْعَذَابُ الَّذِي فِي الْآخِرَةِ هُمْ الْخَسِرُونَ ۝ (۲۷/۵) تو یہ وہ لوگ ہیں جنہیں دنیا میں بدترین عذاب ملے گا اور آخرت میں یہ سخت نقصان اٹھائیں گے۔ سورۃ سجدہ میں ہے وَلَنُذِيقَهُمْ مِنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰی دُونَ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ۝ (۳۲/۲۱) انہیں سب سے بڑے عذاب سے پہلے قریبی عذاب ملے گا۔ شاید یہ اس طرح صحیح روش کی طرف آجائیں۔ اس "قریبی عذاب" سے یا تو یہ مراد ہے کہ قوموں کی آخری تباہی سے پہلے ان کی بربادی کے بلکہ ہلکے آثار سامنے آتے ہیں تاکہ وہ ان سے عبرت حاصل کر کے سنبھل جائیں یا پھر عذابِ اکبر سے مراد اخروی زندگی کا عذاب ہے۔ اسی کو دوسرے مقام پر "عذاب فوق عذاب" سے تعبیر کیا گیا ہے (۱۸/۸۷)۔ وہ لوگ جنہیں اس دنیا میں بھی اپنے اعمال کی سزا مل جاتی ہے اور آخرت میں بھی سزا ملے گی، وہ ہیں جن کے متعلق کہا کہ اُولَئِكَ الَّذِينَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَ الْآخِرَةِ ۚ (۳/۲۱) یہ وہ ہیں کہ جن کے اعمال اس دنیا کی زندگی اور آخرت دونوں میں رانگاں گئے۔ یہ لوگ اس دنیا میں جہنم کی زندگی بسر کرتے ہیں اور آخرت میں بھی جہنم کی زندگی۔ ان کے برعکس جو لوگ صحیح روش اختیار کرتے ہیں ان کی اس دنیا کی زندگی بھی جنت کی ہوتی ہے اور آخرت کی زندگی بھی جنت کی۔ اس حقیقت

کو سورۃ فتح کی روایات میں نہایت وضاحت سے بیان کر دیا گیا ہے۔ اس سورہ میں مخالفین قریش کے ساتھ آخری تصادات کا ذکر ہے۔ اس سلسلہ میں کہا کہ یہ سب کچھ اس لئے کیا گیا ہے لَئِیۡلَیۡدُخِلَ الْمُؤْمِنِیۡنَ ۚ وَ الْمُؤْمِنٰتِ جَنَّٰتٍۭ تَجْرِیۡ مِنْ تَحْتِہَا ۚ اَلۡاُنۡهٰرُ خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَا ۚ وَ یُكْفَرُ عَنْہُمْ سَبَآتِہُمۡ ۚ وَ كَانَ ذٰلِكَ عِنۡدَ اللّٰهِ قَوۡرًا عَظِیۡمًا ؕ (۳۸/۵) تاکہ خدا مومن مردوں اور عورتوں کو اپنا جنت کی زندگی عطا کر دے۔ ظاہر ہے کہ یہ جنت کی زندگی اسی دنیا سے شروع ہو گئی تھی۔ اس کے برعکس ۚ یُعَذِّبُ الْمُنٰفِقِیۡنَ ۚ وَالْمُنٰفِقٰتِ ۚ وَ الْمَشْرِکِیۡنَ ۚ وَ الْمَشْرِکٰتِ ۚ الظَّآلِمِیۡنَ ۚ بِاللّٰهِ ظَنّٰ السَّوۡءَ ۚ عَلَیۡہِمۡ ذَاۤیۡرَةُ السَّوۡءِ ۚ وَ غَضَبَ اللّٰهُ عَلَیۡہِمۡ ۚ وَ لَعَنَہُمۡ ۚ وَ اَعَدَّ لَہُمۡ جَہَنَّمَ ۚ وَ سَاۡءَتْ مَوَٰسِلُہَا ؕ (۳۸/۶) اور تاکہ خدا منافق مردوں اور عورتوں کو جو خدا کے متعلق عجیب عجیب بدگمانیوں کا شکار ہیں 'عذاب دے۔ اب یہ لوگ اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی مصیبتوں کے چکر میں پھنس گئے یہ زندگی کی خوشگوار یوں سے محروم رہ جائیں گے۔ ان کی مخالفانہ جدوجہد کی کھیتیاں جل کر راکھ کا ڈھیر ہو جائیں گی اور تباہیوں اور بربادیوں کا جہنم ان کے لئے تیار ہو گا۔ ان کا ٹھکانہ بہت بُرا ہو گا۔

یَغْفِرُ لِمَنۡ یَّشَآءُ وَ یُعَذِّبُ مَنۡ یَّشَآءُ

اس باب کو ختم کرنے سے پہلے ایک اہم نکتہ کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے۔ قرآن کریم کی بعض آیات میں ہے کہ یَغْفِرُ لِمَنۡ یَّشَآءُ ۚ وَ یُعَذِّبُ مَنۡ یَّشَآءُ ؕ (۳۸/۵۱) نیز (۲/۲۸۴) (۳/۱۲۸)۔ ان (اور اس قسم کی دیگر آیات) کا ترجمہ (عام طور پر) یہ کیا جاتا ہے کہ "خدا جسے چاہتا ہے عذاب دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے بخش دیتا ہے"۔ یعنی اس کے ہاں جزا اور سزا، عذاب و مغفرت کے لئے کوئی قاعدہ، قانون یا اصول و معیار مقرر نہیں۔ یہ سب اس کی مرضی پر منحصر ہے۔ جسے چاہا عذاب میں بکڑ لیا، جسے چاہا چھوڑ دیا۔

اس سوال کا تعلق نظریہ تقدیر سے ہے جو اس وقت ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ لیکن اتنا تو واضح ہے کہ ان آیات کا یہ مفہوم شرعی تعلیم کے یکسر خلاف ہیں۔ آپ دیکھ چکے ہیں کہ قرآن کی ساری

۱۔ مسئلہ تقدیر کے متعلق میں شرح و بسط سے اپنی دیگر تصانیف میں لکھ چکا ہوں۔ بالخصوص اس خطاب میں جس کا عنوان ہے "خدا کی مرضی" اور اب "کتاب التقدير" تو اس موضوع پر خود کفیل تصنیف ہے۔

تعلیم، قانونِ مکافاتِ عمل کے محور کے گرد گردش کرتی ہے۔ لہذا "مَنْ يَشَاءُ" کے یہ معنی ہو نہیں سکتے کہ عذاب و مغفرت محض خدا کی مرضی پر منحصر ہے۔ ان آیات کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ خدا نے عذاب و مغفرت (تباہی سے حفاظت) کے لئے اصول و قوانین مقرر کر دیئے ہیں۔ سو جس کا جی چاہے ان سے انحراف کر کے اپنے لئے تباہی خرید لے اور جو چاہے ان کی نگہداشت سے سامانِ حفاظت حاصل کر لے۔ لیکن اگر اس پر اصرار کیا جائے کہ ان آیات میں "مَنْ يَشَاءُ" کا فاعل خدا ہی ہے تو اس صورت میں بھی ان آیات کا مفہوم یہ ہوگا کہ عذاب و مغفرت کا تعلق خدا کے "قانونِ مشیت" سے ہے اور اس کا قانونِ مشیت یہ ہے کہ ہے۔

گندم از گندم بروید، جو ز جو

از مکافاتِ عمل عنافل مشو

خود قرآن کریم کی بعض آیات میں بھی اس کی وضاحت کر دی گئی ہے کہ قانونِ مشیت درحقیقت قانونِ مکافات ہی کا دوسرا نام ہے۔ مثلاً سورۃ مائدہ میں ہے کہ یہود و نصاریٰ کہتے ہیں کہ ہم خدا کی چاہیبتی اولاد ہیں۔ اس کے بعد ہے کہ ان سے پوچھو کہ اگر تم خدا کی ایسی چاہیبتی اولاد ہو تو قُلُوبُكُمْ بِعَذَابِكُمْ بَئْذُنُكُمْ (۵/۱۸) تو وہ تمہیں تمہارے جرم کے بدلے میں سزا کیوں دیتا ہے؟ اور اس کے بعد ہے۔ يَخْفَرُ لِمَنْ يَشَاءُ وَ يُعَذِّبُ مَنْ يَشَاءُ (۵/۱۸)۔ اب ظاہر ہے کہ اگر اس آیت کا مطلب یہی ہو کہ وہ جسے چاہتا ہے عذاب دے دیتا ہے تو پہلے جو کہا گیا ہے کہ "يُعَذِّبُكُمْ بَئْذُنُكُمْ" (تمہیں تمہارے جرم کی وجہ سے سزا ملتی ہے) تو دونوں آیات ایک دوسرے کی مخالف ہو جائیں گی۔ لہذا اس آیت کا یہ مفہوم درست نہیں۔

اور اس باب میں سورۃ نسا کی وہ آیت تو گویا قولِ فیصل کا حکم رکھتی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ مَا يَفْعَلُ اللَّهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَ اَمَنْتُمْ (۴/۱۳۴) اگر تم قوانینِ خداوندی کی صدا پر ایمان لے آؤ اور سپاس گزار بنو، تو خدا نے تمہیں عذاب دے کر کیا لینا ہے! سزا تو تمہارے اپنے اعمال کا نتیجہ ہوتی ہے۔

(۱) افراد یا اقوام کی حالت، ان کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہوتی ہے۔ جب تک کوئی قوم اپنی حالت نہیں بدلتی خدا اس کی حالت کو نہیں بدلتا (۵۳/۸؛ ۱۱/۱۳)۔

(۲) انسانی اعمال کا ظہور نتائج، اس دنیا میں بھی ہوتا ہے اور اخروی زندگی میں بھی، جنت اور جہنم کی زندگی یہیں سے شروع ہو جاتی ہے اور مرنے کے بعد تک ساتھ جاتی ہے۔

دنیاوی زندگی میں ظہور نتائج کی ماجریات ہمارے سامنے آچکیں۔ اب ہم اخروی زندگی کی طرف بڑھتے ہیں۔



گیارہواں باب

ثواب و نجات

ہمارے ہاں عام طور پر عذاب کے مقابلہ میں ثواب کا لفظ بولا جاتا ہے۔ عذاب سے مراد لی جاتی ہے گناہوں کی سزا اور ثواب سے نیکیوں کی جزا۔

لفظ ثواب کا مادہ (ث۔ و۔ ب) ہے۔ اس کے بنیادی معنی ہوتے ہیں کسی چیز کا واپس مل جانا۔ ثاب الماء کے معنی یہ ہیں کہ جس قدر پانی نکلا تھا اتنا ہی اور آگیا۔ ثاب جسمہ کے معنی ہیں بیماری کے بعد اس کا جسم پھر سے اصلی حالت پر آگیا۔ یعنی جس قدر توانائی ضائع ہوئی تھی وہ واپس آگئی۔

آپ جو کام بھی کرتے ہیں اس میں آپ کا کچھ صرف ہوتا ہے۔ روپیہ پیسہ نہ بھی صرف ہو تو بھی آپ کا وقت اور توانائی صرف ہوتی ہے۔ اگر وہ کام قاعدے کے مطابق کیا گیا ہے تو جس قدر آپ کا صرف ہوا ہے وہ واپس مل جائے گا۔ اسے آپ کے عمل کا ثواب کہا جائے گا۔ اسے کاروباری زبان میں (RETURN)

کہیں گے اور قانونِ مکافاتِ عمل کی رو سے اس کا مطلب انسان کے اعمال کا فطری نتیجہ ہوگا۔ اس لئے یہ لفظ قرآن کریم میں ”عمل کے بدلے“ کے معنوں میں بھی آیا ہے۔ مثلاً هَلْ يُؤْتِي الْكُفَّارُ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ۝ (۸۳/۳۶) کفار کو وہی کچھ ملے گا جو انہوں نے کیا ہوگا۔ (نیز ۳/۱۵۲)۔ ان معانی میں بعض مقامات پر مَثُوبَةٌ کا لفظ بھی آیا ہے (۵/۴۰، ۲/۱۰۳)۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ انسانی اعمال کا نتیجہ اس دنیا میں بھی برآمد ہوتا ہے اور آخرت میں بھی۔ اس دنیا میں حسنِ عمل کا نتیجہ دنیاوی زندگی کی خوشحالی اور خوش بختی سرفرازی و سر بلندی

دولت و ثروت، حکومت و اقتدار کی شکل میں سامنے آتا ہے اور ان اعمال کا جو اثر انسانی ذات پر مرتب ہوتا ہے اس کا نتیجہ اخروی زندگی میں نمودار ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے قرآن کریم میں ”ثواب الدنیا“ اور ”ثواب الاخرت“ کی اصطلاحات آئی ہیں۔ لہذا ہم نے اگر دیکھنا ہو کہ جو کچھ ہم کرتے ہیں وہ کارِ ثواب (ثواب کا کام) ہے یا نہیں تو اس کے لئے دیکھنا یہ چاہیئے کہ ان اعمال کا درخشندہ نتیجہ اس زندگی میں مرتب ہو رہا ہے یا نہیں۔ یعنی ثواب کسی ذہنی تصویر یا نظری عقیدہ کا نام نہیں جو محسوس طور پر سامنے نہ آ سکے۔ یہ دنیاوی زندگی کی خوشگوار یوں کا نام ہے اور اس کے بعد اخروی زندگی کی سرفرازیوں کا۔ سورہ آل عمران میں ہے:

وَمَنْ يَرْزُقْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُفُوتُهُ مِنْهَا ۖ وَمَنْ يَرْزُقْ ثَوَابَ
الْآخِرَةِ نُفُوتُهُ مِنْهَا ۖ (۳۱/۳۳)

جو دنیاوی زندگی کا ثواب چاہتا ہے اسے وہ مل جاتا ہے۔ جو آخرت کا ثواب چاہتا ہے اسے وہ دے دیا جاتا ہے۔

اس کے یہ معنی نہیں کہ جو آخرت کا ثواب چاہتا ہے اسے دنیاوی زندگی میں ثواب نہیں ملتا۔ آخرت کا ثواب چاہنے والے کو اس دنیا کا ثواب بھی ملتا ہے اور آخرت کا بھی۔

مَنْ كَانَ يُرِيدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا فَيَحْضِرْ اِلٰهَ ثَوَابِ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ
مَنْ كَانَ يُرِيدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا فَيَحْضِرْ اِلٰهَ ثَوَابِ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ (۳۱/۳۳)

جو دنیا کا ثواب چاہتا ہے (اس سے کہہ دو کہ) خدا کے ہاں دنیا کا ثواب بھی ہے اور آخرت کا بھی۔

یعنی جو لوگ قوانین طبعی کے مطابق محنت کرتے ہیں، لیکن مستقل اقدار خداوندی کی پرواہ نہیں کرتے، انہیں دنیاوی مفاد تو حاصل ہو جاتے ہیں لیکن اخروی زندگی میں ان کا کچھ حصہ نہیں ہوتا۔ لیکن جو قوانین طبعی اور مستقل اقدار دونوں کی نگہداشت کرتے ہیں، انہیں دنیا اور آخرت دونوں میں ثواب ملتا ہے اور یہی مومنین کا شعار ہے۔ اس قسم کے (دنیا اور آخرت کے) ثواب کو ”باقیات الصالحات“ کہہ کر پکارا گیا ہے جو ثواب کی بہترین شکل ہے (۱۸/۲۶ تا ۱۹/۷۶)۔ اسی لئے کہا کہ ”جو ثواب اللہ کے ہاں سے ملے“ وہ بہترین ہوتا ہے (۲۸/۸۰)۔ ثواب تو ہر طرح کا ”اللہ ہی کے ہاں سے“ ملتا ہے۔ یعنی اس کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق کام کے نتائج۔ لیکن قرآنی مفہوم کے مطابق ”اللہ کے ہاں سے بہترین ثواب“ ملنے سے مراد ہے، ایسا ثواب جس سے انسان کی دنیا بھی سنور جائے اور آخرت بھی۔ اس لئے کہا کہ ”خدا بہترین ثواب

دینے والا اور بہترین انجام مرتب کرنے والا ہے“ (۱۸/۴۴)۔ اس قسم کا ثواب 'ہجرت'، جہاد اور نظام خداوندی کے قیام و استحکام کے لئے 'مصائب و مشکلات برداشت کرنے سے ملتا ہے (۳/۱۹۴)۔ یعنی حق و باطل کی کشمکش میں اگر جنگ کی نوبت آجائے تو اس میں ثابت قدم رہنے سے (۱۲۶-۱۳۴/۳)۔ اس سے اس دنیا میں بھی جنتی معاشرہ قائم ہوتا ہے اور آخرت میں دارالخلد بھی۔ اسی لئے (سورہ کہف میں) جنت کی نعمت۔ سرفرازیوں کی علامات (سونے کے کنگن)، حریر و اطلس کے ملبوسات، تخت حکومت وغیرہ کے تذکرہ کے بعد کہا نَعْمَ الثَّوَابُ ۝ وَ حَسُنَتْ مُرْتَفَقًا ۝ (۱۸/۳۱)۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ جو کچھ آپ کو اس دنیا میں ملے (ثَوَابٌ اَلْ دُّنْيَا) اس میں سے تو آپ اس دنیا میں کسی اور کو بھی کچھ دے سکتے ہیں۔ لیکن آپ کے حسنِ عمل کا جو نتیجہ آپ کی ذات پر مرتب ہوتا ہے (ثوابِ الآخرت) اسے کسی دوسرے کی طرف منتقل کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لہذا یہ جو ہمارے ہاں "ایصالِ ثواب" کا عقیدہ (یا رسم) ہے۔ یعنی کچھ پڑھ کر یا نذر نیا دے کر اس کا ثواب 'مردے کو پہنچانے کا عقیدہ'۔ تو یہ تصور قرآن کے خلاف ہے۔ مرنے والا جس حالت میں اپنی ذات کو لے کر یہاں سے گیا ہے اس میں کوئی دوسرا کسی قسم کی تبدیلی نہیں پیدا کر سکتا۔ نہ اس دنیا میں، نہ مرنے کے بعد مرنے والے کو جو کچھ ملے گا اس کے اپنے اعمال کے نتیجے میں ملے گا۔ یہاں والے اس کے لئے کچھ نہیں کر سکتے۔ حتیٰ کہ اس کے لئے دعائے خیر بھی صرف ہماری نیک آرزوؤں کا اظہار ہوتا ہے (جو ہر مومن کے دل میں دوسرے مومن کے لئے ہونی چاہئیں)۔ اس سے دعا کرنے والوں کو تو ایک نفسیاتی فائدہ (ثواب) ہو جاتا ہے لیکن مردے تک یہ ثواب نہیں پہنچتا۔ البتہ اگر زندہ انسان کے لئے نیک آرزوؤں کا اظہار کیا جائے تو اس سے اسے ایک قسم کی نفسیاتی تقویت مل جاتی ہے۔ مردے کی صورت میں اس کا بھی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ جیسا کہ آگے چل کر بتایا جائے گا 'مردوں کا اس دنیا سے کوئی تعلق ہی نہیں رہتا۔

(۱)

نجات

ثواب کے ساتھ ہی دوسرا تصور ہمارے سامنے نجات کا آتا ہے۔ آپ کسی اہل مذہب سے

پوچھئے کہ وہ مذہبی احکام کی پابندی کیوں کرتا ہے۔ وہ اس قدر مشقتیں کیوں اٹھاتا ہے۔ اتنی صعوبات برداشت کیوں کرتا ہے۔ اس قدر پُر محن ریاضتوں میں اپنی جان کیوں گھلاتا ہے۔ ان سب کا ایک ہی جواب ہوگا اور وہ یہ کہ اس سے مقصد یہ ہے کہ اس کی کسی طرح نجات ہو جائے۔ نجات۔ مکتی (SALVATION) نروان۔ سب ایک ہی تصور کے مختلف نام ہیں۔ ان میں قدر مشترک یا بنیادی مفروضہ یہ ہے کہ انسان دنیا میں کسی مصیبت میں پھنسا ہوا ہے۔ اس مصیبت سے چھٹکارا حاصل کرنا اس کا مقصود زندگی ہے اسی کے لئے وہ اس قدر (مذہبی) مشقتیں اٹھاتا ہے۔ اس ضمن میں:-

(۱) عیسائیت کا تصور یہ ہے کہ ہر انسانی بچہ اپنے اولیں ماں باپ (آدم و حوا) کے گناہ کا بوجھ اپنی پیٹھ پر لا دے دنیا میں آتا ہے۔ اس کا مقصد حیات یہ ہے کہ کسی طرح اس گناہ کی آلائش سے نجات حاصل کر لے۔ اس کا ذریعہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ حضرت مسیحؑ کے کفارہ پر ایمان لائے۔

(۲) ہندوؤں کا عقیدہ یہ ہے کہ ہر انسان اپنے پچھلے جنم کے گناہوں کی سزا بھگتنے کے لئے جنم لیتا ہے۔ ان گناہوں کے بوجھ سے مکتی حاصل کرنا مقصد زندگی ہے اور یہ مذہب کی تجویز کردہ مشقتوں ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔

(۳) بدھ مت (اور اس کے ساتھ جین مت) والوں کا عقیدہ یہ ہے کہ انسان اس دنیا میں اپنی آرزوؤں اور خواہشوں کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے آتا ہے۔ جب تک وہ اس قدر ترک آرزو نہیں کرتا کہ آرزو کا خیال تک بھوم اس کے دل میں نہ آئے اس وقت تک اسے نروان (مکمل سکون) حاصل نہیں ہو سکتا۔ یہ نروان فنائے خویش سے حاصل ہوگا۔ مذہبی صعوبات سے ہی مقصود ہے۔

(۴) ویدانت (ہندو فلسفہ یا تصوف) کی رو سے یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ انسان کی روح (آتما) خدا کی روح (پرماتما) کا ایک جزو ہے۔ یہ روح اپنی اصل سے جدا ہو کر مادی دلدل میں پھنس گئی ہے۔ اس دلدل سے چھٹکارا حاصل کر کے اس جزو کا اپنی اصل سے مل جانا مقصود حیات ہے اور یہ دھرم کی جائزہ مشقتوں کے بغیر ممکن نہیں۔ یہی تصور ہمارے تصوف نے ویدانت سے مستعار لیا اور انسانی روح کے "واصل بالحق" ہو جانے (حق کے ساتھ مل جانے) کو حاصل مراد قرار دیا جو تصوف کی پُر از صعوبات ریاضتوں کے بغیر ممکن نہیں۔

یہ ہے مذاہبِ عالم کے نزدیک انسانی زندگی کا مقصود۔ یعنی انسان دنیا میں آکر جس مصیبت میں پھنس

گیا ہے اس سے چھٹکارا حاصل کرنا۔ ہمارے اہل طریقت (ارباب تصوف) تو بے حد ہی عقیدہ رکھتے ہیں لیکن اہل شریعت یہ کہتے ہیں کہ انسان دنیا میں آکر جو گناہ کرتا ہے اس سے اس کا دامن آلودہ ہو جاتا ہے۔ اس کے لئے اسے جہنم کی سزا بھگتنی پڑے گی۔ اس سزا سے نجات حاصل کرنا مذہب کا مقصود ہے۔

آپ نے دیکھا کہ نجات کے ان تمام تصورات میں کس طرح وہ بنیادی مفروضہ مشترک ہے کہ انسان کسی مصیبت میں پھنسا ہوا ہے۔ اس مصیبت سے چھٹکارا حاصل کرنا مذہب کا حاصل ہے۔

قرآن کریم نے مذہب کے اس بنیادی مفروضہ ہی کو ختم کر دیا۔ اس نے کہا کہ ہر انسانی بچہ ایک سفید لوح (CLEAN SLATE) لے کر دنیا میں آتا ہے۔ اسے قدرت کی طرف سے کچھ صلاحیتیں ملتی ہیں۔ اگر وہ

ان صلاحیتوں کی مناسب نشوونما کر لیتا ہے تو اس کی اس دنیا کی زندگی بھی خوشحالیوں اور سرفرازیوں کی زندگی ہو جاتی ہے اور مرنے کے بعد وہ زندگی کی موجودہ سطح سے بلند سطح کی زندگی بسر کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ جو ایسا نہیں کرتا اس کی صلاحیتیں دب کر رہ جاتی ہیں اور وہ زندگی کے مزید ارتقائی مراحل طے کرنے کے قابل نہیں رہتا۔ ان صلاحیتوں کی نشوونما کے لئے ضروری ہے کہ انسان فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے ان کے حاصل کو مستقل اقدار خداوندی کے مطابق صرف کرے۔

اس سے آپ نے دیکھا کہ قرآن کریم کی رو سے انسانی زندگی کا مقصد کچھ حاصل کر کے، موجودہ زندگی کو زیادہ حسین بنانا اور بلند سطح پر لے جانا ہے۔ کسی مصیبت سے چھٹکارا حاصل کرنا نہیں۔ اس میں "نجات" سے مراد زندگی کی خطرناک گھاٹیوں سے محفوظ رہ کر اگلی منزل تک پہنچنا ہے۔ نہ کہ کسی ایسی مصیبت سے چھٹکارا حاصل کرنا جس میں انسان پہلے سے گرفتار ہو۔ یہ وجہ ہے کہ قرآن کریم نے انسانی تگ و تاز کا مقصد "فوز" (ACHIEVEMENT) بتایا ہے۔ نجات (SALVATION) نہیں قرار دیا۔ تفصیل اس اجمال کی آپ کو آئندہ ابواب میں ملے گی۔



بارصواں باب

آخر کا تصور

جیسا کہ آپ نے گذشتہ صفحات میں دیکھا ہے، دین کی بنیاد قانونِ مکافاتِ عمل پر ہے اور قانونِ مکافاتِ عمل پر یقین کا فطری اور لازمی نتیجہ ایمان بالآخرت ہے۔ اس سلسلہ میں لفظِ آخرت کا صحیح مفہوم سمجھ لینا ضروری ہے۔

’اٰخِرُ‘ (جس کا موٹا اٰخِرَةُ ہے) ایسی چیز کو کہتے ہیں جو کسی سلسلہ کی آخری کڑی ہو اور اس کے بعد جو کڑی آئے وہ پہلی کڑیوں جیسی نہ ہو۔ لہذا، ’آخرت‘ کسی ایک سلسلہ کے اختتام اور اس سے متصل دوسرے سلسلہ کے آغاز کا نام ہوگا۔ اس شرط کے ساتھ کہ یہ دوسرا سلسلہ پہلے سلسلہ سے مختلف ہو۔ اسی جہت سے لفظ ’اٰخِرُ‘ (خار کے زبر کے ساتھ) ہر اس چیز کے لئے بولا جائے گا جو دیگر اشیاء سے مختلف ہو۔

(۲) تاخِرُ تقدیر کی بھی ضد ہے۔ تقدیم کے معنی ہوتے ہیں، پہلے واقع ہونا۔ لہذا، ’تاخِرُ‘ کے معنی ہوں گے، ’بعد میں واقع ہونا‘۔ اسی لحاظ سے قرآنِ کریم میں مستقدمین کے مقابلہ میں مستأخِرین آیا ہے (۱۵/۲۴)۔ مستقدمین، جو پہلے جا چکے ہوں اور متأخِرین، جو لوگ ان کے بعد آئیں۔ مستقبل میں آنے والی نسلیں۔

(۳) نیز قرآنِ کریم میں ’اٰخِرُ‘ عاجلہ کے مقابلہ میں بھی آیا ہے۔ عاجلہ کے معنی ہیں پیش پا

افتادہ مفاد۔ اور اٰخِرُ کے معنی ہوں گے مستقبل کے مفادات (۱۸ — ۱۹/۱۶) (۶۴/۲۶)۔

(۴) دنیا کے مقابلہ میں آخرت، قرآن کریم میں عام طور پر آیا ہے۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ قرآن کریم کی رُو سے

۱۔ ایک فرد کی زندگی میں 'امروز کے مقابلہ میں فردا' اس کا مستقبل (یعنی آخرت) ہے۔

۲۔ ایک قوم کی زندگی میں، اس کی موجودہ نسل کے بعد آنے والی نسلیں آخرت میں داخل ہیں۔

۳۔ نوعِ انسانی کے لئے آنے والی انسانیت، آخرت ہے۔۔۔ اور

۴۔ ان سب کے لئے 'مرنے کے بعد' دوسری زندگی حیاتِ آخرت ہے۔

لہٰذا، جب جماعتِ مومنین کے متعلق کہا گیا کہ وہ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں تو اس سے مراد یہ ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں!

(۱) جو مفادِ عاجلہ کے مقابلہ میں مستقبل کو ترجیح دیتے ہیں۔

(۲) ان میں ہر فرد اپنے مستقبل کی فکر کرتا ہے۔

(۳) من حیث القوم، یہ اپنے مفادات، ہی کا تحفظ نہیں کرتے بلکہ اپنی آنے والی نسلوں کے مفاد کا بھی خیال رکھتے ہیں۔

(۴) ان کے پیش نظر مفادِ خویش ہی نہیں ہوتا، یہ پوری نوعِ انسانی کے مفاد کا تحفظ چاہتے

ہیں۔۔۔ اور

(۵) ان کے سامنے صرف اسی دنیا کی زندگی کا مفاد نہیں۔ یہ مرنے کے بعد کی زندگی پر بھی ایمان

رکھتے ہیں۔ اس لئے قانونِ مکافاتِ عمل پر ان کا یقین محکم ہوتا ہے۔ یعنی یہ کہ انسانی اعمال کے نتائج

کا ظہور اسی دنیا تک محدود نہیں، اس کا سلسلہ مرنے کے بعد بھی جاری رہے گا۔

بنابریں، جب قرآن کریم میں آخرت کا ذکر آئے گا تو اس سے مراد صرف مرنے کے بعد کی زندگی نہیں

ہوگی۔ ہمیں دیکھنا ہوگا کہ اس موقع پر مذکورہ صدِ مفاہیم میں سے کونسا مفہوم مقصود ہے۔

(۶) اسی طرح، جہاں قرآن کریم نے "حیاتِ بعد الممات" کا ذکر کیا ہے، وہاں اس سے مراد ایک

فرد کی مرنے کے بعد کی زندگی ہی نہیں۔ وہ قوموں کے زوال کو ان کی موت سے تعبیر کرتا ہے اور جو

قویں زوال کے بعد پھر عروج حاصل کر لیتی ہیں، وہ اسے حیاتِ بعد الممات کہہ کر پکارتا ہے۔ نیز

اس نے ان افراد کو بھی "مردہ" کہا ہے جو عقل و فکر سے کام نہیں لیتے۔

(۷) اسی سلسلہ میں قرآنِ کریم میں چند ایک اور اصطلاحات بھی آتی ہیں۔ مثلاً قیامت، بعث، حشر وغیرہ۔ ان کا تعلق بھی صرف مرنے کے بعد کی زندگی سے نہیں۔ یہ اصطلاحات اس دنیا میں قوموں پر وارد ہونے والے بعض حوادث کے لئے بھی استعمال ہوتی ہیں۔

آئندہ صفحات میں یہ اصطلاحات و شرائط مذکورہ صدر معانی میں سامنے آئیں گی۔



ایمان بالآخرت

سورۃ بقرہ کے شروع میں 'مومنین کی خصوصیات میں یہ بھی آیا ہے کہ وَ بِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ (۲) وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔ یہی لوگ اس راستے پر چلتے ہیں جو انہیں ان کی منزل مقصود تک پہنچا دے گا اور انہی کی سعی و عمل کی کھیتیاں پروان چڑھیں گی۔ (نیز ۲۴/۳)؛ (۴) - (۳۱/۵)۔

(۲) قرآن کریم کی رُو سے ایمان کے پانچ اجزاء ہیں۔ یعنی ان پانچ باتوں پر ایمان لانے سے ایک شخص جماعت مومنین کے حلقہ میں داخل ہو جاتا ہے۔ یعنی اللہ، انبیاء، کتب، ملائکہ اور آخرت پر ایمان سے (۲/۱۷۷) اور ان میں سے کسی ایک کے انکار سے وہ اس سوسائٹی کی رکنیت سے خارج ہو جاتا ہے (۱۳۴)۔ (۳) کہیں ان پانچ اجزاء کے بجائے صرف اللہ اور آخرت پر ایمان کا ذکر آیا ہے۔ مثلاً (۲/۲۳۲)؛

(۳/۱۱۳)؛ (۳/۳۹۱)؛ (۴/۵۹۱)؛ (۵/۶۹۱)؛ (۹/۹۹۱)۔

کہیں اللہ اور آخرت کے ساتھ ایمان بالکتب کا بھی ذکر آیا ہے (۴/۱۶۲)۔

(۴) بعض مقامات پر صرف آخرت سے انکار کا ذکر ہے۔ مثلاً (۴/۱۱۳)؛ (۶/۱۵۱)۔ یہ اہل جہنم ہیں (۷/۴۵)۔

ان کا سب کیا کرایا غارت ہو جاتا ہے (۷/۱۴۷)؛ (۱۴/۲۲۲)؛ (۱۶/۶۰)؛ (۱۷/۱۰)؛ (۳۴/۸)۔

(۵) قرآنی تعلیم سے وہی نفع اندوز ہو سکتا ہے جو آخرت پر ایمان رکھتا ہو (۱۷/۴۵)۔ جو آخرت پر ایمان نہ

رکھے وہ صراطِ مستقیم پر نہیں آ سکتا (۲۳/۷۴)؛ (۲۷/۸)۔

(۶) اللہ اور آخرت پر ایمان کا عملی مظاہرہ 'قوامین خداوندی پر عمل کرنے اور کرنے سے ہوتا ہے (۲۴/۲)۔

(۷) علم و بصیرت کی رُو سے حیاتِ آخرت کی بات سمجھ میں آ سکتی ہے (۲۷/۶۶)؛ (۲/۲۱۹)۔

(۸) ابلیس انہی کو بہکا سکتا ہے جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے (۲۴/۲۱)۔

- (۹) حیاتِ آخرت پر ایمان نہ رکھنے والے مشرک ہیں (۷۱-۴)؛ (۵۳/۲۷)۔
- (۱۰) انبیاء کا اسوہ انہی کے لئے چراغِ راہ بن سکتا ہے جو آخرت پر ایمان رکھیں (۶۰/۶)۔
- (۱۱) جو آخرت پر ایمان نہ رکھیں ان سے دوستداری کے تعلقات نہیں رکھے جاسکتے (۶۰/۱۳)۔
- (۱۲) جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتا اس کے نیک اعمال درحقیقت لوگوں کو دکھانے کے لئے ہوتے ہیں (۲/۲۶۴)۔ اس لئے کہ قانونِ مکافاتِ عمل پر ایمان نہ ہو تو اعمال کا جذبہ محرکہ شہرت حاصل کرنے کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟
- (۱۳) منافق زبان سے آخرت کا اقرار کرتا ہے، دل سے اس کی صداقت پر یقین نہیں رکھتا (۲/۸)۔
- (۱۴) حیاتِ آخرت پر ایمان رکھنے والا بلند مقصد کے حصول کے لئے جان تک ہنسی خوشی دے دیتا ہے۔ وہ ایسے مواقع کی انتظار میں رہتا ہے جب وہ جان دے کر کسی مستقل قدر کو محفوظ رکھ سکے۔ یہود ایسا نہیں کر سکتے تھے (۲/۹۴)۔
- (۱۵) مستقبل کی تباہی کا احساس رکھنے والا صحیح راستے پر چل سکتا ہے (۱۱/۱۰۳)؛ (۷۴/۵۳)۔
- (۱۶) مفادِ جاہلہ کو پسند کرنے والے آخرت کو نظر انداز کر دینے والے ہیں (۲۰-۲۱)؛ (۷۵/۲۷)؛ (۷۶/۲۷)۔
- (۱۷) اجرِ آخرت زیادہ نفع بخش ہوتا ہے (۱۱۲/۵۷)۔
- (۱۸) نظامِ خداوندی سے وابستگی سے دنیا کے مفاد بھی حاصل ہو سکتے ہیں اور آخرت کے بھی۔ یہ ہے مراد اس سے کہ آخرت و اولیٰ دونوں خدا کے لئے ہیں (۵۳/۲۵) اور مستقبل کی حمد و ستائش تو بہر کیف اسی کے لئے ہے (۳۴/۱)۔ قوانینِ خداوندی سے انکار کرنے والوں کی اولیٰ اور آخری دونوں تباہ ہو جاتے ہیں (۷۹/۲۵)۔
- (۱۹) جو جانتیں آسمانی انقلاب کی داعی ہوں انہیں اپنے پروگرام کے ابتدائی مراحل میں بڑی جانگداز مشقتوں سے گزرنا پڑتا ہے لیکن آخر الامر کامیابی انہی کے لئے ہوتی ہے (۹۳/۶)۔



قیامت

قیامت کے معنی ہیں کھڑا ہونا۔ اس لفظ کے ساتھ (۱۴) کے اضافہ سے قیامت بنا ہے جس کے معنی ہیں یکبارگی کھڑا ہو جانا۔

قیامت کے متعلق عام طور پر تصور یہ ہے کہ یہ دنیا آخر الامر فنا ہو جائے گی۔ اس سے قیامت آجائے گی۔ جہاں تک دنیا (اسی نہیں بلکہ جملہ کائنات) کا تعلق ہے اس کی مدت کتنی ہی طول طویل کیوں نہ ہو اسے آخر الامر ختم ہونا ہے۔ قرآن کریم میں اس کی وضاحت موجود ہے کہ اسے ایک مدت معینہ کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ کُلُّ یَجْزِی (۱۳۱/۲۹) مَسْحٰتٌ (۱۳۵/۱۳) یہ کارگاہ کائنات ایک معینہ مدت کے لئے سرگرم عمل ہے۔ (نیز ۳۱/۲۹ و ۵۱/۳۹)۔ دوسری جگہ ہے۔ مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَیْنَهُمَا اِلَّا بِاَلْحَقِّ سلسلہ ارض و سما کو ہم نے بالحق پیدا کیا ہے۔ ”بالحق“ بڑی جامع اصطلاح ہے۔ اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ اس کی تخلیق یونہی اتفاقیہ طور پر وجود میں نہیں آگئی۔ یہ ایک اسکیم کے مطابق ایک خاص مقصد کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ اس کی تخلیق (PURPOSEFUL) ہے۔ نیز اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ یہ (افلاطونی فلسفہ کے مطابق) سایہ بدیوار نہیں۔ سراب نہیں۔ (یا دیدانت کے فلسفہ کے مطابق) مایا (فریب) نہیں۔ ایشور کا خواب نہیں۔ پرماتما کی رچائی ہوئی لیل (کھیل) نہیں۔ یہ فی الواقعہ موجود ہے اس کا وجود ایک حقیقتہ ثابتہ (REALITY) ہے۔ لیکن یہ پیدا کی گئی ہے۔ وَ اَجَلٌ مُّسَمَّی (۳۱/۲۹) ایک مدت معینہ کے لئے۔ اسے خدا کی طرح ابدیت حاصل نہیں۔ ایک وقت ایسا تھا جب اس کا کوئی وجود نہ تھا۔ خدا نے اسے پیدا کیا ایک مدت معینہ کے لئے۔ اس کے بعد یہ ختم ہو جائے گی۔ قرآن کریم میں متعدد ایسی آیات ہیں کہ ان کے الفاظ کے اگر (مجازی نہیں) حقیقی معانی لئے جائیں تو ان سے ایک ایسا منظر سامنے

آتا ہے جس میں آسمانی کرتے ایک دوسرے سے ٹکرا کر پاش پاش ہوتے ہیں۔ چاند اور سورج بے نور ہو جاتے ہیں۔ پہاڑ دھنسی ہوئی روئی کے گالوں کی طرح اڑتے دکھائی دیتے ہیں۔ زمین ریت کے ذروں کی طرح غبارِ راہ بنی ہوئی نظر آتی ہے۔ سمندر متلاطم ہیں۔ فضا میں ہمہ تن جگولے بن رہی ہیں۔ غرضیکہ نظم و نسق کائنات اس طرح درہم برہم ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ کائنات لَمْ یَكُنْ شَيْئًا مِّثْلَ كُودًا۔ گویا یہ کوئی قابل ذکر شے ہی نہ تھی۔

لیکن اس کا تعلق قانونِ مکافاتِ عمل سے نہیں۔ قانونِ مکافاتِ عمل کا تعلق تو اس سے ہے کہ یہ کائنات باقی رہے یا نہ رہے۔ لیکن انسان مرنے کے بعد بھی باقی رہے۔ لہذا قیامت کا تعلق نظم و نسق کائنات کے درہم برہم ہونے سے نہیں۔ اس کا تعلق ”انسان کے اٹھ کھڑے ہونے“ سے ہے۔

اور ”انسان کے اٹھ کھڑے ہونے“ کا مقام یہ دنیا بھی ہے اور مرنے کے بعد کی زندگی بھی۔ اس دنیا میں مستبد قوتیں کمزوروں اور ناتوانوں کو اس طرح دبائے رکھتی ہیں کہ ان میں اٹھنے کی سکت تو ایک طرف اس کا تصور تک پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن رفتہ رفتہ حالات بدلتے چلتے جلتے ہیں تا آنکہ ایک ہنگامہ خیر انقلاب آتا ہے اور یہی دہی ہوئی انسانیت ’یکبارگی اٹھ کھڑی ہو جاتی ہے۔ یہ اس دنیا میں قیامت ہے۔ یہ انقلاب اگر اس جماعت کے ہاتھوں رونما ہو جو مستقل اقدارِ خداوندی کی حامل ہے تو معاشرہ میں ظلم و استبداد کی جگہ عدل و احسان کا دور دورہ ہوگا۔ ہر ایک کو اس کی محنت کا پورا پورا صلہ ملے گا، کوئی اسے غصب نہیں کر سکے گا۔ ہر معاملہ کا فیصلہ قانونِ خداوندی کے مطابق ہوگا۔ حق باطل پر غالب آجائے گا۔ اس قسم کا انقلاب ’نبی اکرم اور حضور کے رفقاء کے ہاتھوں اس قدر نمایاں طور پر رونما ہوا تھا جس کی نظیر تاریخ کے صفحات پر نہیں ملتی۔ قرآن کریم نے اسے بھی القیامت سے تعبیر کیا ہے۔ اس کی نمایاں خصوصیات حسب ذیل بتاتی ہیں۔

(۱) رسول اللہ کی بعثت کے وقت دنیا میں ’دینِ خداوندی اپنی اصلی اور حقیقی شکل میں کہیں باقی نہیں رہا تھا۔ وہ ہر جگہ مذہب سے بدل گیا تھا۔ نتیجہ اس کا یہ تھا کہ تمام اہل مذاہب کا یہ دعویٰ تھا کہ ان کے پاس خدائی تعلیم اپنی حقیقی شکل میں موجود ہے لیکن ایک کی تعلیم دوسرے سے ملتی نہیں تھی۔ ان میں باہمی اختلافات موجود تھے۔ لیکن چونکہ ان کے پاس کوئی ایسا معیار نہیں تھا جو حق و باطل

میں امتیاز کر کے 'ان نزاعات کو مٹا سکے۔ اس لئے ان میں باہمی جنگ و جدل جاری رہتی تھی۔ قرآن کریم نے کہا کہ اس انقلاب سے ایک معیار سامنے آجائے گا جس سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ کونسی تعلیم فی الواقعہ خدا کی دی ہوئی ہے اور کونسی انسانوں کی خود ساختہ۔ اس طرح ان کے باہمی اختلافات دُور ہو جائیں گے۔ چنانچہ مختلف مذاہب عالم کے پیروں (یہود۔ نصاریٰ۔ مجوس وغیرہ) نے جب اسلام قبول کیا تو ان کے اختلافات مٹ گئے۔ قرآن کریم میں جہاں یہ آیا ہے کہ "يَوْمَ الْقِيَامَةِ" میں ان کے اختلافات مٹ جائیں گے تو اس سے یہی مراد ہے۔ (عربی زبان اور قرآن کریم کی رُو سے 'یَوْم' کے معنی دن ہی نہیں ہوتے۔ اس سے مراد 'زمانہ' دور عہد بھی ہوتے ہیں۔ اس نسبت سے 'یَوْم الْقِيَامَةِ' سے مراد ہوگا وہ انقلابی دور جو قرآن کی رُو سے سامنے آیا تھا۔ اس انقلابی دور میں 'ان اہل مذاہب' کے اختلافات رفع ہوئے تھے۔ ورنہ اگر ان آیات میں 'قیامت' سے مراد 'مرلے کے بعد کا زمانہ' لیا جائے تو وہاں اختلافات مٹنے سے کیا حاصل ہوگا؟ ان تصریحات کی روشنی میں قرآن کریم کی متعلقہ آیات پر غور کیا جائے تو حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ مثلاً سورۃ بقرہ میں ہے کہ یہودی 'نصاری' کے متعلق کہتے ہیں کہ ان کے پاس سچا دین نہیں! اور یہی بات نصاریٰ یہود کے متعلق کہتے ہیں اور دونوں کی دلیل یہ ہے کہ ان کے پاس خدا کی کتابیں ہیں۔ (اور یہ کتابیں ایک دوسرے سے مختلف ہیں) سو بحالات موجودہ ان کے باہمی اختلافات کے مٹ جانے کی کوئی صورت نہیں۔ لیکن فَاللّٰهُ يَخْضَعُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِيْهَا كَاذُوۡا۟ فِيْهِ يَخْتَلِفُوۡنَ ۝۵ (۲/۱۱۳) اس دورِ قیامت (انقلابی زمانہ) میں خدا ان کے اختلافات کا فیصلہ کر دے گا۔ یعنی خدا کی کتاب (قرآن) بتا دے گی کہ خدا کی صحیح تعلیم کیا ہے۔ سورۃ آل عمران میں ہے کہ حضرت عیسیٰ کے انجام کے متعلق یہود اور نصاریٰ میں سخت اختلاف ہے۔ اس انقلابی دور (القیامۃ) کے آنے تک 'عیسیٰ' اس باب میں یہودیوں پر غالب رہیں گے۔ لیکن اس کے بعد اِلٰی مَرْجِعُكُمْ فَاحْكُمْ بَيْنَكُمْ فِيْهَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوۡنَ ۝۵ (۳/۵۴) یہ لوگ ہماری طرف رجوع کریں گے تو ان کے اختلافات کا فیصلہ ہو جائے گا۔ سورۃ نسا میں منافقین کے متعلق کہا گیا ہے کہ مخالفین کے ساتھ جماعت مومنین کی جنگ کی صورت میں 'ان (منافقین) کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ یہ انتظار میں بیٹھے رہتے ہیں کہ دیکھیں کس کا پلڑا بھاری ہوتا ہے۔ پھر جب تمہیں فتح حاصل ہوتی ہے تو یہ جھٹ سے آگے بڑھ آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم تمہارے ساتھ تھے۔ اس کے بعد ہے فَاللّٰهُ يَخْضَعُ بَيْنَكُمْ

يَوْمَ الْقِيَمَةِ ۝ (۴/۱۴۱) حقوڑا سا وقت اور انتظار کرو۔ اس انقلاب کو پوری طرح مسلط ہو لے دو۔ منافقین کی منافقت کا پردہ چاک ہو جائے گا اور تمام امور کا دو ٹوک فیصلہ ہو جائے گا۔ اس وقت حقیقت بھی سامنے آ جائے گی کہ وَ لَنْ يَجْعَلَ اللَّهُ لِلْكَافِرِينَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ سَبِيلًا ۝ (۴/۱۴۱) یہ ہو نہیں سکتا کہ قوانین خداوندی کے خلاف جانے والے ان لوگوں پر غالب آ جائیں جو ان کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں۔

مختلف اہل مذاہب میں ایک طرف 'خود ایک ہی مذہب کے پیروؤں میں بے حد اختلاف پیدا ہو چکے تھے۔ ان اختلافات کے متعلق بھی کہا کہ اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِي بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ فِيمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۝ (۱۰/۹۳) اس انقلابی دور میں خدا ان کے باہمی اختلافات کا بھی فیصلہ کر دے گا۔
انیز ۱۶/۱۳۳ : ۲۵/۳۲ : ۳۹/۳ : ۱۴/۱۳۵۔

مختلف اہل مذاہب ہی 'مختلف اقوامِ عالم کے متعلق کہا کہ ان کی بھی اس وقت یہ کیفیت ہے کہ ایک قوم 'دوسری قوم پر چڑھ دوڑتی ہے' اور ہر قوم کا دعوئے یہ ہوتا ہے کہ وہ حق پر ہے۔ اس امر کا فیصلہ کرنے کے لئے بھی اس وقت کوئی خارجی معیار موجود نہیں۔ لیکن اب یَوْمَ الْقِيَمَةِ میں ان امور کی بھی وضاحت ہو جائے گی (۱۶/۹۲)۔ اس انقلاب کی حامل قوم کو شہداءِ عَلَى النَّاسِ بنایا گیا ہے۔ یہ تمام اقوامِ عالم کے اعمال کی نگراں ہو گی اور جو قوم اپنی حد سے تجاوز کرے گی اسے وہیں روک دیا کرے گی۔ اس طرح کوئی قوم ناحق دوسری قوم پر چڑھ نہیں دوڑا کرے گی۔

جیسا کہ پہلے بھی کہا گیا ہے، قرآن کریم نے کہا ہے کہ مختلف اہل مذاہب کے اختلافات کا فیصلہ یَوْمَ الْقِيَمَةِ میں ہو جائے گا۔ سورۃ حج میں یہ بات یہود، نصاریٰ، صائبین، مجوسی اور مشرکین کا تصریحاً ذکر کرتے ہوئے کہی گئی ہے۔ ان کا نام لے کر کہا گیا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ (۲۲/۱۴) اللہ ان میں 'اس انقلابی دور میں فیصلہ کر دے گا۔ حتیٰ کہ اس دور میں اس امر کا بھی فیصلہ ہو جائے گا کہ انسان کو دوستداری کے تعلقات کن لوگوں سے وابستہ رکھنے چاہئیں۔ قرآن کریم نے رنگانوں اور بے گانوں کے لئے ایک بنیادی معیار مقرر کیا۔ اور وہ یہ کہ جو لوگ ایمان (آئینہ یلوجی) میں مشترک ہوں 'وہ اپنے ہیں' خواہ ان میں اور کوئی باہمی رشتہ ہو یا نہ ہو۔ اور جو اس میں اشتراک نہ رکھیں 'وہ بے گانے ہیں' خواہ وہ ماں باپ، بہن بھائی، حتیٰ کہ میاں بیوی بھی کیوں

نہ ہوں۔ اس انقلاب نے انسان اور انسان میں یہ حد فاصل اور خط امتیاز قائم کر دیا۔ اس سلسلہ میں قرآن کریم نے تفصیلی ہدایت دینے کے بعد کہا کہ لَنْ تَنْفَعَكُم اَرْحَامُكُمْ وَلَا اَوْلَادُكُمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ ۚ يَفْصِلُ بَيْنَكُمْ (۹۰/۳۱)۔ اب اس دور میں 'جب یگانگت کا معیار ہی بدل گیا ہے۔ کسی کا بیٹا یا باپ ہونا' کچھ فائدہ نہیں دے سکے گا۔ خدا کے قانون کی رُو سے ان میں بُعد اور فصل ہو جائے گا۔ اس سے واضح ہے کہ یہاں یوم القیامۃ سے مراد یہی انقلابی دور ہے جو قرآن کی رُو سے وجود میں آیا تھا۔

سورہ بقرہ میں ایک مقام پر ہے کہ قانونِ خداوندی سے انکار کرنے والوں کی نگاہ میں 'دنیاوی زندگی کی متاع بڑی جاذب بن جاتی ہے اور وہ جماعتِ مومنین کا مذاق اڑاتے ہیں لیکن وَالَّذِينَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ ۗ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ (۲/۲۱۲) "جو لوگ قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرتے ہیں" وہ "یوم القیامت" میں ان لوگوں پر فائق ہوں گے۔ خدا اپنے قانونِ مشیت کے مطابق 'لوگوں کے اندازوں سے بھی بڑھ کر سامانِ زیست عطا کرتا ہے'۔ اس میں شبہ نہیں کہ مرنے کے بعد کی زندگی میں 'تقویٰ شعار لوگ منکرینِ قوانینِ خداوندی کے مقابلہ میں یقیناً بلند مدارج کے حامل ہوں گے لیکن اس آیت میں ایسا نظر آتا ہے کہ یہ فوقیت اس دنیا کی ہے۔ اس لئے یہاں بھی یوم القیامۃ سے مراد وہ دور ہے جو اس آسمانی انقلاب کے بعد رونما ہونے والا تھا۔ قرآن کریم میں اور بھی ایسی آیات ہیں جن سے مترشح ہوتا ہے کہ ان میں قیامت سے مراد وہ انقلاب ہے جس میں ایک جماعت 'غلط نظام کو الٹنے کے لئے یکبارگی اٹھ کھڑی ہو۔ سورہ تطفیف میں اس انقلاب کو 'یوم عظیم' کہہ کر اس کی تشریح ان الفاظ میں کی گئی ہے کہ يَوْمَ يَقُومُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ (۸۳/۶) جس دن (یا جس زمانے میں) لوگ خدا کے عالمگیر نظامِ ربوبیت کو قائم کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوں گے۔

اب ہم ان آیات کی طرف آتے ہیں جن سے مستنبط ہوتا ہے کہ قیامت سے مراد مرنے کے بعد کی زندگی میں اٹھ کھڑے ہونا بھی ہے۔ سورہ بقرہ میں ہے کہ جن لوگوں کی یہ کیفیت ہو کہ وہ ضابطہ خداوندی کے ایک حصے پر ایمان رکھیں اور دوسرے حصے سے انکار کریں فَمَّا جَزَاءُ مَنْ يَفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيَمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰی اَسْفٰی

الْعَذَابُ (۲/۸۵) ان کا انجام اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ ان کی دنیاوی زندگی ذلت و رسوائی کی ہو اور قیامت کے دن انہیں سخت ترین عذاب کی طرف لے جایا جائے۔ یہاں 'قیامت' کا لفظ حیوۃ الدنیا کے مقابلہ میں آیا ہے۔ اسی طرح متعدد اور آیات میں بھی 'دنیا کے مقابلہ میں قیامت' کا لفظ آیا ہے۔ مثلاً (۴/۳۲)؛ (۱۱/۴۰)؛ (۱۱/۹۸)۔ بعض آیات میں قیامت کا لفظ بلا امتیاز و تخصیص آیا ہے لیکن وہاں بھی قرآن سے مستنبط ہوتا ہے کہ اس سے مراد مرنے کے بعد کی زندگی ہے مثلاً (۱۱) قیامت کے دن خدا "ان سے بات نہیں کرے گا" اور نہ ہی انہیں سامانِ نشوونما ملے گا۔ ان کے لئے الم انگیز عذاب ہو گا (۲/۱۶۴)؛ (۳/۷۶)۔

(۲) قیامت کے دن خیانت کرنے والوں کی خیانت سامنے آجائے گی اور ہر ایک کو اس کے کئے کا پورا پورا بدلہ ملے گا اور کسی پر ظلم و زیادتی نہیں ہوگی (۳/۱۶۰)۔ [معاشرہ کا یہ انداز اس انقلاب کے بعد بھی ہو سکتا ہے جو متقل اقدار کی حامل جماعت کے ہاتھوں عمل میں آئے۔ اس قسم کی دیگر آیات میں بھی یہ مفہوم لیا جاسکتا ہے]۔

(۳) مومنین کی دعائیں کہ ہمیں قیامت کے دن ذلت نصیب نہ ہو (۳/۱۹۳)۔

(۴) قیامت کے دن حضرت عیسیٰ اپنی امت کے خلاف شہادت دیں گے کہ انہوں نے ایسے ایسے عقائد وضع کر لئے تھے جنہیں (حضرت عیسیٰ نے) انہیں نہیں دیا تھا (۴/۱۵۹)۔

(۵) قیامت کے دن مال و دولت وے کر عذاب سے چھٹکارا نہیں مل سکے گا (۵/۳۶)۔

(۶) خدا تمہیں یوم القیامت میں جمع کرے گا (۱۲/۱۲)؛ (۴۵/۲۶)۔ اس کی وضاحت "حشر" کے

عنوان میں کی جائے گی۔ (نیز ۱۴/۹۷)۔

(۷) جو لوگ اپنے جی سے کچھ باتیں وضع کرتے ہیں اور انہیں منسوب کر دیتے ہیں خدا کی طرف

یوم القیامت کے متعلق ان کا کیا خیال ہے؟ (۱۰/۴۰)۔ یہاں یوم القیامت سے مراد خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل ہے۔

(۸) جو لوگ دوسروں کو گمراہ کرتے ہیں 'قیامت کے دن وہ اپنے جرائم کے ساتھ' ان لوگوں کے

جرائم کا بوجھ بھی اپنے کمر پر لاوے ہوں گے (۱۱۴/۲۵)؛ (۲۹/۱۳)۔

(۹) سورہ نمل میں 'اقوام سابقہ کی اس دنیا میں تباہی کے بعد کہا ہے کہ یوم القیامت میں

وہ ذلیل و رسوا ہوں گے (۲۶۱-۱۶/۲۷)۔

(۱۰) اس وقت ہر انسان کا اعمال نامہ لپٹا ہوا اس کی گردن میں لٹک رہا ہے۔ قیامت میں وہ کھل کر سامنے آجائے گا (۱۳-۱۱۷/۱۳) اس سے مراد ظہورِ ناسخ کا وقت ہو سکتا ہے۔ خواہ وہ دنیا میں اور خواہ مرنے کے بعد۔

(۱۱) جن لوگوں کے اعمال رائگاں جاتے ہیں، ان کے لئے یوم القیامت کو میزان کھڑی نہیں کی جائے گی (۱۱۸/۱-۵) اس سے بھی مراد ظہورِ ناسخ کا وقت ہو سکتا ہے۔ خواہ وہ کہیں بھی ہو۔ جسطرح اعمال کی وضاحت اس سے پہلے کی جا چکی ہے۔

(۱۲) سورۃ مریم میں ہے وَكُلُّهُمْ اِیْنِیْہِ یَوْمَ الْقِیَمَةِ قَرْدًا (۱۹/۹۵)۔ یہ آیت ایک عظیم حقیقت سامنے لاتی ہے جس کی تشبیہ کا یہ مقام نہیں۔ اسے آگے چل کر بیان کیا جائے گا۔ اس وقت صرف اتنا بتا دینا کافی ہو گا کہ اس کے جہاں یہ معنی ہو سکتے ہیں کہ قیامت کے دن، انسان کی بیوی، بچے، اعزہ و اقارب، دوست احباب، حتیٰ کہ جنہیں وہ اپنی نجات کا ضامن سمجھا کرتا تھا، ان میں سے کوئی بھی اس کے ساتھ نہیں ہو گا۔ وہ تنہا عدالتِ خداوندی میں حاضر ہو گا۔ وہاں اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ جن چیزوں کو انسان 'میری' کہتا ہے وہ سب یہاں رہ جاتی ہیں — مثلاً 'میرا مال'، 'میری اولاد'، 'میرا جسم'، حتیٰ کہ 'میری جان' — اور صرف انسانی ذات (HUMAN PERSONALITY) آگے جاتی ہے۔ اُس زندگی کا تعلق انسانی ذات ("میں") سے ہے۔ "میری" سے نہیں۔ "میری" میں تمام اضافی چیزیں آجاتی ہیں۔ ذاتی شے صرف انسان کی "میں" ہے اور اسی کو مرنے کے بعد آگے جانا ہے۔

(۱۳) قیامت کے دن مجرم اپنے جرائم کا بوجھ ساتھ لے کر حاضر ہوں گے (۱۰۰-۲۰/۱-۱) اور انہیں تو لے کے لئے "عدل کے ترازو" کھڑے کئے جائیں گے اور کسی پر کسی قسم کا ظلم نہیں ہو گا۔ عملِ انسانی کا ذرہ ذرہ سامنے آجائے گا (۲۱/۲۷)۔

(۱۴) معاشرتی جرائم کی سزا معاشرتی نظامِ عدل کی رُو سے، اس دنیا میں بھی مل سکتی ہے لیکن اس سے آخرت کا عذاب مل نہیں سکتا۔ اس لئے کہ خلافِ قانون عمل کا جو اثر انسانی ذات پر مرتب ہوتا ہے وہ دنیاوی سزا سے مرٹ نہیں سکتا۔ اس کا نتیجہ 'یوم القیامت' میں سامنے آئے گا اور وہ عذابِ یہاں

کی سزا کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہوگا (۲۵/۶۹)۔

(۱۵) قیامت میں انسان کے دوست بھی اس کے دشمن ہو جائیں گے (۲۹/۲۵)۔

(۱۶) نقصان کا سودا ان کا ہے جو قیامت کے دن اظہور نتائج کے وقت دیکھیں گے کہ انہوں نے اپنے آپ کو اور اپنے متعلقین کو کس قدر نقصان پہنچایا تھا۔ اس سے بڑا نقصان اور ہو نہیں سکتا۔ (۳۹/۱۵) : (۴۲/۴۵)۔

(۱۷) غلط اعمال کے تباہ کن نتائج سے حفاظت، قانون خداوندی کی پناہ میں آ جانے سے مل سکتی ہے۔ جو لوگ اپنی (دیگر) تدابیر سے حفاظت حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں انکی کوششیں کامیاب نہیں ہو سکتیں (۳۹/۲۲)۔

(۱۸) یوم القیامت کی ذلت کو روسیاء ہی سے تعبیر کیا گیا ہے (۳۹/۶۰)۔

(۱۹) جو قیامت کے دن امن میں رہے اس کا مقابلہ کون کر سکتا ہے (۴۱/۴۰)۔

(۲۰) قیامت کے دن (ظہور نتائج کے وقت) انسان کے پوشیدہ راز بھی بے نقاب ہو کر سامنے آ جائیں گے (۵۸/۷)۔

(۲۱) سورۃ القیامۃ میں 'قیامت کو بطور شہادت پیش کیا گیا ہے اور اس سوال کے جواب میں کہ قیامت کب آئے گی' جو تفصیل دی گئی ہے اس سے کائنات میں طبعی تغیرات بھی مراد ہو سکتے ہیں۔ وہ انقلاب بھی ظہور اسلام کے بعد عرب اور ایران میں رونما ہوا اور مرنے کے بعد کی قیامت بھی (۱-۱۵/۵۸)۔

(۲۲) سورۃ زمر میں ہے۔ وَ الْأَرْضُ جَمِيعًا قَبْضَتُهُ يَوْمَ الْقِيَمَةِ وَ السَّمَوَاتُ مَطْوِيَّاتٌ بِيَمِينِهِ (۳۹/۶۷)۔ اس کا عام ترجمہ یہ ہے کہ قیامت کے دن ارض اس کے قبضہ میں ہوگی اور سموات اس کے دائیں ہاتھ میں پٹے ہوں گے۔ اگر ان الفاظ کو ان کے حقیقی معانی پر محمول کیا جائے تو اس سے کوئی عظیم کائناتی تغیر مراد ہو سکتا ہے لیکن اگر ان الفاظ کے مجازی معانی لئے جائیں تو اس سے مطلب یہ ہوگا کہ اس آسمانی انقلاب میں جو جماعت مومنین کے ہاتھوں رونما ہوگا، دین و دنیا اور مذہب و سیاست کی تفریق مٹ جائے گی۔ انسان کی معاشی زندگی سے متعلق امور (ارض) اور سماوی اقدار دونوں یکجا ایک ہی مرکز کے کنٹرول میں ہوں گے۔

(۲۳) سورۃ اسراء میں ہے۔

وَإِنْ مِنْ قَرْيَةٍ إِلَّا نَحْنُ مُهْلِكُوهَا قَبْلَ يَوْمِ الْقِيَمَةِ أَوْ مُعَذِّبُوهَا عَذَابًا شَدِيدًا ۖ كَانَ ذَلِكَ فِي الْكِتَابِ مَسْطُورًا

(۱۴/۵۸)

اور کوئی بستی نہیں جسے ہم یوم القیمة سے پہلے تباہ نہیں کر دیں گے یا اسے کسی اور سخت عذاب میں مبتلا نہیں کر دیں گے۔ یہ چیز خدا کے ضابطہ قوانین میں لکھی ہوئی ہے۔

اس سے عام طور پر وہ مفہوم لیا جاتا ہے جسے ہم شروع میں بیان کر چکے ہیں۔ یعنی یہ کہ قیامت سے پہلے یہ سارا سلسلہ کائنات تباہ و برباد ہو جائے گا۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ خدا کا اٹل قانون یہ ہے کہ جو قوم بھی غلط نظام اختیار کرے گی وہ یا تو اس طرح تباہ ہو جائے گی کہ اس کا نام و نشان تک مٹ جائے گا اور یا اس پر ایسا زوال آجائے گا جس میں باز آفرینی کا امکان باقی نہیں رہے گا۔ اس میں یوم القیمة سے مراد وہی انقلاب ہے جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس میں اس انقلاب کی طرف ہی اشارہ ہو جو جماعتِ مومنین کے ہاتھوں عرب میں رونما ہوا تھا۔ اس میں مخالف جماعتیں یا تو تباہ و برباد ہو گئی تھیں یا بالکل بے بال و پر ہو کر رہ گئی تھیں اور ہر جگہ غلبہ اس نظام کا ہو گیا تھا۔

ۛ

ہم اپنے ہاں اکثر کہتے ہیں۔ ”تم قیامت تک بھی اسے جیت نہیں سکتے“ اس سے مراد یا تو یہ ہوتا ہے کہ ایسا ہونا ناممکن ہے اور یا کافی لمبا عرصہ۔ قرآنِ کریم کی بعض آیات میں ”قیامت“ کا لفظ انہی معانی میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً سورۃ آل عمران میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ سے کہا کہ جَاءَ عَلَى الَّذِينَ اتَّبَعُوكَ قَوْمٌ الَّذِينَ كَفَرُوا إِلَى يَوْمِ الْقِيَمَةِ (۳/۵۴) جو لوگ تیرا اتباع کریں گے انہیں میں، قیامت تک، ان لوگوں پر فائق رکھوں گا جو تجھے نہیں مانتے۔ یہاں متبعین حضرت عیسیٰ سے مراد عیسائی اور آپ کے مخالفین سے مراد یہودی ہیں۔ عیسائیوں کی یہودیوں پر فوقیت (برتری) تو ایک تاریخی حقیقت ہے لیکن یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ برتری ابدی طور پر رہے گی۔ اس لئے یہاں اِلَى يَوْمِ الْقِيَمَةِ سے مراد مدتِ مدید ہو سکتی ہے۔ سورۃ مائدہ میں ہے کہ عیسائیوں کے مختلف فرقوں میں باہمی بغض و عداوت۔ اِلَى يَوْمِ الْقِيَمَةِ ”رہے گی (۵/۴۱)۔ اسی

طرح یہودیوں کے متعلق بھی کہا ہے (۵/۶۴)۔

سورۃ قصص میں ہے کہ اگر اللہ ایسا کر دے کہ رات آئے تو پھر "یَوْمِ الْقِيَمَةِ" تک رات ہی رہے۔ دن چڑھے ہی نہیں۔ تو وہ کونسی قوت ہے جو رات کی تاریکی کو دُور کر کے سورج طلوع کر دے (۱۲۸/۷۱)۔ ظاہر ہے کہ یہاں بھی "قیامت تک" سے مراد ہمیشگی ہے۔ سورۃ احقاف میں ہے کہ جن معبودانِ باطل (مُردوں) کو یہ لوگ مدد کے لئے بلاتے ہیں وہ قیامت تک ان کی پکار کا جواب نہیں دے سکتے (۴۶/۵۱)۔ سورۃ قلم میں غلط کار لوگوں کے متعلق ہے کہ کیا ان لوگوں نے ہم سے قیامت تک کے لئے پٹہ لکھوا رکھا ہے کہ ان کا ہر فیصلہ تسلیم کر لیا جائے گا؟ (۹۸/۳۹)۔ یہاں بھی "الْحَيٰ يَوْمِ الْقِيَمَةِ" سے مراد "ہمیشہ ہمیشہ کے لئے" ہے۔

بعض آیات میں یومِ القیمة اور یومِ البعث کو مرادف معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ اس کی تفصیل "بعث" کے عنوان میں ملے گی۔



حشر

حشر بھی، آخرت، قیامت، ساعت، بعث کی طرح، شُرَّانِ کریم کی جامع اصطلاح ہے۔ اس کے بنیادی معنی لوگوں کو جمع کرنا اور ہانک کر کسی طرف لے جانا ہوتے ہیں۔ اسی پہنچ سے اس لفظ کا اطلاق جنگ اور اس میں جمع ہونے والے لشکروں یا وہاں گرفتار ہو جانے والے قیدیوں پر بھی ہوتا ہے۔ 'حشر' اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں اس قسم کا اجتماع ہو۔ سورہ نمل میں ہے: وَحُشِرَ رَسُولُكَ جُنُودًا (۲۴/۱۷) سلیمان کے لشکر جمع ہو گئے۔ جب جماعتِ مومنین کا یہودیوں کے ساتھ پہلا تصادم ہوا ہے جس کے نتیجہ میں انہیں مدینہ سے باہر نکال دیا گیا تھا تو اسے شُرَّانِ کریم نے اَوَّلِ الْحَشْرِ کہہ کر پکارا ہے (۵۹/۲)۔ سورہ آل عمران میں جنگ بدر کے سلسلہ میں کہا گیا ہے کہ قُلْ لِلَّذِينَ كَفَرُوا سَعْيُهُمْ وَهُمْ يَخِشُونَ وَالْحَشْرُ ذُنَّ إِلَى جَهَنَّمَ ط وَيَخِشُ الْمُهَادُّو (۳/۱۱) ان مخالفین سے کہہ دو کہ عنقریب تم مغلوب ہو گے۔ پھر تمہیں اکٹھا کر کے، ہانک کر تباہی کے جہنم کی طرف لے جایا جائے گا اور وہ بہت بری جگہ ہوگی ٹھہرنے کے لئے۔" اس کے بعد دونوں فریقوں کے میدانِ جنگ میں آمنے سامنے آنے کا ذکر ہے۔ اس سے واضح ہے کہ یہاں مخالفین کے "حشر" سے مراد انکی شکست کے بعد انہیں قیدی بنا کر "ہانک کر لے جانا ہے" (ضمناً اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ جہنم اس دنیا میں بھی ہوتا ہے جہاں قویں مغلوب ہو کر ذلت کی زندگی بسر کرتی ہیں)۔

لیکن قرآن کریم میں 'حشر' کا لفظ مرنے کے بعد، نتائجِ اعمال کے لئے بھی آیا ہے۔ اس سلسلہ میں دو بنیادی نکات کا سمجھ لینا ضروری ہے۔

(۱) جیسا کہ ہم ”رجعت الی اللہ“ کے عنوان کے تحت لکھ چکے ہیں ”خدا کی طرف جانے“ سے مراد یہ نہیں کہ خدا کسی مقام میں رہتا ہے اور انسان مرنے کے بعد اُس مقام میں اس کے پاس جائے گا۔ خدا کی ذات مکان اور زمان کی نسبتوں سے بلند ہے اس لئے کسی انسان کا ”اس کے پاس“ جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ رجعت الی اللہ یا خدا کی طرف جانے سے مراد خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کے مطابق ظہورِ نتائج ہے خواہ وہ اس دنیا میں ہو اور خواہ مرنے کے بعد کی زندگی میں۔

(۲) جیسا کہ ”روزِ جزا سے متعلق تفصیل“ کے باب میں بتایا جائے گا۔ شبہً انِ کریم محض سمجھانے کی خاطر اس قسم کا نقشہ پیش کرتا ہے۔ گویا ایک عدالت کا میدان ہے جہاں تمام متعلقہ لوگ (فریقین گواہ، پولیس کے افراد وغیرہ) جمع ہیں۔ مقدمہ پیش ہوتا ہے۔ شہادات طلب کی جاتی ہیں۔ ریکارڈ سامنے رکھا جاتا ہے۔ الزامات کی فہرست مرتب کی جاتی ہے۔ ملزم کو صفائی کا موقعہ دیا جاتا ہے پھر فیصلہ سنایا جاتا ہے۔ مجرمین کو ہانک کر جہنم کی طرف لے جایا جاتا ہے۔ یہ سب قانونِ مکافاتِ عمل کی نتائج پذیر می کو سمجھانے کا وہ طریق ہے جس طرح دنیا میں مقدمات کے فیصلے ہوتے ہیں۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ مرنے کے بعد ایک دن — اول سے آخر تک کے تمام انسان کسی میدان میں جمع کئے جائیں گے اور وہاں ان کی جزا اور سزا کا فیصلہ ہوگا۔ قرآنِ کریم میں جہاں ”خدا کے ہاں جمع ہونے“ کا ذکر آیا ہے اس سے مراد انسانی اعمال کے نتائج کا ظہور ہے۔

لہذا حشر کا لفظ یا تو اس دنیا میں حق و باطل کی قوتوں کے تصادم کے لئے آیا ہے اور یا مرنے کے بعد کی زندگی میں ظہورِ نتائج کے لئے۔ اس کی وضاحت ذیل کی آیات سے ہوگی۔

جمع ہونے کا دن

(۱) خدا انہیں اس دن جمع کرے گا جس کے واقع ہونے میں کوئی شک و شبہ نہیں اور ہر ایک کو اس کے کئے کا پورا پورا بدلہ ملے گا اور کسی پر ظلم نہیں ہوگا (۳/۲۴)؛ (۳/۸۱)؛ (۴/۲۲)؛ (۴/۵۱)؛ (۱۰/۲۸)؛ (۱۵/۲۵)؛ (۳۴/۴۰)؛ (۲۶/۳۲)۔

(۲) اے یوم القیمۃ بھی کہا گیا ہے (۶/۱۲)؛ (۱۶/۹۷) اور آخرت بھی (۱۱/۱۰۳) اور یوم

مشہور بھی (۱۱/۱۰۳)۔

(۳) سورۃ دخان میں اسے یوم الفصل (فیصلہ کا دن) کہا گیا ہے (۴۴/۴۰)؛ (۴۴/۳۸) اور سورۃ تغابن میں اسے یوم التغابن سے تعبیر کیا گیا ہے (۴۴/۹)۔ یعنی جس دن ایک دوسرے کے تقابل سے معلوم ہو جائے گا کہ کس میں کس قدر کمی رہ گئی تھی۔

(۴) تم قتل کر دیئے جاؤ یا طبعی موت مر جاؤ۔ خدا کی طرف سب کو جمع ہونا ہے (۳/۱۵۴)۔
(۵) جس دن انہیں اکٹھا کیا جائے گا تو انہیں یوں محسوس ہوگا گویا دن کی ایک گھڑی تک رہے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کو پہچانتے ہوں گے (۱۰/۴۵)۔ یہاں جو کہا گیا ہے کہ انہیں ایسا محسوس ہوگا گویا ایک گھڑی تک رہے ہیں، اس کی تشریح اپنے مقام پر آگے چل کر ملے گی۔

(۶) سورۃ ابراہیم میں کہلے ہوئے بَرَزْدُ لِلّٰہِ جَمِیْعًا (۱۴/۲۱) وہ سب، نمایاں طور پر خدا کے حضور جمع ہو جائیں گے۔ یہ اس دن ہوگا جب یہ زمین بدل جائے گی۔ یہ آسمان بدل جائے گا (۱۴/۴۸)۔

(۷) ان (مجرمین) اور شیاطین کو اکٹھا کیا جائے گا اور یہ سب جہنم کے کنارے گھٹنوں کے بل جھکے ہوں گے (۱۹/۶۸)۔ دہشت کے مارے ان کی آنکھیں نیلی ہو جائیں گی (۲۰/۱۰۲)؛ (۴۱/۱۹)۔ انہیں اور ان کے باطل معبودوں کو اکٹھا کیا جائے گا (۲۵/۱۷)۔ تمام ہم مسلک لوگ یک جا ہوں گے (۲۷/۲۲)؛ (۴۶/۶)؛ (۲۵/۲۴)۔

(۸) ہر امت سے ایک ایک گروہ کو اکٹھا کیا جائے گا اور انہیں الگ الگ پارٹیوں میں تقسیم کر دیا جائے گا (۲۷/۸۳)۔

(۹) مومن، معزز بہانوں کی طرح خدا کے ہاں جمع ہوں گے اور مجرمین کو ہانک کر جہنم کی طرف لے جایا جائے گا (۸۵ — ۱۹/۸۶)۔

(۱۰) اس طرح جمع کرنا خدا کے لئے کچھ بھی مشکل نہیں (۵۰/۴۴)۔

(۱۱) بعض مقامات پر حشر کے معنی صرف اٹھا کھڑا کرنے کے بھی آتے ہیں۔ مثلاً سورۃ طہ میں ہے کہ جو شخص قوانین خداوندی کی خلاف ورزی کرے گا اس کی روزی تنگ ہو جائے گی۔ وَ نَحْشُرُکَ یَوْمَ الْقِیَمَةِ اَعْمٰی (۲۳ — ۲۰/۱۲۵) اور اسے قیامت کے دن اندھا اٹھایا جائے گا۔

(۱۲) سورۃ مومنون میں صرف اتنا کہا گیا ہے کہ هُوَ الَّذِي ذَرَأَكُمْ فِي الْأَرْضِ وَإِلَيْهِ تُحْشَرُونَ ۝ (۲۳/۷۹) خدا نے تمہیں زمین میں پھیلا دیا ہے اور تم اس کی طرف جمع ہونے والے ہو۔ (نیز ۲۴/۷۶)۔

(۱۳) سورۃ کہف میں یا جوج ماجوج کے حملوں کو روکنے کے لئے ذوالقرنین نے جو دیوار بنائی تھی، اس کے سلسلہ میں کہا کہ ایک وقت آئے گا جب یہ دیوار گر جائے گی اور پھر یہ قومیں موج در موج ایک دوسرے پر چڑھ دوڑیں گی۔ وَجَمَعْنَاهُمْ جَمْعًا (۱۸/۹۹) اور ہم ان سب کو ایک جگہ اکٹھا کر دیں گے۔ ظاہر ہے کہ یہ اجتماع اسی دنیا میں قوموں کے لشکروں کا کسی جنگ عظیم میں ایک دوسرے کے سامنے آنا ہے۔ اس کے بعد ہے کہ اس وقت جہنم کو سامنے نمودار کر دیا جائے گا۔ یہ جہنم بھی اسی دنیا کی تباہی کا تمثیلی بیان ہے۔

بہر حال، جیسا کہ شروع میں کہا گیا ہے، حشر سے مراد اس دنیا میں قوموں یا جماعتوں کا باہمی تصادم بھی ہے اور مرنے کے بعد قانونِ مکافاتِ عمل کی رُو سے ظہورِ نتائج کا محسوس بیان بھی۔



بعث

اسی سلسلہ کی ایک کڑی 'بعث' کی اصطلاح بھی ہے۔ 'بعث' کے بنیادی معنی ہیں 'جو چیز کسی کی آزادانہ نقل و حرکت کے راستے میں حائل ہو' اسے راستے سے ہٹا دینا اور اس طرح ان موانع کو دور کر دینا جو اس کی حرکت کو روکے ہوئے تھے۔ قرآن کریم میں اس کا استعمال متعدد مقامات پر کیا ہے۔ مثلاً

(۱) جب حق کی علمبردار جماعت 'معاشرہ' میں انقلاب لانے کے لئے اٹھتی ہے تو مخالف جماعتیں اس کے راستے میں سنگ گراں بن کر حائل ہو جاتی ہیں اور اس طرح اس انقلاب کا راستہ روک کر کھڑی ہو جاتی ہیں۔ ان جماعتوں کو راستے سے ہٹا کر اس انقلاب کے لئے راستہ ہموار کر دینے کے لئے بھی یہ اصطلاح آئی ہے۔ مثلاً سورہ تطفیف میں ہے کہ اَلَا يَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمْ مَّبْعُوۡنٌۭ لِّیَوْمٍ عَظِیۡمٍ (۴-۵/۸۳) یہ سرمایہ دار جماعتیں قرآنی نظام معیشت کی راہ میں روک بن کر کھڑی ہیں۔ کیا انہیں اس کا خیال نہیں آتا کہ ہمارا قانون مکافات اس قدر قوت اور غلبہ کا مالک ہے کہ یہ انہیں پرکاش کی طرح راستے سے ہٹا کر الگ کر دے گا؟ یہ کچھ ہو گا لیوم عظیمہ ایک عظیم انقلابی دور کے آنے کے لئے۔ یَوْمَ یَقُوۡمُ النَّاسُ لِرَبِّہِ۬مُ النَّصِیۡمِ (۵/۸۳) وہ دور جس میں نوری انسانی ربوبیت عالمی کے نظام کے قیام کے لئے اٹھ کھڑی ہوگی۔

(۲) یہ اصطلاح زوال آمادہ قوموں کو حیات نو عطا ہونے کے لئے بھی استعمال ہوئی ہے۔ یعنی ان کی حرکت و عمل کے راستے میں جو موانع تھے انہیں دور کر کے ان اقوام کو از سر نو کھڑے کر دینا۔ سورہ بقرہ میں بنی اسرائیل کی (بابل کی) قریب سو سالہ غلامی کی زندگی کے بعد انہیں حیات تازہ عطا ہونے

کے سلسلہ میں کہا کہ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةً عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهُ ۖ (۲/۲۵۹) سو برس تک ان پر موت طاری رہی۔ اس کے بعد انہیں اٹھا کھڑا کیا۔ (عام طور پر کسی کو صاحب اختیار بنا کر بھیجنے کے لئے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے جیسے کسی رسول کی بعثت)۔

(۳) موت انسان کی حرکت و عمل کی راہ میں سنگ گراں ہے۔ اسے دُور کر کے اس فرد کو پھر سے زندگی عطا کر دینے کے لئے بھی یہ اصطلاح آتی ہے۔ یہ حیاتِ نو ملتی کس طرح ہے اس کا ذکر تو آگے چل کر اپنے مقام پر آئے گا۔ اس وقت ہم صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اس کے لئے بھی بعثت کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ یوم القیامۃ کی طرح اسے یوم البعث یا یوم یبعثون کہہ کر پکارا گیا ہے۔ قرآن کریم میں متعدد مقامات پر اس کا ذکر آیا ہے اور ہر مقام پر غور و تدبر سے سمجھ میں آسکتا ہے کہ اس جگہ بعثت سے کیا مراد ہے۔ مثلاً

(۱) سورۃ النعام میں ہے وَ اَلْمَوْتِ یَبْعَثُھُمُ اللّٰهُ (۶/۳۶) مُردوں کو خدا ضرور اٹھا کھڑا کرے گا۔

(۲) کفار بَعَثَ بَعْدَ الْمَوْتِ کی تکذیب کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ دعویٰ ایک کھلا ہوا جھوٹ ہے (۱۱/۶)۔ یہ قسمیں کھا کھا کر کہتے ہیں کہ جس پر موت وارد ہو جائے اسے خدا حیاتِ نو عطا نہیں کر سکتا۔ یہ غلط ہے۔ خدا نے اس کا وعدہ کر رکھا ہے اور اس کے سب وعدے سچے ہوتے ہیں (خدا کے وعدہ کو قانونِ خداوندی کہا جاتا ہے)۔ اس لئے ایسا ہو کر رہے گا (۱۱۶/۳۸)۔ انہیں دلائل سے سمجھایا گیا کہ ایسا کس طرح ممکن ہے (۱۲۲/۵)۔ اسے الساعۃ سے تعبیر کیا گیا اور کہا گیا کہ خدا انہیں ضرور حیاتِ نو عطا کرے گا جو قبروں میں ہیں (۲۲/۶)۔ ان کا اعتراض یہ تھا کہ جب ہم گلی سڑ کر مٹی ہو جائیں گے تو کیا اس کے بعد عِزًّا رَاقًا لَمَبْعُوثُونَ خَلْقًا جَدِیدًا (۱۱۶/۹۸)۔ (نیز ۲۳/۳۷)۔ کیا ہم ایک نئی مخلوق بنا کر اٹھائے جائیں گے؟ جواب میں کہا کہ تمہاری خلق اور بعثت تو یوں سمجھو جیسے ایک نفس (نفسِ واحدہ) کی خلق اور بعثت ہو۔ مَا خَلَقْکُمْ وَ لَا یَبْعَثْکُمْ اِلَّا کُنُفْسٍ وَ اَحَدٌ ۖ (۳۱/۲۸)۔

(۳) اس طرح حیاتِ نو مل جانے کے وقت کو یَوْمِ الْبَعْثِ کہا گیا ہے (۳۰/۵۶)۔ اسی کو یَوْمِ الدِّیْنِ بھی کہا گیا ہے۔ یعنی اعمالِ انسانی کے ظہورِ نتائج کا وقت (۴۸-۴۹/۳۸)؛ (۳۶-۳۸/۵۵) اور یَوْمِ الْقِیَمَةِ بھی (۱۶/۴۲)؛ (۲۳/۱۵) اور یَوْمِ الْخُرُوجِ بھی (۵۰/۴۲)۔ یعنی نمودار ہونے کا

دن۔ یَوْمَ یَبْعَثُ اللّٰهُ جَمِیْعًا فِیْنَتِہُمْ بِمَا عَمِلُوْا ۝ (۵۸/۶) جس دن خدا ان سب کو اٹھا کھڑا کرے گا اور بتائے گا کہ انہوں نے کیا کام کئے تھے۔ (نیز ۵۸/۱۸)۔

(۴۱) اس کا کسی کو علم نہیں ہوتا کہ وہ کب اٹھائے جائیں گے (۲۷/۶۵) اور نہ ہی مردوں کو اس دنیا کے ساتھ کوئی تعلق رہتا ہے۔ اس لئے کہ مِنْ دَرَآیْہُمْ بَرْزَخٌ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ ۝ (۲۳/۱۰۰)۔ یومِ بعثت تک ان کے پیچھے ایک پردہ حائل ہوتا ہے۔

(۵۱) حضرت عیسیٰؑ نے کہا کہ مجھ پر سلامتی ہی سلامتی ہے جس دن میں پیدا ہوا تھا جس دن مجھے وفات ہوگی اور جب پھر زندہ اٹھایا جاؤں گا (۱۹/۳۳)۔ حضرت ابراہیمؑ کی یہ دعا تھی کہ جس دن میں اٹھایا جاؤں مجھے رسوائی نصیب نہ ہو (۲۴/۸۷)۔

(۶۱) قرآن کریم میں اصحابِ کہف کا واقعہ بڑی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ وہ خدا مست انقلابوں کی جماعت تھی۔ اپنے پروگرام کے ابتدائی دور میں جب انہوں نے دیکھا کہ وہ ہنوز مستبد قوتوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تو وہ ایک بہت بڑے غار میں جا چھپے اور وہاں تیاریاں شروع کرویں۔ جب انہوں نے دیکھا کہ باہر کے حالات سازگار ہو گئے ہیں تو وہ پھر باہر نکل آئے۔ قرآن کریم نے اسے بھی ان کی بعثت سے تعبیر کیا ہے (۱۸/۱۹)۔ ویسے رات کو سو کر صبح کے وقت اٹھنے کے لئے بھی یہ لفظ آیا ہے (۷/۴۰)۔ دیکھئے (۷/۴۰)۔



نفخ صور

اس ضمن میں ایک اصطلاح ”نفخ صور“ کی بھی آتی ہے۔ اس لفظ (صور) کے دو معنی ہیں۔
 (۱) پہلے زمانہ میں لڑائی کے وقت زسنگھا بجا کرتے تھے۔ اسے صور کہتے تھے (آجکل اسے بگل کہا جائے گا)۔ اس اعتبار سے صور پھونکنے کے معنی ہوں گے۔ اعلان جنگ کرنا۔ جنگ شروع کرنا۔ جب اس اصطلاح کا تعلق اس دنیا کے حوادث سے ہوگا تو اس کے معنی حق و باطل کی جماعتوں میں جنگ کا آغاز ہوں گے۔

(۲) لفظ ”صورت“ کے معنی ہیں کسی شے کی ہیئت۔ اس کا پیکر۔ اس کی جمع صور بھی آتی ہے اور صور بھی۔ اس اعتبار سے صور کے معنی ہوں گے انسانی پیکر اور نفخ صور سے مراد ہوگی انسانی پیکروں میں تازہ روح پھونک دینا۔ اس دنیا میں اگر کسی زوال پذیر قوم کو از سر نو زندگی عطا ہو جائے تو استعارہ کی زبان میں کہیں گے کہ اس قوم کے پیکر ان آب و گل میں روح تازہ پھونک دی گئی۔ اس لئے مردہ قوموں کو حیات تو مل جانے کے لئے بھی یہ اصطلاح استعمال ہوگی اور جب مردوں کو دوبارہ زندگی ملے گی (جس کی تفصیل آگے چل کر آئے گی) تو اسے بھی نفخ صور سے تعبیر کیا جائے گا۔
 قرآن کریم میں جن آیات میں نفخ صور کا ذکر آیا ہے ان میں غور و تدبر سے اس اصطلاح کا مفہوم سمجھ میں آجائے گا۔ مثلاً یا جوج ماجوج کے ضمن میں جو آیت (”حشر“ کے عنوان میں) درج کی گئی ہے اس میں بھی ”نفخ صور“ کا ذکر آیا ہے (۱۸/۹۹)۔ ظاہر ہے کہ اس سے مراد لڑائی کا بگل ہے جو قوموں کی

عالمگیر جنگ کے سلسلہ میں بجے گا۔ دیگر آیات درج ذیل ہیں:

(۱) سورۃ النعام میں ہے۔ ذٰلَہُ الْمُلْکُ یَوْمَ یُنْفَخُ فِی الصُّورِ (۶/۴۳) جب نَفِخْ صُور ہوگا

تو تمام اختیار و اقتدار قوانین خداوندی کے لئے مرکوز ہو جائے گا۔

(۲) سورۃ طہ میں ہے۔ یَوْمَ یُنْفَخُ فِی الصُّورِ وَ نَحْشُرُ الْمُجْرِمِیْنَ یَوْمَئِذٍ ذُرَّتًا

(۲۰/۱۰۲) جس دن صُور پھونکا جائے گا تو اس دن مجرمین جمع کئے جائیں گے اور حالت ان کی یہ ہوگی کہ ڈر کے مارے ان کی آنکھیں نیلی ہو جائیں گی۔

(۳) سورۃ موتس میں ہے کہ جب صُور پھونکا جائے گا تو تمام رشتے ناطے منقطع ہو جائیں گے اور

کوئی ایک دوسرے کا پرسانِ حال نہیں ہوگا (۲۳/۱۰۱)۔

(۴) دوسرے مقام پر ہے کہ جب صُور پھونکا جائے گا تو زمین و آسمان میں جو کوئی بھی ہوں گے

وہ ڈر کے مارے ہوش و حواس کھو بیٹھیں گے (۲۶/۸۷)۔ پھر دوسری بار نَفِخْ صُور ہوگا تو وہ کھڑے ہو کر دیکھ رہے ہوں گے (۳۹/۶۸)۔

(۵) نَفِخْ صُور کے بعد مردے اپنی قبروں سے لپک کر خدا کی طرف جائیں گے (۳۶/۵۱)۔ اس طرح

کہ ہر ایک کے ساتھ ایک ”پولیس کا سپاہی“ ہوگا جو اسے پیچھے سے بانک رہا ہوگا اور ایک گواہ یا نگران ہوگا۔ اسے یوم الوعد کہا گیا ہے (۲۰-۵۰/۲۱)۔

(۶) ایک مقام پر نَفِخْ صُور کے ساتھ اَرْض و سما و جبال میں ہوشِ باتغیرات کا ذکر آیا ہے اور

اسے الواقعہ سے تعبیر کیا گیا ہے (۱۳-۴۹/۱۷)۔ نیز (۱۸-۷۸/۲۱)۔

(۷) سورۃ مدثر میں صُور کی جگہ نَاقُور آیا ہے۔ معنی اس کے بھی وہی ہیں (۸/۷۴)۔



سُورَٰنِ کریم میں ’جہاں اقوام سابقہ کی تباہی کا ذکر آیا ہے‘ وہاں اکثر یہ کہا گیا ہے کہ ایک

فضا کو چیر جانے والی اور دل بلا دینے والی ”آواز“ آئی اور وہ قوم راکھ کا ڈھیر ہو کر رہ گئی۔ جن قوموں

کی تباہی طبعی حوادث (مثل زلزلہ یا کوہِ آتش فشاں کی سنگ باری) سے ہوئی تھی ”ان میں یہ چیخ

کی آواز بھی طبعی ہو سکتی ہے۔ ورنہ اس سے مراد بھی تباہی کی آمد کا پتہ دینے والی کوئی علامت

ہوگی۔ سورۃ یسین میں ہے اِنْ کَانَتْ اِلَّا صَیْحَةً وَّ اٰحَدًا فَاِذَا هُمْ خَامِدُوْنَ

بس ایک چیخ کی آواز اُبھری اور وہ قوم راکھ کا ڈھیر ہو کر رہ گئی۔ (نیز ۴۹/۳۶)۔ (۳۸/۱۵۱)۔ قوم
 نمود کے سلسلہ میں بھی یہی آیا ہے (۵۴/۳۱)۔ دوسری جگہ نفعِ تصور کے ساتھ صَيْحَةً وَاحِدَةً
 کا ذکر آیا ہے (۳۶/۵۳)۔ ۱۔ سے یوحنا الخرج کہا گیا ہے (۵۰/۴۲)۔ دوسرے مقام پر اسے
 زَجْرَةً وَاحِدَةً کہا گیا ہے (۳۷/۱۹)۔ اس میں آواز کے ساتھ ڈانٹنے کا پہلو بھی ہوتا ہے۔
 (نیز ۱۳-۱۴/۷۹)۔



تیرھواں باب

حیاتِ نو

اب ہم اپنے موضوع کے اہم ترین اور نازک ترین گوشے کی طرف آتے ہیں۔ اس سلسلہ میں بھی دو بنیادی نکات کا پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ قرآنِ کریم :

(۱) ان لوگوں کو بھی مُردہ کہتا ہے جو طبعی طور پر زندہ ہوتے ہیں اور دوسرے انسانوں کی طرح چلتے پھرتے ہیں۔ لیکن ان کی انسانی صلاحیتیں مردہ ہو چکی ہوتی ہیں۔ انہیں حیاتِ تازہ، قرآنِ کریم میں غور و فکر سے مل سکتی ہے۔

(۲) وہ ان قوموں کو بھی مُردہ کہتا ہے جو زوال پذیر ہو چکی ہوں۔ ان میں اگر دوبارہ عروج حاصل کرنے کی استعداد و صلاحیت باقی ہوتی ہے تو وہ تو انہیں خداوندی پر عمل کرنے سے دوبارہ زندگی حاصل کر سکتی ہیں۔ یہ بھی حیاتِ بعد الممات کہلاتی ہے۔ اور

(۳) افراد کی طبعی موت کے بعد دوسری زندگی کو بھی ”موت کے بعد کی زندگی“ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہی اس موضوع کا اہم ترین اور نازک ترین گوشہ ہے۔ لیکن باقی دو گوشے بھی اپنی اہمیت کے لحاظ سے کم توجہ کے مستحق نہیں۔

زراعت کی تشبیہ

قرآنِ کریم نے حیاتِ نو کو کھیتی کی مثال سے سمجھایا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ یہ مثال

(یا تشبیہ) بڑی ہی بلوغ و لطیف ہے۔ آپ اس زمین کو دیکھتے جو افتادہ (یا بخر) ہو۔ اس میں سبزی شادابی، شگفتگی کا نام و نشان تک نہیں ہوتا۔ اسے کہا ہی زمینِ مردہ جاتا ہے۔ لیکن بارش کے ایک چھینٹے سے اس میں روئیدگی آنکھیں ملتی ہوئی ابھرتی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ زمین 'زندگی' اور تازگی کا حسین منظر بن جاتی ہے۔ یا مثلاً گیہوں کے ایک دانے کو دیکھئے۔ وہ بالکل خشک نظر آئے گا اور اس میں نمو اور زندگی کے کوئی آثار دکھائی نہیں دیں گے۔ لیکن اس بیج کو جب فطرت کے قانون کے مطابق اس مٹی میں ملا دیا جائے گا جس میں کسی شادابی اور شگفتگی کا نشان نہ تھا تو اس بیج سے 'حیاتِ تازہ' کو نپل کی شکل میں ابھر کر ایک دانہ کو سو سوداؤں میں منتقل کر دے گی۔ اگر کسی شخص نے بخر زمین سے روئیدگی پیدا ہوتے یا دانہ کو کو نپل بنتے نہ دیکھا ہو تو وہ کبھی باور نہیں کرے گا کہ ایسا ممکن ہے۔

لیکن یہ حیاتِ تازہ اسی زمین کو حاصل ہوگی جس میں روئیدگی پیدا کرنے کی صلاحیت ہو اور کو نپل اسی بیج سے پھوٹ سکے گی جس میں اگنے کی استعداد ہوگی۔ اس "اُگنے کی صلاحیت" سے کیا مراد ہے؟ یہی کہ اس بیج کے اندر زندگی موجود ہوتی ہے لیکن خوابیدہ شکل میں۔ اس کے بعد وہ بیدار ہو جاتی ہے۔ وہ پہلے مضمر تھی پھر شہود ہو گئی۔ پہلے ستر تھی پھر بارز ہو گئی۔ وہ کہیں باہر سے نہیں آئی۔ اس کے اندر موجود تھی لیکن ہماری نگاہوں سے پوشیدہ تھی۔ پہلے وہ (POTENT) تھی، پھر (ACTUALISE) ہو گئی۔ اگر اس بیج میں زندگی کی یہ صلاحیت باقی نہ رہے تو پھر اس سے کو نپل نہیں پھوٹے گی۔ قرآن کریم نے اس تشبیہ کو متعدد مقامات پر بیان کیا ہے اور اس کے بعد کہا ہے کہ **كَذٰلِكَ نُخْرِجُ النَّمُوْتِ** (۱۴/۵۱) "اور اسی طرح ہم مردوں کو حیات نو عطا کر دیتے ہیں۔" (نُخْرِجُ — یعنی جو زندگی ان کے اندر ستر تھی اسے باہر نکال لاتے ہیں۔ جس کے اندر زندہ رہنے کی صلاحیت نہ ہو اس سے باہر کیا نکلے گا؟) سورہ نحل میں ہے کہ خدا بادلوں سے بارش برساتا ہے۔ **فَاَخْيَا بِهٖ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا** (۱۶/۶۵) پھر اس سے زمین مردہ کو حیاتِ تازہ عطا ہو جاتی ہے۔ سورہ طہ میں یہ کچھ بیان کرنے کے بعد کہا کہ **اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی السُّبُوْحِ** (۲۰/۱۱)

اس محسوس مثال میں ارباب عقل و بصیرت کے لئے حقیقت تک پہنچنے کے نشانات راہ موجود ہیں سورہ حج میں ہے کہ اگر تمہیں مردوں کو زندگی عطا ہونے کے معاملہ میں شک ہو تو تخلیق انسانی کے مختلف مراحل پر غور کرو کہ بے جان مٹی سے اس کی ابتدا کر کے اسے کس طرح پیکر انسانی تک پہنچایا یا پھر زمین کی تازگی و سرسبزی دیکھو کہ وہ کس طرح نمودار ہوتی ہے۔ اسی طرح سے مردوں کو زندگی مل سکتی ہے (۲۲/۶)۔ سورہ عنکبوت میں ہے کہ اگر ان سے پوچھو کہ وہ کون ہے جو بادلوں سے بارش برسا کر زمین مردہ کو نئی زندگی عطا کر دیتا ہے تو یہ کہہ دیں گے کہ خدا ہی ایسا کرتا ہے۔ لیکن اس سے آگے وہ اپنی عقل سے کام نہیں لیتے (۲۹/۶۳)۔ سورہ روم میں ہے **فَإِنْظُرْ إِلَىٰ أَشْرٍ رَّحِمْتَ اللَّهُ كَيْفَ يُحْيِي الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا** خدا جس لطیف انداز سے سامانِ نشوونما عطا کرتا ہے اسے سمجھنا ہو تو یہ دیکھو کہ زمین مردہ کو کس طرح حیات تازہ ملتی ہے۔ **(إِنَّ ذَٰلِكَ لَمُعْجِزٌ لِّمُؤْتَىٰ)** بس اسی طرح وہ مردہ انسانوں کو زندگی عطا کر دیتا ہے۔ **وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ** (۳۰/۵۰) یہ سب کچھ ان پیمانوں (قوانین) کے مطابق ہوتا رہتا ہے جنہیں اس نے اپنے اختیار و ارادہ سے وضع کر رکھا ہے۔ (نیز ۳۹/۶۱)۔ سورہ ق میں اسی مثال کے بعد کہا کہ **كَذَٰلِكَ الْخُرُوجُ** (۵۰/۱۱) اسی طرح مردہ انسان دوبارہ جی اٹھتے ہیں۔ ان کی زندگی کی صلاحیت ابھر کر باہر آ جاتی ہے۔

سورہ فاطر میں زمین مردہ کو حیات تازہ عطا ہو جانے کی مثال کے بعد کہا کہ **كَذَٰلِكَ الْفُتُورُ** (۳۵/۹) اس لفظ (نشوونما) میں بجائے خویش حیات نو کے لئے اسی طریق عمل کا مفہوم مضمر ہے۔ اس لفظ کے بنیادی معنی کسی چیز کے کھل جانے اور شاخ درشاخ ہو جانے کے ہیں۔ لیکن اس کا اطلاق موسم بہار میں درختوں کے نئے نئے پتے لے آنے پر ہوتا ہے۔ **الْأَشْرُ** اس خشک گھاس کو بھی کہتے ہیں جو گرمی کے آخر میں بارش پڑنے سے دوبارہ اُگ آئے۔ **لَشَرَّتِ الْأَرْضُ فُتُورًا** کے معنی ہیں موسم بہار کے آنے سے زمین میں جان آگئی اور خوب پودے اُگے۔ سورہ زخرف میں ہے کہ خدا ایک انداز سے کے مطابق بادلوں سے بارش برساتا ہے۔ **فَأَنْشَرْنَا بِهِ بَلْدَاتًا مَّيْتًا** (۴۲/۱۱) پھر اس سے زمین مردہ پر تازہ بہار آ جاتی ہے۔ **كَذَٰلِكَ تُخْرَجُونَ** (۴۲/۱۱) اسی طرح تمہاری

زندگی کی شاخ خزاں دیدہ پر بھی بہارِ نو گلِ فشاں اور برگ ریز ہو سکتی ہے۔
ہم نے شروع میں کہا ہے کہ قرآن کریم کی رو سے حیاتِ نو مردہ اقوام کو بھی حاصل ہوتی ہے جب
نبی اکرمؐ نے دعوتِ انقلابِ عام کی تو مخالفین عرب اس کے مقابلہ کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ جماعت
مومنین کا دعوے تھا کہ فریقِ مخالف ان کے ہاتھوں شکست کھائے گا اور ان کی جماعت غالب رہے گی۔
مخالفین کو اپنی قوت اور شوکت پر اس قدر ناز تھا کہ وہ جماعتِ مومنین کے اس دعوے کا مذاق اڑاتے
تھے اور کہتے تھے کہ کمزوروں اور ناتوانوں کی یہ مسمیٰ بھر جماعت 'یہ مردے' ہم پر کیسے غالب آسکیں گے۔
قرآن کریم نے اکثر مقامات پر ان کے اس طنز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ انہیں معلوم نہیں کہ خدا کا
قانونِ حیات و ممات کس طرح مردوں کو حیاتِ نو عطا کرتا ہے۔ اس کا مشاہدہ یہ لوگ ابھی کر لیں گے۔
سورہ سجدہ میں پہلے کہا گیا کہ کیا ان لوگوں نے دیکھا نہیں کہ ان سے پہلے کتنی قومیں جو حق و صداقت کا
مقابلہ کرتی تھیں، تباہ و برباد ہو گئیں (۲۲/۲۶)۔ اس کے بعد ہے کہ کیا یہ لوگ اس کا مشاہدہ نہیں کرتے کہ
زمینِ مردہ کو کس طرح حیاتِ تازہ مل جاتی ہے۔ اسی قانون کے مطابق اس جماعت میں تو انایاں اُبھر
آئیں گی (۲۲/۲۶)۔ اس کے بعد ہے کہ یہ لوگ پوچھتے ہیں کہ ان لوگوں کو یہ فتح کب نصیب ہوگی (۲۲/۲۸)۔
جواب میں کہا کہ ان سے کہو کہ وہ دن ضرور آئے گا اور اس دن ان کا پچھتا نا کسی کام نہیں آسکے گا۔
ان آیات میں 'کمزور و ناتواں جماعت کے غلبہ و نصرت کو حیاتِ نو سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہی وہ حیاتِ
نو تھی جس کی طرف رسول اللہؐ دعوت دیا کرتے تھے۔ سورہ انفال میں ہے — اے جماعتِ مومنین! تم خدا
اور رسولؐ کی اس دعوت پر لَبَّيْكَ کہو۔ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ (۸/۲۴) جب وہ رسولؐ تمہیں
اس پر و گرام کی طرف بلائے جو تمہیں زندگی عطا کر دے گا۔ خود قرآن کریم کے متعلق کہا کہ لَيُنْذِرَ مَنْ كَانَ
حَيًّا (۳۶/۷۰) تم اس کے ذریعے انہی لوگوں کو راستے کی خطرناک گھاٹیوں سے آگاہ کر سکتے ہو جن میں زندگی
کی ریق ہو۔

وہ لوگ جن میں فکر و تدبیر کی صلاحیتیں مفقود ہو چکی ہوں یا جو ان صلاحیتوں سے کام ہی نہ لینا
چاہیں، انہیں بھی قرآن کریم نے مردہ کہہ کر پکارا ہے۔ چنانچہ رسول اللہؐ سے کہا گیا کہ اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ
الْمُوتٰی وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَاۗءَ اِذَا دَٰلُوْا مُدْبِرِیْنَ ۝۵ اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ
یُّؤْمِنُ بِآیٰتِنَا..... (۲۴/۸۰) تو نہ مردوں کو ناسکتا ہے اور نہ ہی تو پیروں کو ناسکتا ہے باغضوص جب

وہ پیٹھ موڑ کر چل دیں۔ تو تو انہی لوگوں کو ٹاسکتا ہے جو آیات خداوندی پر ایمان لائیں۔ (نیز ۵۲-۵۳/۳۰)۔
اس قسم کے مردوں کو زندگی ملنے سے مراد ان کا راہ ہدایت اختیار کر لینا ہے۔

جب حضرت ابراہیمؑ نے خدا سے عرض کیا تھا کہ وہ انہیں وہ طریقہ بتائے جس سے "مردہ" زندہ ہو سکتے ہیں تو اس سے ان کی مراد اسی قسم کے "مردوں" کو حیات نو عطا کرنا تھا (۲/۲۶۰) اور جب حضرت عیسیٰؑ نے کہا تھا کہ (اَرَیْتُ) اُمِّیَ الْمَوْتٰی بِاَذْنِ اللّٰهِ (۳/۴۸) میں قانون خداوندی کے مطابق مردوں کو زندہ کر سکتا ہوں، تو اس سے ان کی مراد بھی بنی اسرائیل جیسی مردہ قوم کو حیات نو عطا کرنا تھا۔ اس قوم کو جب بابل کی اسیری کے بعد دوبارہ وطن آنے کی اجازت ملی ہے اور اس طرح انہیں پھر سے اجتماعی زندگی نصیب ہوئی ہے، تو اسے بھی ان کی "موت کے بعد زندگی" سے تعبیر کیا گیا ہے (۲/۲۵۹)۔

يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ

قرآن کریم میں متعدد مقامات پر آتا ہے يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَ يُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ (۱۰/۳۱) (۶/۹۶)۔ اس کا عام ترجمہ ہے کہ "خدا مردہ سے زندہ نکالتا ہے اور زندہ سے مردہ"۔ سورہ روم میں ان الفاظ کے بعد ہے وَ يُخْرِجُ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ وَ كَذٰلِكَ تُخْرَجُونَ ۝ (۳۰/۱۹) وہ زمین مردہ کو نئی زندگی عطا کرتا ہے اور اس طرح تمہیں نکال کھڑا کرے گا۔ ان الفاظ کا مفہوم یا تو یہ ہو سکتا ہے کہ

- (۱) ہر جاندار جسم میں یہ سلسلہ برآں جاری و ساری رہتا ہے کہ اس میں لاکھوں کی تعداد میں (CELLS) مرتے رہتے ہیں اور ان کی جگہ نئے جڑوے بنتے رہتے ہیں۔ یا
- (۲) نباتات میں روئیدگی کا سلسلہ کہ (بظاہر) مردہ تخم سے تروتازہ فصلیں لہلہاتی ہیں اور پھر ان فصلوں سے اس قسم کے خشک دلنے پیدا ہو جاتے ہیں۔ یا
- (۳) زندہ قوموں کا زوال پذیر ہو جانا اور پامال شدہ قوموں میں از سر نو حیات تازہ کی نمود ہو جانا یا
- (۴) زندہ انسانوں کا مرجانا — اور مردوں کا پھر جی اٹھنا۔

سلسلہ موت و حیات

موت و حیات کا یہ سلسلہ خدا کے قانون کے ساتھ وابستہ ہے۔ اس کے لئے قرآن کریم میں متعدد

مقامات میں آیا ہے کہ وَاللّٰهُ يُحْيِي وَيُمِيتُ (۳/۱۵۵) وہی زندگی عطا کرتا ہے وہی مارتا ہے۔ سورۃ یونس میں ہے۔ هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ وَ اِلَيْهِ تُرْجَعُونَ (۱۰/۵۶)۔ (اِلَيْهِ تُرْجَعُونَ۔ خدا کی طرف ”جانے“ کا مفہوم پہلے بیان ہو چکا ہے)۔ (یہی مضمون ان مزید آیات میں بھی آیا ہے (۲۳/۸۰؛ ۲۲/۶؛ ۲۴/۱۲؛ ۴۰/۴۸؛ ۴۲/۹؛ ۴۴/۸؛ ۵۰/۲۳؛ ۵۶/۲)۔ سورۃ روم میں ہے کہ اللہ نے تمہیں پیدا کیا۔ پھر وہ تمہیں سامانِ زیست عطا کرتا ہے۔ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ (۳۰/۴۰) پھر وہ تم پر موت وارد کرتا ہے اور اس کے بعد پھر زندہ کرے گا۔ کیا تمہارے معبودانِ باطل میں سے کوئی ایسا کر سکتا ہے؟ سورۃ جاثیہ میں ہے کہ خدا تمہیں زندگی عطا کرتا ہے اور پھر اس کے قانونِ طبعی کے مطابق تم مرجاتے ہو۔ ثُمَّ يَجْمَعُكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ (۲۵/۲۶) پھر وہ تمہیں قیامت کے دن جمع کرے گا جس کے آنے میں کوئی شک و شبہ نہیں۔ (”قیامت میں جمع کرنے کا“ مفہوم پہلے بیان ہو چکا ہے)۔

موت ہر ایک کے لئے ہے

قرآن کریم کے متعدد مقامات میں یہ بھی آیا ہے کہ موت ہر ایک کے لئے ہے۔ كُلُّ نَفْسٍ ذٰلِقَةٌ الْمَوْتِ (۳/۱۸۴)۔ خواہ کوئی شخص محکم قلعوں کے اندر بھی مستور و محصور کیوں نہ ہو، موت اسے وہاں بھی آو بوجھے گی (۴۲/۸)؛ (۴/۶۸)۔ خود رسول اللہ کے متعلق کہا کہ اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّ اِنَّهُمْ مَيِّتُونَ (۳۹/۳۹)۔ ”تو نے بھی مرنا ہے انہوں نے بھی مرنا ہے“۔ سورۃ بقرہ میں ہے کہ تم قوانینِ خداوندی کا انکار کس طرح کر سکتے ہو۔ تم مردہ تھے اس نے تمہیں زندگی عطا کی۔ تم پھر مر جاؤ گے اور اس کے بعد تمہیں پھر زندگی ملیگی (۲/۲۸)۔ انہی کو سورۃ مؤمن میں ”دو موتیں اور دو زندگیاں“ کہہ کر پکارا گیا ہے (۲/۱۱)۔

موت خدا کے قانونِ طبعی کے مطابق واقع ہوتی ہے اور جو امور قوانینِ طبعی یا قوانینِ فطرت کے مطابق سرانجام پاتے ہیں انہیں قرآنی اصطلاح میں ملائکہ کی کارفرمائی قرار دیا جاتا ہے اسی لئے موت کے متعلق بھی کہا گیا ہے کہ یہ ملائکہ کے ہاتھوں سرانجام پاتی ہے اور سکرانِ موت کے وقت مرنے والے پر جو کیفیت طاری ہوتی ہے اور جس طرح اس کی عمر گزشتہ کے تمام ایسے واقعات جنہوں نے اس کے شعور اور

غیر شعور پر گہرے نقوش چھوڑے ہوں، سینما کی فلم کی طرح اس کے حافظہ کے قرطاس پر نمودار ہو جاتے ہیں۔ قرآن نے انہیں (محسوس طور پر سمجھانے کی غرض سے) ملائکہ کی گفتگو سے تعبیر کیا ہے۔ (مثلاً ۹۴/۱۴، ۳۷/۷۷، ۲۸/۱۴، ۳۲/۱۱، ۵۰/۱۹)۔ کہیں اس تلخ یاد اور احساسِ زیاں کو عذاب سے تعبیر کیا گیا ہے (۸۵/۱۸، ۲۷/۷۷) ان کے برعکس، مومنین کی موت ہے جس میں انہیں موجودہ زندگی سے کہیں زیادہ خوشگوار اور پُر آسائش زندگی کی خوشخبریاں ملتی ہیں اس لئے وہ نہایت خندہ پیشانی سے اس کا استقبال کرتے ہیں (۱۴/۳۲)۔

زمین کے متعلق کہا ہے کہ اس میں انسانوں کے لئے جائے قرار (ٹھہرنے کی جگہ) ہے، لیکن ایک مدت معینہ کے لئے ہمیشہ کے لئے نہیں۔ وَ لَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَ مَتَاعٌ اِلٰی حِينٍ ۝ (۲/۳۶) (۷/۲۴) ”تمہارے لئے اس میں جائے قرار ہے اور ایک مدت تک کے لئے سامانِ زیست۔ دوسری جگہ فَمُسْتَقَرٌّ وَ مَسْتَوْدَعٌ“ کہا (۹۹/۶) (۱۱/۶) یعنی زمین میں تمہارا عارضی مستقر ہے اور اس کے بعد یہی مستقر تمہیں زندگی کے اگلے مرحلے کی سپردگی میں دے دیتا ہے (مَسْتَوْدَعٌ سے یہی مفہوم ہے)۔ چونکہ موت کے بعد انسانی جسم منتشر ہو کر کسی نہ کسی شکل میں کرۂ ارض کے مادی اجزاء میں مل جاتا ہے (خواہ وہ دفن کرنے کے بعد ہو، جلانے کے بعد یا لاش کے ویسے ہی بوسیدہ ہو جانے کے بعد) اس لئے قرآن نے اکثر مقامات پر اسے اس انداز سے بیان کیا ہے کہ فِيْهَا تُحْيَوْنَ وَ فِيْهَا تَمُوْتُوْنَ وَ مِنْهَا تُخْرَجُوْنَ ۝ (۷/۲۵) تم اس زمین پر زندگی بسر کرو گے۔ اسی میں تمہیں موت آئے گی اور اسی سے تم پھر حیات نو حاصل کر کے نکالے جاؤ گے۔ (اس نکتہ کی وضاحت آگے چل کر آئے گی)۔



چودھواں باب

مردوں کا زندہ ہونا

اب ہم اس موضوع کے اس گوشے تک آ پہنچے جس کا تعلق ایک فرد کی طبیعی موت کے بعد اس کے دوبارہ زندہ ہونے سے ہے۔ اسے حَيَاتِ بَعْدَ الْمَمَاتِ یا حیاتِ آخرت کہتے ہیں۔ یہ اس بحث کا نازک ترین گوشہ ہے۔ اس کے لئے پہلے انسان کی موجودہ زندگی کے متعلق کچھ سمجھ لینا ضروری ہے۔

انسانی پیدائش

مَدَّانِ کریم میں ہے۔

هَلْ آتَى عَلَى الْإِنْسَانِ حِينٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا
مَّذْكُورًا ۝ (۷۹/۱)۔

کیا انسان پر ایک ایسا وقت نہیں گذرا جب یہ کوئی قابل ذکر شے نہیں تھا؟

پھر وہ ہمیں بتاتا ہے کہ

(۱) انسانی تخلیق کی ابتدا ”مٹی“ (بے جان مادہ) سے ہوئی (۲۲/۷)۔ لیکن بے جان مادہ

(INORGANIC MATTER) میں تو زندگی کے آثار نہیں ہوتے، زندگی کا مدار پانی پر ہے۔

اس لئے کہا کہ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ (پانی ہم نے پانی سے ہر شے میں زندگی کی نمود پیدا کی۔ لہذا زندگی کی ابتدا طینِ لازب — (پانی کے ساتھ ملی ہوئی چھپی مٹی) سے

ہوئی (۱۱/۱۳۷)۔ یہ وہی مٹی ہے جو جو بطروں کے کنارے جمی ہوئی سیاہ رنگ کا کچھڑ ہوتی ہے اور سوکھ کر کھٹکنے لگ جاتی ہے (۱۵/۲۶۱)۔

(۲) اس طرح پانی اور مٹی کے ملنے سے 'زندگی کا اولین جراثیمہ (LIFE CELL) وجود میں آیا جہاں سے زندگی مختلف مراحل طے کرتی ہوئی 'شاخ در شاخ' آگے بڑھتی اور پھر بدلتی چلی گئی زندگی کے اس اولین جراثیمہ کو اس نے "نفس واحدہ" کہہ کر پکارا ہے اس لئے کہ (UNI-CELLULAR) ہوتا ہے۔ اس میں ہنوز نر اور مادہ کی تفریق نہیں ہوتی۔ قرآن کریم نے جہاں کہا ہے کہ اَنْشَاَ کُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ (۹۹/۶۷) تو اس سے مراد زندگی کا یہی اولین جراثیمہ ہے۔

(۳) اس طرح زندگی 'ارض (بے جان مادہ) سے اُگی اور اس کی شاخیں مختلف سمتوں میں پھیل گئیں۔ ان میں سے ایک شاخ وہ تھی جس میں زندگی بذریعہ توالد و تناسل (نطفہ کے ذریعہ) آگے بڑھتی ہے۔ قرآن کریم میں ہے وَ اللّٰهُ اَنْزَلَ کُمْ مِّنْ الْاَرْضِ نَبَاتًا (۷۱/۷۱)۔ اَنَّا خَلَقْنَا کُلَّ شَيْءٍ نُّطْفَئَةٍ (۷۷/۳۶)۔ اس مقام تک 'عام حیوانات اور انسان کی پیدائش کے مراحل مشترک ہیں۔ حتیٰ کہ انسانی بچہ بھی رحمِ مادر میں انہی مراحل میں سے گزرتا ہے جن میں سے دیگر حیوانات کے جنین گزرتے ہیں۔ اس کے بعد انسان میں ایک امتیازی خصوصیت پیدا ہوتی ہے جو اسے دیگر حیوانات سے منفرد کر دیتی ہے۔ یہ مقام بڑا غور طلب ہے کیونکہ یہی درحقیقت وہ مقام ہے جہاں سے قرآن کا عطا کردہ تصویری حیات مادہ پرست مغرب کے تصویری حیات سے الگ ہو جاتا ہے اور یہی وہ خصوصیت ہے جس پر دین کی ساری عمارت استوار ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں سورہ سجدہ کی یہ آیات بڑی غور طلب ہیں۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْ السَّمٰوٰتِ اِلٰى الْاَرْضِ ثُمَّ يَخْرُجُ اِلَيْكُمْ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ (۵۱/۳۲) خدا کے عالمِ مشیت میں ایک اسکیم طے پاتی ہے۔ اس کے بعد اُسے عملاً متشکل کرنے کے لئے وہ اس کا آغاز زمین سے کرتا ہے۔ اس طرح اس اسکیم کا گویا بیج بویا جاتا ہے۔ پھر وہ اسکیم اپنے ارتقائی منازل طے کرتی 'بتدریج اپنے مقام تکمیل تک پہنچتی ہے۔ وہ ان مراحل کو "خدا کے ایک ایک دن" میں طے کرتی ہے اور خدا کا ایک ایک دن تمہارے حساب اور شمار سے ہزار ہزار سال کے برابر ہوتا ہے۔ اس طرح وہ اسکیم ہزار ہا سال کے عرصہ میں اپنے نقطہ آغاز سے مقام تکمیل تک پہنچتی ہے۔ اسی اسکیم کی ایک کڑی انسانی تخلیق ہے وَ بَدَا خَلْقَ الْاِنْسَانِ

مِنْ طِينٍ ۝ (۳۲/۷) تخلیق انسانی کی ابتدا بے جان مادہ سے ہوئی اور اس طرح زندگی اپنے ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی حیوانی سطح پر آگئی جہاں جَعَلَ نَسْلَهُ مِنْ سُلَالَةٍ مِّنْ مَّاءٍ مَّهِينٍ (۳۲/۸) انسان کی پیدائش بذریعہ تولید قرار پائی۔ یہاں تک انسان اور حیوانات کے سلسلہ تخلیق میں کوئی فرق نہیں تھا۔ دونوں ایک ہی مراحل سے گزر رہے تھے۔ لیکن اس کے بعد انسانی سلسلہ حیوانی سلسلہ سے الگ ہو گیا اور وہ اس طرح کہ تَمَّ سَوَّاهُ وَ نَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوحِيْهِ (۳۲/۹) خدا نے انسان میں ایک خاص اعتدال پیدا کر کے اس میں اپنی روح کا ایک شمع ڈال دیا۔ یہ ہے انسان کا ماہر الاتیاز درجہ۔ یعنی اس میں الوہیاتی توانائی (DIVINE ENERGY) کا ایک شمع آگیا۔ یہی وہ شے ہے جسے انسانی ذات (HUMAN PERSONALITY) کہا جاتا ہے۔ اسی سے یہ صاحب اختیار دارادہ انسان بن گیا۔ وَ جَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ الْاَفْئِدَةَ ۝ (۳۲/۱۰) اسے سماعت و بصارت (یعنی ذرائع علم اعطا کئے گئے اور اس کے ساتھ ہی فؤاد (MIND) بھی جس سے یہ فیصلے کرنے کے قابل ہو گیا۔ اور جب یہ خود فیصلے کرنے کے قابل ہو گیا تو اس پر اس کے اعمال کی ذمہ داری بھی عائد ہو گئی۔ ان آیات میں پہلے ان کا ذکر غائب کے صیغہ (3RD PERSON) میں ہوتا چلا آ رہا تھا لیکن اس "نفخ روح" کے بعد اسے مخاطب کے صیغہ (2ND PERSON) سے پکارا گیا۔ "تم" اسے ہی کہا جاسکتا ہے جو اپنے آپ کو "میں" کہہ سکے اور یہ انسان کی "میں" (1-AM-NESS) ہی ہے جو اسے منفرد حیثیت (INDIVIDUALITY) عطا کرتی ہے۔

سورہ مومنون میں 'انسانی جنین کے مختلف مراحل کا ذکر کرنے کے بعد کہا کہ نَسَحَ اَنْشَانُهُ خَلْقًا اٰخَرَ ۝ (۲۳/۱۴) پھر ہم نے اسے ایک ایسی تخلیق عطا کی جو اس سلسلہ کی پہلی

لے اس مقام پر ہم اس تفصیل میں نہیں جانا چاہتے کہ عصر حاضر کے مفکرین اور سائنسدان کس طرح اس کے معترف ہیں کہ ان صرف اس کے جسم کا نام نہیں۔ اس میں جسم کے علاوہ ایک اور شے بھی ہے جسے انسانی ذات کہا جاتا ہے۔ اس سلسلہ پر میں نے اپنی کتاب "اسلام کیا ہے؟" میں تفصیلی گفتگو کی ہے یہاں صرف قرآن کی بیان کردہ تصریحات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

کڑیوں سے بالکل مختلف تھی۔ یہ (انسانی ذات) نہ جسم کا حصہ ہوتی ہے اور نہ ہی طبیعی قوانین کے تابع۔ اس لئے موت انسان کے جسم پر وارد ہوتی ہے اس کی ذات پر نہیں۔ اس لئے یہ جسم کے انتشار (DISINTEGRATION) کے بعد بھی باقی رہ سکتی ہے۔ اس کی بقا کا نام حیات بعد الممات ہے۔ انسانی ذات، ہر انسانی بچہ کو یکساں طور پر ملتی ہے لیکن یہ ہوتی ہے غیر نشوونما یافتہ شکل (UN-DEVELOPED FORM) میں۔ انسان کے صحیح اعمال سے انہیں تشریف آں اعمال صالح کہہ کر پکارتا ہے اس کی نشوونما ہوتی جاتی ہے۔ تشریف آں کے الفاظ میں، اس میں اس طرح ارتکاز (CRYSTALLISATION) پیدا ہو جاتا ہے۔ سورہ نوح میں ہے۔ وَ قَدْ خَلَقْكُمْ أَطْوَارًا (۱۱/۱۴) خدا نے تمہیں مختلف مراحل میں سے گزار کر بہت درجہ پیکر انسانی تک پہنچایا ہے۔ مَا لَكُمْ لَا تَرْجُونَ لِلَّهِ وَقَارًا (۱۱/۱۳) اب تمہیں یہ چاہیے کہ خدا سے یہ چاہو کہ تمہاری ذات میں ایک "وقار" (ٹھیکرا) پیدا ہو جائے۔ یہ اپنے مقام پر "بخود خنزیرہ و محکم چوں کوہ ساراں" ہو جائے۔ اس میں استحکام (STABILITY) آجائے۔ اسی کو حیات جاوید (IMMORALITY) کہتے ہیں۔ تشریف آں کی رو سے انسان کی موجودہ ہیئت، اس کے سلسلہ ارتقار کی آخری کڑی نہیں۔ زندگی کی موجودہ سطح پر ارتقار کی سابقہ کڑیوں کے بعد، سلسلہ جدید کی نئی کڑی کی نمود ہوتی ہے۔ اب جسم کی موت کے بعد، اس نئے سلسلہ کا ارتقار شروع ہو گا۔ اسے اخروی زندگی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ تشریف آں میں ہے۔ لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ ۝ ۱۸۳/۱۹۱ تم درجہ بدرجہ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ بلند ہوتے چلے جاؤ گے۔ دوسری جگہ اسے آغاز کے بعد گردشیں دیتے ہوئے آگے لے جانے سے تعبیر کیا گیا ہے ۱ وَ هُوَ يُبْدِيهِ ۡ وَ يُعِيدُهُ ۱۸۵/۱۳۱۔ لیکن انسانی زندگی کی یہ گردشیں، اس زمین پر نہیں ہوتیں۔ یعنی انسان مرنے کے بعد دوبارہ اس زمین پر زندہ نہیں ہوتا۔ یہ یونانیوں (ادراں سے مستعار لے کر ہندوؤں کا فلسفہ تناسخ ہے جس کی رو سے وہ مانتے ہیں کہ موت کے بعد انسانی روح پھر اس دنیا میں، ایک نئے پیکر میں جنم لیتی ہے۔ قرآن اس کی تردید کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مرنے کے بعد، انسان اس دنیا میں دوبارہ نہیں آسکتا۔ سورہ مومنون میں ہے۔

حَتَّىٰ إِذَا جَاءَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُونِ ۚ لَعَلِّي

أَعْمَلُ صَالِحًا فِيمَا تَرَكْتُ كَلَّا إِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَائِلُهَا وَمِنْ
دَرَابِئِهِمْ بُرْزَخٌ إِلَى يَوْمِ يُبْعَثُونَ ۝ (۹۹-۱۰۰/۲۳)

تا آنکہ جب ان لوگوں کے سر ہانے جو غلط راستے پر چلتے تھے (موت اکھڑی ہوتی ہے تو وہ
کہتا ہے کہ اے میرے پروردگار! اگر تو مجھے ایک بار پھر دنیا میں واپس بھیج دے تو میں
بہت اچھے اچھے کام کروں۔ اس سے کہا جائے گا کہ یہ تیری آرزوئے خام ہے۔ اب
ایسا نہیں ہو سکتا۔ ان مرنے والوں کے پیچھے قیامت تک پردہ حائل ہے۔ اب یہ
پیچھے نہیں جاسکتے۔

سورہ شعرا میں ہے کہ اہل جہنم قیامت میں کہیں گے کہ فَلَوْ آتَ لَنَا كَرَّةٌ فَتَكُونُ مِنْ
الْمُؤْمِنِينَ ۝ (۲۶/۱۰۲) ہم کہیں ایک بار پھر دنیا کی طرف لوٹ سکیں تو ہم بھی ایمان والوں میں سے ہو
کر بتائیں (نیز ۵۸/۵۹؛ ۵۳/۷۴)۔ وقت کا دھارا پیچھے کی طرف مڑا ہی نہیں کرتا۔ یہ یا تو ایک مقام پر رک
جاتا ہے (جیسے جسم کی موت کے سلسلہ میں) اور یا آگے بڑھتا ہے۔ انسانی ذات کے اس دنیاوی
زندگی سے آگے بڑھ جانے کی صورت میں (اقبال کے الفاظ میں

زندگی جوئے رواں است و رواں خواہد بود

ایں منے کہنہ جوان است و جوان خواہد بود

انسانی ذات کی بیداری کا نام خود آگہی یا شعور خویش (SELF-CONSCIOUSNESS) ہے۔
یہی شعور خویش 'مرنے کے بعد آگے چلتا ہے۔ سورہ زمر میں اسے بڑے لطیف انداز سے بیان
کیا گیا ہے جہاں کہا ہے کہ اللَّهُ يَتَوَفَّى الْأَنفُسَ حِينَ مَوْتِهَا وَالَّتِي لَمْ تَمُتْ فِي
مَنَامِهَا مَوْتَ أَرْبَعِينَ يَوْمًا ثُمَّ يَرْجِلُهَا بِرَأْسِهَا وَيُنْفِثُ فِيهَا الرُّوحَ ثُمَّ يَتَوَفَّى الْأَنفُسَ
الَّتِي قُتِلَتْ فِي الْحَرْبِ وَالَّتِي لَمْ يُكَلِّمْهَا اللَّهُ فِي شَيْءٍ مِّن دِينِهَا أَلَّذِينَ هُمْ عَنْ آلِهَتِهِمْ كَاذِبُونَ
فِي الْمَوْتِ أُولَٰئِكَ لِيُصْبِرُوا أُولَٰئِكَ هُمُ الصَّابِرُونَ ۝ (۳۹/۴۲) اس
میں ان لوگوں کے لئے جو غور و فکر کرتے ہیں حقیقت تک پہنچنے کی بہت بڑی نشانیاں ہیں۔ اسی شعور
خویش کی بیداری سے انسان انسان کہلانے کا مستحق ہوتا ہے۔ یہ باقی نہ رہے تو انسان حیوانات کی

سطح پر زندگی بسر کرتا ہے اور یہ شرفِ انسانیت کی انتہائی تزیین، فلہذا ذی احساس انسان کے لئے شدید ترین الم انگیز عذاب ہے۔ اسی لئے جماعتِ مومنین کو متنبہ کیا گیا کہ **وَلَوْ تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللَّهَ فَأَنْسَاهُمْ أَنْفُسَهُمْ** (۵۹/۱۹) دیکھنا! تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے ”خدا کو بھلا دیا“ تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خود اپنے آپ ہی کو فراموش کر بیٹھے۔ ان میں احساسِ ذات ہی مٹ گیا۔ وہ انسانی سطح سے گر کر حیوانی سطح پر پہنچ گئے۔ سورۃ محمد میں ہے کہ **ذَ الَّذِينَ كَفَرُوا يَتَمَتَّعُونَ وَيَأْكُلُونَ كَمَا تَأْكُلُ الْأَنْعَامُ** (۲۴/۱۲) جو لوگ اس حقیقت سے انکار کرتے ہیں ان کی زندگی بس حیوانی سطح کی رہ جاتی ہے۔ وہ حیوانوں کی طرح کھاتے پیتے اور سامانِ زیست سے متمتع ہوتے ہیں۔

حیاتِ اخروی کے منکرین کی عام دلیل یہ ہوتی ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ انسانی جسم مرنے کے بعد گل سڑ کر ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے۔ وہ مختلف عناصر میں تبدیل ہو جاتا ہے اور اس طرح اپنے مادی مشتقات کے ساتھ مل جاتا ہے۔ اس لئے انسان کے دوبارہ زندہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ (ان منکرین کے مختلف اعتراضات کا تفصیلی تذکرہ ذرا آگے چل کر سامنے آئے گا)۔ **وَلَقَدْ آتَيْنَاكَ مَا تَدْرُسُ ۖ فَذَرْهُمْ حَتَّىٰ يَبْغُضُوا** (۱۰۰/۲) **عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْأَرْضُ مِنْهُمْ**۔ ہم جانتے ہیں کہ انسان کا کونسا حصہ ہے جسے زمین کم کر دیتی ہے (اور کیا چیز باقی رہ جاتی ہے)۔ **وَعِنْدَنَا كِتَابٌ حَفِيزٌ** (۵۰/۴) ہمارے پاس ایک قانون ایسا بھی ہے جو اس کے باقی رہنے والے حصے کو محفوظ کر لیتا ہے۔

اس محفوظ شدہ ”شے“ (انسانی ذات) کی تخلیق تو کس طرح ہوگی۔ اس کا پیکر کس قسم کا ہوگا۔ اس کی کیفیت کیا ہوگی۔ ہم اپنے شعور کی موجودہ سطح پر اس کا ادراک نہیں کر سکتے۔ ہمارا حیطۂ ادراک تو محسوسات تک محدود ہے اور وہ زندگی اس محسوس دنیا کی زندگی نہیں ہوگی۔ اس لئے ہم اس کا احاطہ نہیں کر سکتے۔ لیکن **وَلَقَدْ آتَيْنَاكَ مَا تَدْرُسُ** (۱۰۰/۲) (بار بار یہ کہنے کے باوجود کہ وہ اس زندگی سے بالکل مختلف انداز کی ہوگی) اسے سمجھایا ہے موجودہ زندگی کی تشبیہات اور تمثیلات کی رُو سے۔ اس کے سوا ہمارے لئے سمجھنے کا اور کوئی طریق ہو نہیں سکتا تھا۔ مثلاً عام انسان دیکھتے ہیں کہ انسانی لاش کو زمین میں دفن کر دیا جاتا ہے۔ تو **وَلَقَدْ آتَيْنَاكَ مَا تَدْرُسُ** کو اس طرح سمجھایا جیسے وہ قبروں سے نکل کھڑے ہوں گے۔ (مثلاً) بنی آدم کو مخاطب کر کے کہا گیا کہ **فِيهَا تَحْيَوْنَ وَفِيهَا تَمُوتُونَ وَفِيهَا**

تُخْرِجُونَ ۵ (۴/۲۵) تمہیں اس زمین پر رہنا ہے، اسی میں مرنا ہے اور اس سے تمہیں پھر نکال کر کھڑا کیا جائے گا۔ سورہ طہ میں ہے: مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ وَ فِيهَا نُعِيدُكُمْ وَ مِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً ۵ اخروی ۵ (۲۰/۵۵) تمہیں ہم نے زمین سے پیدا کیا، اسی میں ہم تمہیں لوٹا دیں گے اور پھر اسی سے تمہاری تخلیق نو ہوگی۔ ہمیں یہ معلوم ہے کہ انسان کا پتلا بنا بنایا زمین سے باہر نہیں آگیا تھا۔ "زمین سے پیدا کرنے" سے مراد زندگی کا آغاز تھا۔ سموت کے بعد زمین سے بار دیگر پیدا کرنے سے بھی مراد یہ نہیں کہ قبروں سے انسانی جسم زندہ ہو کر اٹھ کھڑے ہوں گے اس کے تجدید حیات مقصود ہے دوسرے مقام پر ہے: وَ اللّٰهُ اَنْبَتَكُمْ مِنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا ۵ ثُمَّ يُعِيدُكُمْ فِيْهَا وَ يُخْرِجُكُمْ [مُخْرَجًا] ۵ (۱۴۱-۱۸/۴۱) خدا نے تمہیں زمین سے نباتات کی طرح اگایا۔ پھر تمہیں اسی میں لوٹا دیتا ہے اور پھر تمہیں دوبارہ نکالے گا۔ ایک (جدید انداز) کا نکالنا۔ کہیں کہا ہے کہ اَنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُورِ ۵ (۲۲/۷) خدا انہیں کھڑا کرے گا جو قبروں میں ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہاں یہ مراد نہیں ہو سکتی کہ قبروں میں سے مردوں کو اٹھا کھڑا کرے گا، اس لئے کہ ایسی صورت میں ان مردوں کا کیا ہوگا جو قبروں میں دفن نہیں کئے جاتے۔ جلا دیئے جاتے ہیں۔ پانی میں بہا دیئے جاتے ہیں۔ یونہی پھینک دیئے جاتے ہیں۔ بجلی کی رو سے راکھ بنا دیئے جاتے ہیں۔ مقصد اس سے کبھی محض سمجھانا ہے۔ بعض مقامات پر قبور کے بجائے اَجْدَاثُ کہا گیا ہے۔ (مثلاً ۵۱/۳۶، ۴۳/۵۴، ۴۲/۷۰)۔ سورہ یس میں مَرَقَدٌ بھی کہا گیا ہے جس کے معنی خواہگاہ کے ہوتے ہیں (۳۶/۵۲)۔ کہیں کہا ہے کہ وہ تمہیں آواز دے کر بلائے گا اور تم زمین سے نکل کھڑے ہو گے (۳۰/۲۵)۔ ان لوگوں کے اعتراض میں (جو کہتے ہیں کہ جب جسم انسانی ریزہ ریزہ ہو جائے تو پھر ان کس طرح دوبارہ زندہ ہو سکے گا) کہا کہ ہم تو اس پر بھی تادریں کہ اس کی پور پور کو درست کر دیں (۴۵/۴۱)۔ یعنی ان تمام قوتوں میں از سر نو اعتدال پیدا کر دیں جن سے یہ اپنے امور پر گرفت کر سکتا تھا۔

لیکن ان محسوس مثالوں سے بات سمجھانے کے ساتھ ہی اس کی بھی وضاحت کر دی کہ اُس زندگی میں یہ انسانی پس کر نہیں ہوگا۔ وہ اس قسم کی تخلیق (انشاء ثانیہ) ہوگی جسے تم اس وقت سمجھ نہیں سکتے۔ کہا کہ ہم اس پر قادر ہیں۔

عَلٰی اَنْ تَبَدِّلَ اَمْثَالَكُمْ نُنْشِئُكُمْ فِیْ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۵ (۵۶/۶۱-۶۰)

کہ تمہارے پسکروں کو بدل دیں اور تمہیں ایسی کیفیت کے ساتھ زندہ کریں جسے تم اس وقت سمجھ نہیں سکتے۔

سورۃ لقمان میں اس سلسلہ میں ایک بڑا لطیف اشارہ ملتا ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ انسانی تخلیق کی ابتدا کے سلسلہ میں کہا تھا کہ اسے ”نفس واحدہ“ سے پیدا کیا۔ یعنی بے جان مادہ کے ساتھ پانی کی آمیزش سے زندگی کا پہلا جرثومہ ظہور میں آگیا۔ ظاہر ہے یہ جرثومہ اس آب و گل کے امتزاج ہی سے ظہور میں آیا تھا لیکن ان خصوصیات کا حامل تھا جو نہ آب میں تھیں نہ گل میں۔ یہ تخلیق نوان سے یکسر مختلف تھی اس حقیقت کو سامنے لاتے ہوئے کہا کہ

مَا خَلَقْكُمْ ۚ لَا بَعَثْكُمْ إِلَّا كَنَفْسٍ وَاحِدَةٍ (۲۱/۲۸)

تمہاری (اولیں) تخلیق اور دوبارہ بعثت ”نفس واحدہ“ کی طرح ہے۔

جس طرح وہ اولیں جرثومہ حیات اپنے غیر ذی حیات ذرائع کو پیچھے چھوڑ کر ایک جدید کیفیت کا حامل بن گیا تھا، اسی طرح انسانی ذات اپنے موجودہ خاکی پیکر (یا مرکب) کو پیچھے چھوڑ کر سفر حیات کی ایک ایسی راہ میں داخل ہو جائے گی جس کا ہم اس وقت تصور تک بھی نہیں کر سکتے۔

یہ جسمانی پیکر تو بدل جائے گا لیکن ہر فرد کا شعور خویش بدستور باقی رہے گا۔ اس لئے کہ شعور خویش کی حامل ذات، اس جسم کی کینچلی کو آمار کر آگے نکل جائے گی۔ انسان اپنی انفرادیت لئے آگے جائے گا۔ سورۃ انعام میں ہے۔

وَلَقَدْ يَحْشُمُونَا فُرَادٰی كَمَا خَلَقْنَاكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۚ وَ تَرْكُمُ مَا خَوَّلْنَاكُمْ

وَرَاۤءَ ظُهُورِكُمْ ۚ (۶/۵۵)

ہم نے جس طرح تمہیں پہلی بار پیدا کیا تھا، تم اسی طرح اپنی انفرادیت لئے ہمارے پاس آؤ گے اور جو اضافی چیزیں تمہیں ملی تھیں ان سب کو پیچھے چھوڑ دو گے۔

دوسری جگہ ہے۔ وَ يٰۤاٰتِنَا فَرْدًا (۱۹/۸۰ : ۱۹/۹۵) تم اپنی انفرادیت کے ساتھ ہمارے پاس آؤ گے۔ انسان کا اعمال نامہ ”جو زندگی بھر ایک لپٹی ہوئی کتاب کی طرح تھا کھل کر سامنے آجائے گا اور اس سے کہا جائے گا کہ اِقْرَأْ كِتَابَكَ، تو اپنے اعمال نامہ کو آپ پڑھ۔ کَفٰیٰ بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلٰیكَ حَسِبًا ۝ (۱۴/۱۳) آج تو اپنا محاسبہ کرنے کے لئے آپ کافی ہے۔ اس وقت انسان اپنے خلاف آپ

گو ایسی دے گا (۱۶/۳۷)۔ بَلِ الْإِنْسَانُ عَلَىٰ نَفْسِهِ بَصِيرَةٌ ۚ (۵۵/۱۴) وہ اپنے خلاف آپ صبح صبح بات بیان کر دے گا۔ سورہ نخل میں ہے کہ یَوْمَ تَأْتِي كُلُّ نَفْسٍ تَجَادِلُ عَنْ نَفْسِهَا (۱۱۱/۱۱) اس دن ہر شخص خود اپنے خلاف آپ جھگڑا کرے گا۔ اس دنیاوی زندگی میں اس کی مفاد پرستی نے جن کاموں کو بڑا مرتب کر کے دکھایا تھا وہ پکاراٹھے کہ وہ غلط تھے۔ سورہ ق میں ہے کہ اس سے کہا جائے گا کہ فَكشَفْنَا عَنْكَ غِطَاءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيدٌ ۝ (۵۰/۲۲) اس وقت تیری آنکھوں پر پردہ پڑے رہنے لگے جس کی وجہ سے تو حقیقت کو دیکھ نہیں سکتا تھا۔ آج وہ پردے اٹھ چکے ہیں اور تیری نگاہ اس قدر تیز ہو چکی ہے کہ وہ ہر شے کے آپار ہو سکتی ہے۔ اب کوئی بات تجھ سے چھپی ہوئی نہیں رہ سکتی۔ یَوْمَ تُبْنَى السُّورُ (۸۶/۹) اس دن ہر راز افشا ہو جائے گا۔ جن لوگوں سے جھپا کر یہ کچھ کیا تھا وہ سب وہاں موجود ہوں گے۔ يَتَعَارَفُونَ بَيْنَهُمْ ۝ (۱۰/۴۵) اور ایک دوسرے کو پہچانے ہوں گے۔ جن غلط صلاح کار دوستوں کے ہسکاوے میں آکر اس نے تخریبی کام کئے تھے ان کے متعلق وہ کہے گا کہ يُؤَيِّلَنِي لِيُتَنِي لَمْ أَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيلًا ۝ (۲۵/۲۸) اے کاش! میں نے فلاں کو اپنا دوست نہ بنایا ہوتا۔ جو منافقین یہاں اپنے رفقاء کو دھوکے دیتے تھے وہ ان کے سامنے ہوں گے۔ ان کی اصل حقیقت بے نقاب ہو جائے گی۔ وہ دوزخ میں ہوں گے اور منلص مومنین جنت میں اور ان دونوں کے درمیان صرف ایک دیوار حائل ہوگی جس میں ایک دروازہ بھی ہوگا (۵۴/۱۳) وہاں فریبکار مذہبی پیشواؤں اور ان کے سادہ لوح متبعین میں سخت کلامی ہوگی (۲۱-۳۶/۲۲)۔ لیڈروں میں اور عوام میں جنہیں وہ اپنا آلہ کار بنایا کرتے تھے تو تکرار ہوگی۔ اس کا ذکر قرآن کریم کے متعدد مقامات میں آیا ہے۔ (مثلاً ۱۳/۲۱، ۴۷-۴۸/۲۳، ۳۲-۳۳/۲۳، ۳۸/۴۰، ۴۷-۴۸/۴۰)۔ اسی طرح مختلف جماعتیں جہنم میں ایک دوسرے پر لعن طعن کریں گی اور کہیں گی انہوں نے انہیں گمراہ کیا تھا (۳۸-۳۹/۴۷)۔ اس وقت جو عذاب میں مبتلا ہوں گے (جس کا ذکر آگے چل کر آئے گا) وہ با صد حسرت و یاس پکار اٹھیں گے کہ يٰلَيْتَنِي كُنْتُ سُورَابَا (۷۸/۴۰) اے کاش! میں انسان ہونے کے بجائے مٹی کا تودا ہوتا تو اس مصیبت میں گرفتار نہ ہوتا۔

اس پہچان کی شکل کیا ہوگی۔ اس گفتگو کی صورت کیا ہوگی۔ اس کی کنہ و حقیقت کو ہم اپنے شعور کی موجودہ سطح پر سمجھ نہیں سکتے۔ لیکن قرآن کی رو سے یہ ایک حقیقت ثابتہ ہے جس میں کسی قسم کے

شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ اس زندگی پر ایمان مسلمان ہونے کی بنیادی شرط ہے اور یہ قانون مکافاتِ عمل پر ایمان کا لازمی نتیجہ ہے۔ قرآن کریم اس نقطہ نگاہ سے بھی اس حقیقت کو سامنے لایا ہے۔

اخلاقی نقطہ نگاہ سے تبیانِ حقیقت

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے، انسانی ذات اور حیات بعد الممات کی ساری بحث، قانونِ مکافاتِ عمل کی بنیاد پر استوار ہوتی ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ چونکہ ان نظریات کے بغیر قانونِ مکافاتِ عمل کا عقیدہ ناقابلِ تسلیم رہ جاتا ہے اس لئے ان نظریات کو بطور دلیل وضع کر لیا گیا ہے۔ صورت یہ نہیں۔ خدا نے کائنات اور خود انسان کی تخلیق اس طرح سے کی ہے کہ اس میں قانونِ مکافاتِ عمل انسانی ذاتِ حیات بعد الممات کے تصورات بطور حقیقت سامنے آجاتے ہیں۔ اگر یہ سلسلہ تخلیق محض منگامی طور پر، بطور ایک حادثہ (ACCIDENTALLY) وجود میں آگیا ہوتا تو پھر یہ تمام تصورات بے بنیاد رہ جاتے۔ لیکن قرآن بتاتا ہے کہ کائنات اور انسان کی تخلیق ایک عظیم مقصد کے مطابق وجود میں آئی ہے۔ یہ یونہی کھیل تماشے کے طور پر عمل میں نہیں لائی گئی۔ سورہ دخان میں ہے: **وَمَا خَلَقْنَا السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لِعِبَادٍ ۚ هُمْ لَهُ اسْكَرُ كَالْكَانَاتِ كَالْيُونِي كُھِيلُ تَماشے کے طور پر پیدا نہیں کر دیا۔ مَا خَلَقْنَاهُمْ إِلَّا بِالْحَقِّ ۚ وَلَكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ۝ (۲۸-۳۹/۲۲)** انہیں بالحق پیدا کیا گیا ہے لیکن اکثر لوگ علم و بصیرت سے کام لے کر اس حقیقت پر غور نہیں کرتے۔ مقصدِ تخلیق کائنات کے متعلق کہا۔

وَخَلَقَ اللَّهُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزَىٰ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ ۚ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ۝ (۲۵/۲۲)

خدا نے سلسلہ کائنات کو بالحق پیدا کیا ہے تاکہ ہر شخص کو اس کے اعمال کا پورا پورا بدلہ مل جائے اور کسی پر ظلم و زیادتی نہ ہو۔

خود انسان کے متعلق کہا کہ **أَفَحَسِبْتُمْ إِنَّمَا خَلَقْنَاكُمْ عَبَدًا ۚ وَ أَنْتُمْ إِلَيْنَا لَا تُرْجَعُونَ ۝** کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم نے تمہیں یونہی بلا مقصد (عبث) پیدا کر دیا ہے اور تم اپنے اعمال کے لئے ہمارے سامنے جواب دہ نہیں ہو؟ **فَتَعَلَىٰ اللَّهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ (۲۳/۱۱۶)** خدا جو مہربانی برحقیت قوت

واقفدار کا مالک ہے اس سے بلند یہ کہ اس کے متعلق اس قسم کا تصور قائم کیا جائے کہ وہ یونہی بلا مقصد اس قسم کے کھیل کھیلتا رہتا ہے۔ دوسری جگہ ہے۔ اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُورۃ ۵۱ (۴۵/۳۶) کیا انسان سمجھتا ہے کہ اسے بلا کسی منزل و مقصد اور غرض و غایت شتر بے ہمار کی طرح چھوڑ دیا گیا ہے؟ اس قسم کا تصور باطل ہے۔ کاروانِ زندگی بے منزل نہیں۔ انسان کی تخلیق بے مقصد نہیں۔ اس کی زندگی کا ایک ایک سانس یہ بتاتا ہے کہ وہ اپنے مقصد کی طرف جا رہا ہے یا اس سے دُور ہٹ رہا ہے۔ اسے ہنوز بہت سے ارتقائی منازل طے کرنے ہیں اور سطحِ ارض پر اس کی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ وہ اپنی ذات کی اس طرح نشوونما کرے کہ وہ اس کی طبعی موت کے بعد آگے بڑھنے اور بلند ہونے کے قابل ہو جائے۔ موت درحقیقت اس امر کا (TEST) ہے کہ وہ اپنے اس مقصد میں کس حد تک کامیاب ہوا ہے۔ خَلَقَ الْمَوْتَ وَ الْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيْتُكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۝ (۶۴/۲) موت اور حیات کو پیدا ہی اس لئے کیا گیا ہے کہ تمہیں حسنِ عمل کے مواقع میسر ہوں۔ اسی حقیقت کو سورۃ یونس میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ اِنَّكَ يَبْدِءُ وَا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُ لَا لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوْا الصّٰلِحٰتِ بِالْقِسْطِ ۝ (۱۰/۳) وہ (خدا) تخلیق کی ابتدا کرتا ہے اور پھر اسے گردشیں دیتا ہے تاکہ جو لوگ زندگی کے حقائق پر یقین رکھ کر صلاحیت بخش کام کرتے ہیں انہیں اپنے اعمال کا عدل و انصاف کے ساتھ بدلہ مل جائے حیات بعد الممات اسی مقصد کو پورا کرنے کی اگلی کڑی ہے۔ اِنَّ هٰذَا لَفَوْصَحُّ الْيَقِيْنِ ۝ (۵۶/۹۵) اور یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے جس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔

حیات بعد الممات سے انکار کرنے والے

چونکہ حیات بعد الممات دین کی بنیاد اور تکمیلِ شرفِ انسانیت کے پروگرام کی لاینفک کڑی ہے اس لئے جو لوگ اس سے انکار کرتے ہیں، مُشْرَکِینِ کَرِیْم نے ان کا بار بار ذکر کیا ہے۔ قبل اس کے کہ ان آیات کو سامنے لایا جائے ایک وضاحت ضروری ہے۔ میری اس تصنیف کا مقصد یہ نہیں کہ جو لوگ خدا، وحی، انسانی ذات، حیات بعد الممات وغیرہ کے قائل نہیں، انہیں ان کا قائل کرایا جائے اور ان کے اعتراضات کا جواب دیا جائے۔ اس تصنیف سے مقصد ان حقائق کے متعلق مُشْرَکِی تَصْرِیحات کو پیش کرنا

ہے۔ اس لئے ان تمام مباحث میں دائرۂ سخن کو اسی حد تک محدود رکھا گیا ہے۔ درنہ ہمارے زمانہ میں اس مسئلہ (حیات بعد الممات) پر اتنا کچھ لکھا گیا ہے کہ اگر ہم اسے زیر بحث لاتے تو وہ بے بنیاد خلیش ایک مستقل تصنیف بن جاتی۔ اس مقام پر صرف اس قدر کہنا کافی ہو گا کہ عصر حاضر میں علم النفس نے جس حد تک تحقیق کی ہے اس کی رُو سے وہ اگرچہ حیاتِ جاوید (IMMORTALITY) کے متعلق حتم و یقین سے کچھ نہیں کہتے، لیکن حیات بعد الممات (SURVIVAL AFTER DEATH) کے امکان سے انکار نہیں کرتے اور ان کی اتنی تحقیق بھی مادی نظریہ حیات کی تعلیل کے لئے کافی ہے۔

شأنِ کریم! اس حقیقت کے مخالفین کی ایک ذہنیت کو نمایاں طور پر سامنے لاتا ہے اور وہ یہ کہ حیات بعد الممات کو تسلیم کرنے کے لئے ان کا مطالبہ یہ ہوتا ہے کہ ”تم مردوں کو زندہ کر کے دکھاؤ“ اور یہی ان کی جہالت ہے۔ جو چیز (انسانی ذات) مرنے کے بعد باقی رہتی ہے اسے تو کسی زندہ انسان کے اندر بھی طبعی آنکھوں سے نہیں دیکھا جاسکتا چہ جائیکہ اسے مردوں میں محسوس طور پر دکھایا جاسکے۔ اسے صرف عقل و فکر کی رُو سے سمجھایا جاسکتا ہے۔ وہ اس قسم کے معترضین کے متعلق کہتا ہے کہ یَعْلَمُونَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا۔ وہ صرف اس محسوس دنیا کو جانتے ہیں وَ هُمْ عَنِ الْآخِرَةِ هُمْ غٰفِلُونَ ۝ (۳۰/۷۵) اور مستقبل کی زندگی سے وہ نا آشنا رہتے ہیں۔ اس کے بعد ہے اَو لَمْ يَتَفَكَّرُوْا فِیْ اَنْفُسِهِمْ (۳۰/۸) کیا یہ لوگ اپنی ذات کے متعلق غور و فکر سے کام نہیں لیتے؟ اس نے دوسرے مقام پر کہا ہے کہ جس طرح یہ لوگ دنیا میں غور و فکر سے کام لیتے ہیں اسی طرح آخرت کے متعلق بھی فکر و تدبر سے کام لیں تو حقیقت ان پر واضح ہو جائے۔ کَذٰلِكَ یُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ الْاٰیٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ فِی الدُّنْيَا وَ الْآخِرَةِ ۝ (۲/۲۱۹) ”اس طرح ہم اپنی آیات کو واضح طور پر بیان کرتے ہیں تاکہ تم دنیا اور آخرت میں غور و فکر کرو“ یعنی معترضین حیات بعد الممات کو اپنی محسوس آنکھوں سے دیکھنا چاہتے تھے۔

اور قرآن کریم انہیں دیدہ بصیرت سے دیکھنے کی دعوت دینا تھا۔ ان کا اعتراض یہ تھا کہ

وَ اِذَا كُنَّا تُرَابًا ؕ اِنَّا لَفِیْ خَلْقٍ جَدِیْدٍ (۷۱)

کیا جب ہم مر کر مٹی کے ساتھ مٹی ہو جائیں گے تو پھر ہمیں

ایک نئی زندگی ملے گی؟

سورۃ اسراء میں ہے۔

جب ہماری ہڈیاں تک بوسیدہ ہو جائیں گی تو ہمیں پھر کون زندہ کرے گا۔ جواب میں کہا کہ يُخَيِّدُهَا
الَّذِي اَنْشَاَهَا اَوَّلَ مَرَّةٍ (۳۶/۷۹) خدا کے جس قانونِ تخلیق کی رُو سے یہ ہڈیاں پہلی بار زندہ
و نامی انسان بن گئی تھیں اسی قانون کے مطابق انسان کو دوبارہ زندگی عطا ہو جائے گی۔
اب تو پھر بھی (جیسا کہ تم کہتے ہو) اس کی ہڈیاں موجود ہوں گی، پہلی مرتبہ کی تخلیق کے وقت تو کچھ بھی
موجود نہیں تھا اور پھر بھی یہ ایک زندہ انسان بن گیا؟ اس لئے (اس دلیل کی بنا پر) حیاتِ نو سے انکار
کی کونسی وجہ ہو سکتی ہے؟

سورۃ دُخان میں ان کا یہ مطالبہ نقل کیا گیا ہے کہ ہم تمہارے اس دعوے کو ا کہ انسان مرنے
کے بعد دوبارہ زندہ ہوتا ہے، اس صورت میں صحیح تسلیم کریں گے کہ تم ہمارے مردہ آباؤ اجداد کو دوبارہ
لا کر بتاؤ (۲۳/۳۶)۔

ایک اور مقام پر کہا گیا ہے کہ

ثَابِتًا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَ نَحْيَا وَ مَا يَهْلِكُنَا اِلَّا الدَّهْرُ
وَ مَا لَهُمْ بِذَلِكَ مِنْ عِلْمٍ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّونَ ۝ (۳۵/۲۴)۔

یہ لوگ کہتے ہیں کہ زندگی بس اسی دنیا کی زندگی ہے۔ ہمارے سامنے بچے پیدا ہوتے
ہیں (بڑھتے پھولتے پھلتے جوان ہوتے ہیں۔ پھر بڑھاپا طاری ہو جاتا ہے تو بالآخر جاتے
ہیں)۔ یہ سب زمانے کی گردش (مرد و وقت) کی رُو سے ہوتا ہے۔ (اس سے اوپر کوئی اور
قانون ہے ہی نہیں)۔ انہیں اس کا علم کوئی نہیں۔ یہ محض ظن و قیاس سے کام لیتے ہیں۔

ذرا آگے چل کر قرآن نے کہا ہے کہ زندگی اگر انسان کے طبعی جسم کی زندگی ہے اور اس سے زیادہ انسان
میں کچھ اور نہیں تو پھر انسان اور حیوانات کی زندگی کی سطح ایک ہی ہے۔ اس نظریہ کی رُو سے یہ اپنے
آپ کو حیوانوں سے متمیز کس طرح کر سکتے ہیں (۱۲/۲۷)۔

سورۃ قیام میں (ان کے اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے کہ جب جسم کے طبعی اجزاء مٹی میں
جذب ہو جائیں گے تو پھر انسان کو زندگی کس طرح ملے گی) کہا کہ قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْاَرْضُ
مِنْهُمْ (۵۰/۴) ہم جانتے ہیں کہ زمین انسانی ہستی میں کس چیز کو جذب کر کے کم کر دیتی ہے اور
کونسی چیز باقی رہ جاتی ہے؟ اس سے ذرا آگے چل کر کہا کہ ان سے کہو کہ ہم انہیں پہلی بار پیدا کرنے

بعد ٹھک نہیں گئے کہ ان کا دوبارہ پیدا کرنا ہمارے لئے مشقت طلب ہوگا (۵۰/۱۵) ہم تو اس کی ایک کپی پور کو دوبارہ پیدا کر سکتے ہیں (۵۵/۴)

ان معترضین کے مختلف اعتراضات کو سامنے لانے کے بعد کہا کہ ان کے اس انکار کی اصل وجہ کچھ اور ہے اور وہ ان کے تحت الشعور کا یہ جو رہے کہ اِنَّهُمْ كَاْفُوۡا لَا يَزُوْنُ حِسَابًا (۷۸/۲۷)۔ یہ اپنے اعمال کی ذمہ داری اپنے اوپر نہیں لینا چاہتے۔ یہ نہیں چاہتے کہ انہوں نے جو دھاندلیاں مچائی ہیں ان کے نتائج ان کے سامنے آئیں۔ یہ نہیں چاہتے کہ ان کا یہ اطمینان (جو درحقیقت اطمینان نہیں بلکہ فریبِ نفس ہے) ان سے چھن جائے کہ ہم جو جی میں آئے کرتے جائیں ہمیں کوئی پوچھنے والا نہیں۔ حیات بعد الممات کا تصور ان کے دل میں ذہنی داریوں کا احساس ابھارتا ہے اور یہ اس احساس کو بیدار نہیں ہونے دینا چاہتے۔ لیکن ان کے اس انکار سے حقیقت پر کیا فرق پڑتا ہے؟ کیا کسی کے آنکھیں بند کر لینے سے سورج روشنی دینا چھوڑ دیتا ہے؟ اس لئے ان سے کہہ دو کہ تم موت کے بعد کی زندگی کے تصور سے لاکھ جی چراؤ، یہ واقعہ ہوگی۔ عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدْ مَتَتْ وَ اَخَّرَتْ ۝ (۸۲/۵) اور ہر شخص کو معلوم ہو جائے گا کہ اس نے کیا پیچھے چھوڑا ہے اور کیا آگے بھیجا ہے۔

آپ نے غور فرمایا کہ ان تمام اعتراضات کی بنیاد، مادی تصورِ حیات (MATERIALISTIC CONCEPT OF LIFE) پر ہے۔ یعنی اس تصور پر کہ انسان عبارت ہے فقط اس کے طبعی

جسم سے۔ جب تک اس کے جسم کی مشینری طبعی قوانین کے مطابق چلنی رہتی ہے، وہ زندہ رہتا ہے اور جب موت اس مشینری کو ساکن کر دیتی ہے تو ان کا ختم ہو جاتا ہے اس کا کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔ اس تصورِ حیات کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ (مثلاً) اگر ایک شخص اس کا انتظام کر لے کہ جو کچھ وہ کرتا ہے اس سے وہ معاشہ کی گرفت میں نہ آئے، تو پھر کوئی قوت اسے ظلم و استبداد اور مکر و فریب سے روک نہیں سکتی۔ پھر مستقل اقدار کا کوئی تصور باقی رہ سکتا ہے نہ اپنے خود ساختہ آئین و قوانین سے برتر کسی غیر تبدیل خارجی قانون کا احساس۔ اور اس کا نتیجہ وہ جہنم ہے جس میں آج دنیا (اسی مادی نظریہ حیات کی رُو سے) اس بُری طرح جھلس اور جل رہی ہے۔ اس سے آپ نے غور فرمایا کہ قرآن کریم ایمان بالآخرت پر اس قدر زور کیوں دیتا ہے اور اعمال کے صحیح ہونے کے لئے ایسا

کی ضرورت کس قدر لائیفک ہے۔

o:~o:~o:~o

ایک اہم نکتہ

یہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ شُرّانِ کریم کی رُو سے

(۱) ہر انسان کو اس کی ذات (PERSONALITY) ملتی ہے۔ یہ ذات 'غیر نشوونما صورت میں ہوتی ہے اور اس سطح ارض پر انسانی زندگی کا مقصد اس ذات کی اس حد تک نشوونما کرنا ہے جس سے یہ زندگی کا اگلا ارتقائی مرحلہ طے کرنے کے قابل ہو جائے۔

(۲) انسانی ذات کا فطری نتیجہ انسان میں اختیار و ارادہ کی صلاحیت کی نمود ہے۔ اس سے یہ باقی حیوانات سے متمیز ہوتا ہے۔

(۳) انسان جو کام اپنے اختیار و ارادہ سے کرتا ہے اس کا اثر اس کی ذات پر مرتب ہو جاتا ہے۔ اگر یہ "اچھے کام" ہیں تو ان کے اثرات کے مجموعی نتیجہ کی نسبت سے اس کی ذات نشوونما حاصل کر لیتی ہے۔ اگر ان اثرات کا پلڑا بھاری ہے تو وہ ذات نشوونما یافتہ کہلاتی ہے (اور آخرت میں اسے جنت کی زندگی کا اہل قرار دیا جاتا ہے)۔ اگر یہ پلڑا ہلکا ہے تو وہ غیر نشوونما یافتہ رہ جاتی ہے۔ (آخرت میں اسے جہنم کی زندگی کہا جاتا ہے)۔

(۴) کسی کام کے "اچھے یا بُرے" ہونے کا معیار خدا کی وحی ہے جو اب شُرّانِ کریم کے اندر محفوظ ہے۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ

(ا) انسان کی ذات پر صرف اس عمل کا اثر مرتب ہو سکتا ہے جسے وہ اپنے اختیار و ارادہ سے کرے جس فیصلے یا عمل میں اس کا اپنا اختیار و ارادہ شامل نہیں اس کے لئے وہ جواب دہ نہیں ہو سکتا۔ لہذا اس کا اثر اس کی ذات پر کس طرح مرتب ہو سکتا ہے۔

(ب) وحی نے اچھے اور بُرے کا جو معیار مقرر کیا ہے اگر کسی انسان کے سامنے وہ معیار ہی نہیں آ سکا تو وہ اتنا ہی کر سکتا ہے کہ جن کاموں کو اپنی دانست میں اچھا سمجھے ان پر کاربند رہے اور

جنہیں اپنی دانست میں غلط سمجھے ان سے محتنب رہے۔ لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ جس کام کو اس نے اپنی دانست میں اچھا سمجھا ہے وہ فی الواقعہ اچھا ہو۔ دنیا میں سینکڑوں غلط کام ایسے ہیں جنہیں لوگ نہایت دیانت داری اور خلوص سے اچھا سمجھ کر کرتے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ ان کاموں کا نتیجہ اچھا نہیں ہو سکتا۔ غلط کام کا نتیجہ غلط ہی ہوگا خواہ اسے کتنا ہی حسد بن نیست۔ سے کیوں نہ کیا جائے۔ کتنی غلط دوائیں ہیں جو نہایت نیک نیتی سے مریضوں کو دے دی جاتی ہیں لیکن وہ اپنا ہلاکت انگیز اثر مرتب کر کے رہتی ہیں۔

(ج) یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وحی کا یہ معیار کسی شخص تک پہنچ جائے لیکن اس میں اس کے سمجھنے یا فیصلہ کرنے کی صلاحیت ہی نہ ہو۔ مثلاً پچھے، پاگل یا ایسی اقوام و افراد جن کی ذہنی سطح ہنوز بہت پست ہو۔ (جن میں عقل و فکر کی صلاحیت تو ہو لیکن وہ اس صلاحیت سے کام نہ لیں اور اپنے فیصلے جذبات کے تابع کریں) ان پر ذمہ داری عائد ہو جاتی ہے۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ ذمہ داری اس شخص پر عائد ہو سکتی ہے جس تک وحی کی تعلیم پہنچ چکی ہو اور اس میں اسے سمجھ سوچ کر فیصلہ کرنے کی صلاحیت ہو۔ جو لوگ اس زمرے میں نہیں آتے وہ مرفوع القلم ہیں۔ ان کا شمار اشیائے کائنات یا حیوانات میں ہوگا۔ قرآن کریم کے مختلف مقامات سے ان ہر دو نکات کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ پہلا نکتہ یہ ہے کہ ان لوگوں تک خدا کی وحی پہنچ چکی ہو۔ سورہ مومن میں ہے کہ اہل جہنم، جہنم کے داروغوں سے کہیں گے کہ اس عذاب میں کچھ تخفیف، کراؤ۔ وہ ان سے کہیں گے کہ ”کیا تمہارے پاس خدا کے پیغام پر واضح قوانین لے کر نہیں آئے تھے؟“ وہ کہیں گے کہ ہلی۔ وہ آئے تو تھے۔ تو وہ ان سے کہیں گے کہ پھر اب اس داؤ بلا مچانے سے کیا حاصل ہے (۴۹/۵۰-۴۰/۵۱)۔ سورہ ملک میں بھی اسی مضمون کو دہرایا گیا ہے (۸۱-۸۰/۹-۱۶)۔ سورہ ق میں ہے کہ قیامت میں مجرمین ایک دوسرے کو ملزم گردانیں گے کہ انہی نے انہیں گمراہ کیا تھا۔ خدا کی طرف سے ارشاد ہوگا کہ ”ہمارے حضور اس قسم کے جھگڑے مت کرو۔“ وَ قَدْ قَدْ مُتُّ إِلَيْكُمْ بِالْوَعْدِ (۵۰/۲۸) ”میں نے تمہاری طرف پہلے ہی تنبیہ (دارنگ) بھیج دی تھی“

(جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے) قوموں کی تباہی کے سلسلہ میں بھی اس کی تصریح کر دی گئی ہے کہ جب تک کسی قوم کو غلط اور صحیح راستہ متمیز طور پر دکھا نہیں دیا جاتا اسے تباہ نہیں کیا جاتا۔ (اس

سلسلہ میں دیکھئے۔ ۱۵/۱۷ : ۲۰۸ — ۲۰۹/۲۴ : ۳۰/۹ : ۱۱۵/۹ : ۱۳۲/۴۔ سورۃ قصص میں یہاں تک کہہ دیا گیا ہے کہ رسولؐ اس ملک کے مرکزی مقام — فِیْ اُمِّیَّہَا — میں آتا تھا (۲۸/۵۹)۔

ظاہر ہے کہ ختم نبوت کے بعد، یہی فریضہ اس قوم کے ذمہ عائد ہوتا ہے جسے خدا کی کتاب و شہدائے کریم کا وارث قرار دیا گیا ہے۔ یعنی امت مسلمہ کے ذمے کہ وہ دیگر اقوامِ عالم تک اس ہدایت کو پہنچائے۔

جہاں تک دوسرے نکتہ کا تعلق ہے کہ ذمہ داری اس کی ہے جو سمجھنے سوچنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ سو اس باب میں قرآن کریم کی تعلیم واضح ہے۔ سورۃ اعراف میں ہے کہ جہنم میں وہ لوگ جائیں گے جو آنکھیں رکھنے کے باوجود ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔ کان رکھنے کے باوجود ان سے سننے کا کام نہیں لیتے۔ دل رکھنے کے باوجود ان سے سمجھنے سوچنے کا کام نہیں لیتے۔ یہ لوگ انسان نہیں، حیوان ہیں (۱۷۹/۱۷)۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ دیکھنے بھالنے اور سمجھنے سوچنے کی صلاحیت رکھنے کے باوجود سمجھ سوچ سے کام نہیں لیں گے وہ جہنم میں جائیں گے۔ جو ان صلاحیتوں سے محروم ہوں گے انہیں مکلف ہی قرار نہیں دیا جائے گا۔ سورۃ مائدہ میں ہے کہ اہل جہنم کہیں گے کہ تُو کُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا کُنَّا فِیْ اَصْحَابِ السَّعِیْرِ (۱۰۱/۷۷) اگر ہم عقل و فکر سے کام لیتے تو اہل جہنم میں سے کیوں ہوتے؟ تباہ ہونے والی قوموں کے متعلق بھی یہی کہا ہے کہ وہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں رکھنے کے باوجود عقل و فکر سے کام نہیں لیتی تھیں (۲۸/۲۹ : ۲۹/۲۹)۔ خود قرآنی حقائق کے متعلق کہا کہ ان سے وہی عبرت حاصل کر سکتے ہیں جن کے پسے میں سمجھنے سوچنے والا قلب ہے یا وہ بات کو غور سے نہ ملاحظہ کر سکتے ہیں (۳۷/۱۵)۔ لہذا ذمہ داری اس کی ہے۔

(۱) جس تک خدا کا پیغام پہنچ چکا ہو۔

لے لیکن جو قوم خود ہی راہ گم کردہ ہو وہ دوسروں کو کیا ہدایت دے گی؟ یہ وجہ ہے کہ ہم (مسلمان) خدا کے دہ سے عذاب میں مبتلا ہیں۔ ایک تو اس لئے کہ ہم نے قرآن کا صحیح راستہ چھوڑ دیا اور دوسرے اس لئے کہ ہماری اس روش سے دیگر اقوامِ عالم بھی غلط راہوں پر پڑی رہیں۔ لیکن اس دور میں جبکہ علم عام ہو چکا ہے کم از کم مغرب کی مہذب قومیں تو نہیں کہہ سکتیں کہ ان تک خدا کا پیغام نہیں پہنچ سکا تھا۔

(۲) وہ اسے سمجھنے سوچنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اور

(۳) وہ کام اس نے برضا اور رغبت (دل کے ارادے کے ساتھ) کیا ہو (۳۳/۵)؛ (۱۶/۱۰۶)۔

اور یہی وہ کام ہیں جن کا اثر انسان کی ذات پر مرتب ہوتا ہے۔ اجمال اس تفصیل کی ”جہنم“ کے عنوان میں ملے گی۔



پندرھواں باب

برزخ

ہمارے ہاں عام تصویر یہ ہے کہ مرنے کے بعد اور قیامت کے دن دوبارہ زندہ ہونے کے درمیان ایک وقفہ ہے جس میں مُردے کو عذاب (یا ثواب) ہوتا ہے۔ اسے عام اصطلاح میں عذابِ قبر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ شدآن کریم سے اس تصور کی تائید نہیں ہوتی۔ اس کی رُو سے دو ہی موتیں ہیں اور دو ہی زندگیاں۔

قَالُوا رَبَّنَا آمَنَّا اِثْنَيْنِ وَاٰحْيَيْنَا اِثْنَيْنِ (۴/۱۱)۔
وہ کہیں گے کہ اے ہمارے نشوونما دینے والے! تو نے ہمیں دو دفعہ موت
دی اور دو دفعہ زندگی۔

سورہ بقرہ میں ہے کہ

كَيْفَ تَكْفُرُونَ بِاللّٰهِ وَ كُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ تُمِيْشِكُمْ ثُمَّ
يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝ (۲/۲۸)

تم خدا کا کس طرح انکار کر سکتے ہو کہ تم مردہ تھے۔ اس نے تمہیں زندگی عطا کی ہے۔ وہ تمہیں
پھر مارے گا اور پھر زندہ کرے گا اور تم اس کی طرف لوٹ کر جاؤ گے۔

یعنی اس دنیا میں آنے سے پہلے کی حالت موت کی تھی۔ پھر ان اس دنیا میں آیا تو اسے زندگی
کہا گیا ہے۔ پھر اس دنیا کی زندگی ختم ہو جائے گی۔ اسے موت کہا گیا۔ اس کے بعد پھر زندگی عطا ہوگی

یہ (دوسری بار کی) زندگی کب عطا ہوگی؟ اس کے متعلق کہا:

ثُمَّ إِنَّكُمْ بَعْدَ ذَلِكَ لَمَيِّتُونَ ۚ ثُمَّ إِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ تُبْعَثُونَ

(۱۵۱-۲۳/۱۶)

تم اس زندگی کے بعد مر جاؤ گے اور پھر قیامت کے دن اٹھائے جاؤ گے۔
اس سے واضح ہے کہ یہ دوبارہ زندگی قیامت کے دن ہوگی۔ اس لئے اس دنیا سے جانے اور قیامت کے دن اٹھنے کے درمیان زندگی کا تصور قرآنی نہیں۔

اصل یہ ہے کہ جب تک ہم اسے نہ سمجھ لیں کہ موت کیا ہوتی ہے اور زندگی کسے کہتے ہیں قرآن کریم کے یہ حقائق سمجھ میں نہیں آسکتے۔ اسے ایک مثال سے سمجھئے۔ براڈ کاسٹنگ اسٹیشن سے جو آواز نشر کی جاتی ہے وہ فضا کی کہربائی لہروں میں پھیل جاتی ہے لیکن ہمیں اس کی موجودگی کا احساس نہیں ہوتا۔ ہمیں اس کا احساس اس وقت ہوتا ہے جب وہ آواز ہمارے ریڈیو سیٹ کی وسطیت سے محسوس طور پر ہمارے کانوں میں پہنچتی ہے۔ ہمارے احساس کی گرفت میں آنے سے پہلے یہ آوازیں (یا لہریں) معدوم نہیں تھیں۔ یہ فضا میں موجود تھیں۔

خدا اس کائنات کو عدم سے وجود میں لایا۔ اس سے پہلے نہ مادی کائنات کا وجود تھا نہ اس میں زندگی کا وجود۔ پھر اس کے قانون مشیت کے مطابق کائنات میں زندگی (LIFE) کی نمود ہوئی۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ کب ظہور میں آئی اور کیسے۔ ہمیں اس کے وجود کا احساس اس وقت ہوا جب مادی پس کر کے ذریعے اس کی نمود ہوئی۔ پھر زندگی معلوم کس قدر لاتعداد مراحل سے گزرتی ہوئی پس کر انسانی تک پہنچی۔ ہمیں انسانی زندگی (HUMAN LIFE) کا احساس اسی مرحلہ میں آکر ہوتا ہے۔ شہانِ کریم نے اس مرحلہ کو حیات کہہ کر پکارا ہے اور زندگی کے اس سے قبل مراحل کو (ہمارے نقطہ نگاہ سے) ممات سے تعبیر کیا ہے۔ اس کے بعد زندگی وجود مرحلہ سے آگے بڑھ جاتی ہے اور ہم اپنے موجودہ ذرائع ادراک کی رُو سے اس کا پھر احساس نہیں کر سکتے۔ یہ نہیں کہ اس وقت زندگی معدوم ہو جاتی ہے۔ وہ تو موجود ہوتی ہے لیکن ہمارے ذرائع احساس کی گرفت سے باہر چلی جاتی ہے۔ یعنی (مذکورہ صدر مثال کے مطابق ہمارا ریڈیو سیٹ) خراب ہو جاتا ہے اور کہربائی لہروں میں پٹی ہوئی آواز ہمارے کانوں میں نہیں آتی۔ وہ آواز اس

وقت بھی موجود ہوتی ہے۔ ہم اس کا احساس نہیں کر سکتے۔ قرآن کریم نے اسے پھر موت کہہ کر بیکار کر دیا ہے۔ ازاں بعد ہمارا ریڈیوسیدٹ پھر درست ہو جاتا ہے اور ہمارے نقطہ نگاہ سے زندگی پھر آن موجود ہوتی ہے۔ اسے حیات بعد المات سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اگر ہم انسان کی طبعی موت کے بعد زندگی (LIFE) کو یکسر معدوم تصور کر لیں اور یہ سمجھ لیں کہ اس کے بعد (قیامت کو) ایک نئی زندگی عطا ہوگی جس کا سابقہ (یعنی موجودہ دنیا کی زندگی) سے کوئی تعلق نہیں ہوگا تو اس سے قرآن کے پیش کردہ تصور حیات کی تردید ہو جاتی ہے۔ قرآن کریم صراحت سے بتاتا ہے کہ اُس زندگی (حیاتِ اخروی) میں انسان کو اس دنیا کی ساری زندگی یاد ہوگی۔ وہ ایک دوسرے کو پہچانیں گے۔ یہاں کے باہمی معاملات کا علم و احساس ہوگا۔ اس سے تسلسلِ شعور (CONTINUITY OF CONSCIOUSNESS) ثابت ہو جاتا ہے۔

ہے۔ مادی نظریہ حیات (MATERIALISTIC CONCEPT OF LIFE) کے قائل، شعور (یا حافظہ) کا مرکز انسان کا طبعی دماغ (BRAIN) قرار دیتے ہیں اس لئے وہ کہتے ہیں کہ جب انسان کا موت سے دماغ ضائع ہو جائے تو پھر اس فرد کے لئے شعور یا حافظہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ قرآن کریم اس کے برعکس، شعورِ خویش یا حافظہ کا مرکز انسانی ذات (HUMAN SELF) قرار دیتا ہے جو طبعی جسم کے انتشار (DISINTEGRATION) کے بعد بھی باقی رہتی ہے۔ یہ شعور و حقیقت ان تاثرات کا نام ہے جو انسانی ذات پر ہر آن منقوش یا ترسم ہوتے رہتے ہیں۔ انسانی ذات ان نقوش کو ساتھ لئے آگے بڑھ جاتی ہے۔ اُس زندگی میں ان نقوش کی نمود کا طریق کیا ہوگا، اس کے متعلق ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ لیکن طریق کچھ بھی ہو، قرآن کی رو سے، اس شعورِ خویش کی نمود حقیقت ہے۔ (اسی کا نام ایمان بالآخرت ہے)۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے انسانی ذات (نفس) اور شعورِ خویش کو مرادف قرار دیا ہے۔ دیکھئے: سورہ زمر کی ایک آیت میں اس حقیقت کو کیسے لطیف پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے جہاں کہا ہے کہ

اللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِي لَمْ تَمُتْ فِي مَنَازِلِهَا

لے ہم نہیں کہہ سکتے کہ اُس وقت اس ریڈیوسیدٹ کی کیفیت کیا ہوگی۔ ایسے ریڈیوسیدٹ بھی تو ہیں جو چاند پر پہنچنے والے راکٹ تک سے بھی لاسلکی رشتہ قائم رکھتے ہیں۔

فَيْمُسِكُ الَّتِي قَضَىٰ عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَ يُرْسِلُ الْاُخْرَىٰ اِلَىٰ اَجَلٍ مُّسَمًّى " اِنِّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝ ۳۹/۴۲

اللہ موت کے وقت اور جو لوگ مرتے نہیں ان کی نیند کی حالت میں ان کے "نفس" کو لے جاتا ہے۔ پھر جس پر موت وارد ہو جاتی ہے اس کے نفس کو روک لیتا ہے اور دوسروں کے نفس کو ایک مدت معینہ کے لئے واپس بھیج دیتا ہے۔ اس میں ارباب فکر و تدبر کے لئے حقیقت تک پہنچنے کی بڑی بڑی نشانیاں ہیں۔

یہ ظاہر ہے کہ نیند کی حالت میں انسان کی طبعی زندگی تو موجود ہوتی ہے۔ اس کا شعور معطل ہوتا ہے۔ جاگنے پر وہ شعور رو بہ عمل ہو جاتا ہے اور اسی کو "نفس" کہہ کر پکارا ہے۔ لہذا "نفس" اور شعور خویش مراد ہیں۔ انسان کی طبعی موت کے بعد اس نفس یا شعور خویش کو "روک لیا جاتا ہے" (فَيْمُسِكُ)۔ یہ فنا نہیں ہو جاتا۔ اس لئے اسے معدوم کر کے از سر نو (ایک نئی زندگی) عطا کئے جانے کا تصور صحیح نہیں۔ شعور ذات مادی تصور حیات کی رُو سے فنا یا معدوم ہو جاتا ہے۔ قرآنی تصویحیات کی رُو سے ایسا نہیں ہوتا یہی وہ حقیقت ہے جسے اقبالؒ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

زندگی جوئے روان است و رواں خواہد بود

ایں مئے کہنہ جوان است و جوان خواہد بود

زندگی (یا شعور ذات) ایک مسلسل جاری رہنے والی ندی ہے جو اس دنیا کے بیابان سے آخری گلستان میں داخل ہو جاتی ہے اور موت اس باڑ کا نام ہے جو ان دونوں کے درمیان حائل ہے جس کی وجہ سے ہم (اس بیابان میں کھڑے) ندی کو باڑ سے آگے نہیں دیکھ سکتے۔ لہذا "یہ تصور صحیح نہیں کہ جتنے لوگ مرتے ہیں وہ امرنے کے بعد قبروں میں روک لئے جاتے ہیں اور پھر ان سب کو ایک دن اکٹھا اٹھایا جائے گا۔ اسے حشر یا قیامت کا دن کہا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر شخص کی قیامت اس کی موت کے ساتھ ہی شروع ہو جاتی ہے۔ (حشر، قیامت وغیرہ کے متعلق تفصیل پہلے گزر چکی ہیں)۔ لیکن قرآن کریم میں ایسے اشارات بھی ملتے ہیں جن سے مترشح ہوتا ہے کہ انسانی ذات کے تاثرات (شعور خویش) کی نمود کے موجودہ پیکر (VEHICLE) کو (موت کے بعد) جدید پیکر میں تبدیل ہونے کے لئے کچھ عبوری سا وقفہ درکار ہوگا۔ قبل اس کے کہ ہم اس سلسلہ میں

آگے بڑھیں، خود وقفہ یا وقت (TIME) کے متعلق ایک وضاحت ضروری ہے۔ فلسفیانہ اندازِ فکر کی رو سے وقت (TIME) کا مسئلہ زندگی اور کائنات کے مشکل ترین مسائل میں سے ہے۔ لیکن ہم اس کے اس پہلو کو ایک طرف رکھتے ہوئے اس کے صرف ایک عمومی گوشے کے متعلق بات کرنا چاہتے ہیں۔ اور وہ یہ کہ وقت کا احساس اسے ہوتا ہے جس کا شعور بیدار ہو۔ سونے والے کو (نیند کی حالت میں) وقت کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ یہ احساس اسے ہوتا ہے جو جاگ رہا ہو۔ اسی طرح جسے کلوروفارم نگھا دیا جائے اسے بھی وقت کا احساس نہیں ہوتا۔ اسے اصطلاحی زبان میں یوں کہیں گے کہ زمان (TIME) ایک اعتباری (RELATIVE) شے ہے۔ اسی لئے اہل فلسفہ اُس زمان (TIME) کو جس کے گزرنے کا احساس نہ ہو (DURATION-LESS TIME) کہتے ہیں۔

بَرَزَخ

ان تصریحات سے واضح ہے کہ جس چیز کو ہم نے اس "وقفہ" سے تعبیر کیا ہے جس میں شعورِ نیش کے موجودہ پیکر (VEHICLE) کو ایک نئے پیکر میں تبدیل ہونا ہے، اس کا اُس فرد کو احساس نہیں ہوگا۔ اسی لئے قرآن کریم نے کہا ہے کہ وہ اپنے شعور کی نمود کے وقت حیرت سے کہے گا کہ مَنْ بَعَثَنَا مِنْ مَرْقَدِنَا (۳۶/۵۲) ہمیں ہماری خوابگاہ سے کس نے جگا دیا؟ دیکھئے! اس میں اس وقفہ کو نیند کی حالت سے تشبیہ دی گئی ہے۔ یہی وہ وقفہ ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ

وَمِنْ ذَرَّآئِهِمْ بَرَزَخُ إِلَى يَوْمِ يُبْعَثُونَ (۲۲/۱۰۰)

ان کے پیچھے (یا آگے) یومِ بعثت تک برزخ ہے۔

برزخ، دو چیزوں کے درمیان اوٹ یا آڑ کو کہتے ہیں اور "وراء" کے معنی آگے اور پیچھے دونوں آتے ہیں۔ اُمت کے معنی یہ ہوئے کہ ان (مردوں) کے آگے یا پیچھے اس وقت تک ایک اوٹ ہوگی۔ اگر "ذَرَّآئِهِمْ" کے معنی "پیچھے" کے لئے جائیں تو اس سے مطلب یہ ہوگا کہ وہ اس عصر میں دنیاوی زندگی کی یاد سے غافل ہوں گے اور اگر اس کے معنی "آگے" کے لئے جائیں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ آنے والی زندگی کے متعلق ان کا شعور مہنوز بیدار نہیں ہوگا۔ وہ گویا نیند کی حالت میں ہوں گے۔

مُردے ہماری سُن نہیں سکتے

لیکن جہاں تک اس دنیا کا تعلق ہے، انسان کو مرنے کے بعد اس سے کوئی تعلق اور واسطہ نہیں رہتا۔ اُس وقت جب اس کے شعور کی بیداری ہوگی تو اسے اپنی سابقہ زندگی کے احوال و کوائف کی تو یاد ہوگی لیکن اس کی موت کے بعد دنیا میں کیا ہو رہا ہے اس کی اُسے کچھ خبر نہیں ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے بصرِ احست کہا ہے کہ

وَالَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ مَا يَسْمَعُونَ مِنْ قِطْعٍ اِنْ تَدْعُوهُمْ
لَا يَسْمَعُوا دُعَاءَكُمْ ۚ وَكُلُّكُمْ اِلَيْهِ رَاجِعٌ ۚ
يَكْفُرُونَ بِشِرْكِكُمْ ۗ (۱۳-۱۴/۳۵)

اور تم لوگ اللہ کے سوا جنہیں پکارتے ہو وہ ذرہ برابر بھی اختیارِ اقتدار نہیں رکھتے۔ اگر تم انہیں بلاؤ تو وہ تمہاری پکار کو سُن نہیں سکتے اور اگر بغرضِ محال اسے سُن بھی لیتے تو تمہیں اس کا جواب نہ دے سکتے۔ اور وہ قیامت کے دن تمہارے شرک سے انکار کر دیں گے۔

اس لئے کہ اِنَّمَا يَسْتَجِيبُ الَّذِينَ يَسْمَعُونَ ﴿۳۶﴾ جواب تو وہی دے جو سُن سکے۔ فَاِنَّكَ لَا تَسْمَعُ الْمَوْتٰی (۵۲/۳) اور تو مُردوں کو کبھی نہیں سُن سکتا۔ وَ مَا اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُوْرِ (۲۲/۳۵) تو انہیں نہیں سُن سکتا جو قبروں میں ہیں۔ وَ مَا يَسْتَوِی الْاَحْيَاءُ وَلَا الْاَمْوَاتُ (۲۲/۳۵) مُردہ اور زندہ دونوں کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔ وَ هُمْ عَنْ دُعَائِهِمْ غٰفِلُوْنَ ۝ (۵/۳۶) جنہیں یہ لوگ قبروں کے سرہانے کھڑے ہو ہو کر پکارتے ہیں انہیں اس کی خبر تک نہیں ہوتی کہ کون پکار رہا ہے اور وہ کیا کہہ رہا ہے۔ حتیٰ کہ انہیں اس کا بھی علم نہیں ہوتا کہ وہ کب اٹھائے جائیں گے (۲۱/۱۶؛ ۲۵/۲۶)۔ اور اس میں چھوٹے اور بڑے کی کوئی تمیز نہیں۔ مُردہ ہونے کے اعتبار سے سب کی ایک ہی کیفیت ہوتی ہے۔ اور تو اور قرآن کریم نے خود نبی اکرمؐ کے متعلق کہا ہے کہ اِنَّكَ مَيِّتٌ ۚ وَ اَمَّهُمْ مَيِّتُوْنَ ۝ (۳۹/۳۰) یہ یقینی بات ہے کہ تو بھی (ایک دن) مرجائے گا اور یہ بھی مرجائیں گے۔

مقتولین فی سبیل اللہ کی حیات

قرآن کریم نے مقتولین فی سبیل اللہ (خدا کی راہ میں قتل ہو جانے والوں) کے متعلق ایک جگہ

کہا ہے۔

وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ بَلْ أَحْيَاءُ
وَلَكِنْ لَا تَشْعُرُونَ ۝ (۲/۱۵۴)۔

جو لوگ خدا کی راہ میں قتل ہو جائیں انہیں مردہ مت کہو۔ وہ زندہ ہیں۔ لیکن تم ان کی
زندگی کی حقیقت کو اپنے شعور کی موجودہ سطح پر سمجھ نہیں سکتے۔

دوسرے مقام پر ہے۔

وَلَا تُحْسِبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا بَلْ أَحْيَاءُ عِنْدَ
رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ ۝ (۳/۱۶۸)۔

اور جو لوگ خدا کی راہ میں قتل ہو جائیں انہیں مردہ مت خیال کرو۔ وہ اپنے نشوونما
دینے والے کے ہاں زندہ ہیں اور انہیں سامان نشوونما بھی ملتا ہے۔

ان آیات میں دو ایک باتیں غور طلب ہیں۔

(۱) یہ لوگ زندہ ہوتے ہیں۔ لیکن ان کی زندگی ایسی نہیں جیسی دنیا میں رہنے والے انسانوں کی
زندگی ہوتی ہے کیونکہ دنیاوی زندگی کو ہم سمجھ سکتے ہیں اور اس زندگی کے متعلق کہا کہ تم اس کی کنہ و حقیقت
کو سمجھ نہیں سکتے۔ لہذا 'وہ حیات' یہاں کی زندگی سے مختلف نوعیت کی ہے۔

(۲) وہ زندہ ہیں اپنے رب کے پاس۔ لہذا ان کا اس دنیا سے کچھ تعلق نہیں رہتا۔ علاوہ بریں اسے

بھی پیش نظر رکھنا چاہیے کہ قرآن کریم نے صراحت سے بتایا ہے کہ كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ (۳/۱۸۴)
موت ہر ذی حیات کے لئے ہے۔ حتیٰ کہ اس میں (جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے) حضرات انبیاء کرام
کی بھی استثناء نہیں (۳۹/۳۰)۔ لہذا جسے ہم موت کہتے ہیں وہ مقتولین فی سبیل اللہ پر بھی وارد ہوتی ہے۔
اس لئے ان کی حیات کا تعلق اخروی دنیا سے ہے اس دنیا سے نہیں۔

مقتولین فی سبیل اللہ کی اس حیات کے متعلق بہت کچھ کہا گیا ہے، لیکن تصریحات بالا کی
روشنی میں ہم سمجھتے ہیں کہ موت کے بعد شعور کے عارضی تعطل کے جس وقفہ کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے

یہ لوگ اس سے مستثنیٰ ہوتے ہیں۔ انسانی ذات کی نشوونما کا طریق یہ ہے کہ جب کسی مستقل قدر (حق) کے تحفظ اور دنیاوی مفاد میں تصادم ہو، تو جو شخص مستقل قدر کی حفاظت کی خاطر دنیاوی مفاد کو قربان کر دے، اس کا یہ عمل اس کی ذات کی نشوونما میں اضافہ کا موجب بن جاتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ اس قسم کے تصادمات میں سب سے زیادہ صبر آزما اور ہمت طلب مرحلہ وہ ہوتا ہے جس میں حق کی حفاظت کے لئے انسان کو اپنی جان دے دینی پڑے (کیونکہ جان سے زیادہ عزیز کوئی دنیاوی متاع نہیں ہو سکتی) سو جو شخص ایسے وقت میں ہنسی خوشی جان دے دینا ہے اور اس طرح حق کی حفاظت کرتا ہے، اس کی ذات میں اس قسم کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ اسے اس عبوری وقفہ کے مرحلہ سے گزرنا نہیں پڑتا۔ ان کے شعور ذات کے تسلسل میں ذرا سا بھی تعطل نہیں ہوتا۔

ہمارے اس قیاس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ سورۃ آل عمران کی جو آیت اوپر درج کی گئی ہے (یعنی ۳/۱۶۸)۔ اس کے بعد ہے فَرِحَ الْجِنَّ بِمَا أَتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ۔ وہ اپنے ان بلند مراتب کو دیکھ کر جوا نہیں عنایات خداوندی سے حاصل ہوئے ہیں، بہت خوش ہوتے ہیں۔ وَيَسْتَبْشِرُونَ بِالَّذِينَ لَمْ يَلْحَقُوا بِهِمْ مِنْ خَلْفِهِمْ أَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (۱۶۹) اور اس احساس سے کہ ان کی اس قربانی سے ان لوگوں کے لئے جو ابھی دنیا میں موجود ہیں ایسا معاشہ قائم ہو گیا ہوگا جس میں وہ ہر طرح سے مامون و محفوظ ہیں، ان کی خوشی و بالا ہو جاتی ہے اس سے واضح ہے کہ اس دنیا کے متعلق ان کا شعور موت کے ساتھ ہی بیدار ہو جائے گا۔ اس میں تعطل نہیں ہوگا۔

ضمناً اتنا اور بھی سمجھ لینا چاہیے کہ اگر کوئی شخص حق و صداقت کی خاطر جنگ میں شریک ہوتا ہے لیکن وہ قتل نہیں ہوتا، بلکہ فاتح و منصور لوٹتا ہے تو وہ اس اجرِ عظیم سے محروم نہیں رہتا جو مقتولین کے حصہ میں آتا ہے۔ ایسے لوگوں کا مرتبہ بھی ایسا ہی بلند ہوتا ہے۔ (دیکھئے ۳/۱۵۶، ۴/۴۲، ۱۱۱، ۹/۱۱۲)۔

اُخروی زندگی میں شعور کی سطح

وَسْـَٔنَ كَرِيمٌ کے بعض مقامات سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ زمان (TIME) کے متعلق اُخروی دنیا میں شعور کی سطح، اس دنیا سے مختلف ہوگی، چنانچہ اس دنیا میں رہنے کی مدت کے متعلق ان کے

اندازے (یہاں کے معیاروں سے) مختلف ہوں گے۔ سورہ یونس میں ہے۔

وَيَوْمَ يُحْشَرُهُمْ كَأَنَّهُمْ يُلْبِثُونَ إِلَّا سَاعَةً مِّنَ النَّهَارِ يَتَعَارَفُونَ
بَيْنَهُمْ ۖ (۱۰/۴۵) ذ (۳۵/۳۶)۔

جس دن خدا انہیں اکٹھا کرے گا تو وہ خیال کریں گے کہ وہ (دنیا میں) دن کی ایک گھڑی سے زیادہ نہیں رہے۔ اور وہ آپس میں ایک دوسرے کو پہچانتے ہوں گے۔

سورہ روم میں ہے کہ مجربین بھی اُس وقت یہی خیال کریں گے کہ وہ ایک ساعت سے زیادہ نہیں رہے۔ لیکن صاحبانِ علم و ایمان کہیں گے کہ ”تم یومِ بعثت تک کتابِ اللہ میں رہے ہو اور یہی یومِ بعثت ہے“ (۵۵-۳۰/۵۶)۔ یعنی وہ بھی اُس زمانے کو متعین نہیں کریں گے۔ بلکہ اتنا ہی کہیں گے کہ اس کا صحیح علم نوشتہٴ خداوندی میں ہے۔

سورہ مؤمنون میں ہے کہ خدا ان سے پوچھے گا کہ ”تم دنیا میں کتنے برس رہے تھے۔ وہ کہیں گے کہ ہم تو صرف ایک دن یا اس کا ایک حصہ وہاں رہے تھے۔ ہم تو اتنا ہی کہہ سکتے ہیں۔ اگر آپ متعین طور پر معلوم کرنا چاہتے ہیں تو ان سے پوچھئے جو اس کا حساب رکھا کرتے تھے (۱۱۲-۲۳/۱۱۳)۔ سورہ طہ میں ہے کہ وہ آپس میں چپکے چپکے کہیں گے کہ ہم وہاں دس دن تک رہے تھے۔ ان میں سے بہترین دل و دماغ کا انسان بھی اتنا ہی کہہ سکے گا کہ ہم صرف ایک دن کے لئے وہاں رہے تھے (۱۰۳-۳/۱۰۴)۔ اس سے ظاہر ہے کہ وہاں (کم از کم) زمان کے متعلق شعور کی سطح، یہاں کی زندگی سے مختلف ہوگی۔ (تفصیل ان امور کی آگے چل کر ملے گی)۔



سولھواں باب

انقلابِ عظیم کی تفصیلات

یہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ قرآنِ کریم میں تین قسم کے انقلابات کا ذکر آیا ہے۔
 (۱) وہ انقلاب جو قوموں کی زندگی میں اس دنیا میں واقع ہوتا ہے۔ اس میں بلندیوں پر فائز قوتیں
 پستیوں میں گر جاتی ہیں اور قعرِ مذلت میں گری ہوئی قوئیں باہم عروج پر پہنچ جاتی ہیں۔ جب یہ انقلاب جنگ
 کے ذریعے آتا ہے تو اس (جنگ) کی ہولناکیوں کی تفصیل بھی قرآن میں آئی ہے۔ بعض اوقات طبعی
 حوادث کے ذریعے بستیاں تباہ ہو جاتی ہیں۔ یہ بھی انقلاب کی ایک شکل ہے۔
 (۲) قرآنِ کریم میں اس قسم کے کائناتی حوادث کا بھی ذکر ہے جس سے مترشح ہوتا ہے کہ یہ اس
 وقت کی بات ہے جب یہ نظام کائنات درہم برہم ہو جائے گا۔ اجرامِ فلکی ایک دوسرے سے ٹکرا کر
 پاش پاش ہو جائیں گے۔ زمین، غبار بن کر فضا میں اڑ جائے گی۔ یہ عظیم کائناتی انقلاب ہوگا۔ اور
 (۳) تیسرا انقلاب وہ ہے جب اخروی زندگی میں اعمال کے مطابق انسانوں کے فیصلے ہوں گے۔
 ان کی ذات کی کیفیت کے مطابق ان کا مستقبل متعین ہوگا۔ قرآنِ کریم میں اس ہول انگیز منظر کی
 تفصیل بھی آئی ہے۔

قرآنِ کریم نے ان مناظر کی تفصیل بیان کرتے ہوئے بالتصریح نہیں بتایا کہ کون سی بات کا
 تعلق (مذکورہ صدر ہر سہ انقلابات میں سے) کس انقلاب سے ہے۔ اسے اس نے ہمارے غور و
 تدبّر پر چھوڑ دیا ہے۔ اور غور و تدبّر سے یہ بات سمجھ میں آ بھی جاتی ہے کہ فلاں منظر کا تعلق کس انقلاب

سے ہے۔

(دنیا کی دوسری زبانوں کی طرح، بلکہ ان سے بھی کچھ زیادہ کثرت سے) عربی زبان میں الفاظ

کے لغوی یا حقیقی معانی (LITERAL MEANINGS) بھی ہوتے ہیں اور مجازی

(METAPHORICAL) معانی بھی۔ مثلاً جب ہم کہتے ہیں کہ جنگل میں شیر دھاڑا، تو وہاں "شیر"

کے معنی لغوی یا حقیقی ہوں گے۔ لیکن جب ہم کہیں گے کہ وہ تو شیر ہے، تو وہاں شیر کے معنی مجازی (یعنی بہادر) ہوں گے۔ اس اعتبار سے انقلاب ۲۱ کی تفصیل کے اگر حقیقی معانی لئے جائیں تو ان سے مراد کائنات کا کوئی طبیعی حادثہ ہو گا جس کا ہمیں اس وقت علم نہیں ہو سکتا۔ لیکن اگر ان کے مجازی معانی لئے جائیں تو ان کا تعلق ان تصادمات سے ہو گا جو دنیا میں مختلف گروہوں اور باقوموں میں رونما ہوتے ہیں۔ یعنی اس صورت میں ان کا تعلق انقلاب ۲۱ سے ہو جائے گا۔ جہاں تک انقلاب ۲۱ کی تفصیل کا تعلق ہے، ان کے معانی بہر حال مجازی ہی لئے جائیں گے کیونکہ آخری زندگی کی کنہ و حقیقت کے متعلق ہم اپنے شعور کی موجودہ سطح پر کچھ نہیں سمجھ سکتے۔ اسی لئے قرآن کریم نے اسے تمثیلی رنگ ہی میں پیش کیا ہے۔ مثلاً وہاں اگر آگ (نار) کا ذکر ہے تو اس سے مراد وہ آگ نہیں جو یہاں چولھوں میں جلانی یا بھٹیوں میں بھڑکائی جاتی ہے۔ یہ ایک اضطرابی کیفیت کا تمثیلی بیان ہے۔ یہ وہ "خونِ آرزو" ہے جس کا رنگ و بو نہیں دیکھا جاسکتا۔ لیکن یہ وہ کیف ہے جسے بادہ و ساغر کے سیکڑوں سے تشبیہ دیتے بغیر بن نہیں پڑتی تھ

میں نے (اپنی تالیف) "مفہوم القرآن" میں، قرآن کریم کی اس قسم کی آیات کے مجازی معانی متعین کر کے، ان کا مفہوم پیش کیا ہے اور وہی مفہوم میں یہاں بھی پیش کر سکتا تھا۔ لیکن اس سوال پر کافی غور و خوض کے بعد، میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اس کتاب میں ان آیات کو عالم

لے	کے بتائے کوئی خونِ آرزو کیا ہے
۷	انہیں یہ ضد ہے کہ دیکھیں گے رنگِ بُو کیا ہے
	ہر چند ہو مشاہدہ حق کی گفتگو
	بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر
	(ریاضِ خیر آبادی)
	(غالب)

پیش کر دینا چاہیے اور اسے قارئین کے اپنے فہم و بصیرت پر چھوڑ دینا چاہیے کہ وہ متعلقہ الفاظ کا حقیقی مفہوم لینا چاہتے ہیں یا مجازی۔ بنا بریں، ان آیات کا لغوی ترجمہ پیش کر دیا جائے گا۔ (جو حضرات، میرا متعین کردہ مجازی مفہوم دیکھنا چاہیں، وہ ”مفہوم القرآن“ میں دیکھ سکتے ہیں)۔

عظیم تغیرات

ان تغیرات سے متعلق آیات کا لغوی ترجمہ ذیل میں دیا جاتا ہے۔ آیات کا حوالہ دیا گیا ہے۔ آپ ان آیات کو قرآن کریم کے کسی نسخے سے دیکھ لیں۔ (۱) اوپر سورت کا نمبر ہے اور نیچے آیت کا نمبر۔
(۱) لوگو! اپنے رب کا تقویٰ اختیار کرو۔ یقیناً ساعت (اُس انقلاب) کا زلزلہ ایک عظیم شے ہوگا۔ جس دن تم دیکھو گے کہ ہر دودھ پلانے والی اپنے شیر خوار بچے کو بھول جائے گی اور حمل والیوں کے حمل گر جائیں گے اور تو، لوگوں کو دیکھے گا کہ وہ مدہوش سے ہیں، حالانکہ وہ مدہوش نہیں ہوں گے۔ یہ خدا کے عذاب کی ہولناکی کی وجہ سے ہوگا (۱۱-۲۲/۲)۔

(۲) یہ ”ساعت“ بڑی ہولناک اور پُر خطر ہے (۵۴/۴۶)۔ یہ زمین اور آسمان پر گراں گزرے گی (۱۸۷/۷)۔

(۳) جب ایک بار صور پھونکا جائے گا اور زمین اور آسمان ایکبارگی اٹھا کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے جائیں گے تو اس دن یہ واقعہ وقوع پذیر ہوگا (۱۳-۱۵/۴۹)؛ (۶۸-۷۹/۴۹)۔

(۴) جب آسمان پھٹ جائے گا اور ستارے جھڑپڑیں گے (۸۲/۲)۔
(۵) جب آفتاب سیاہ ہو جائے گا اور ستارے تاریک ہو جائیں گے۔ اور جب پہاڑ چلا دیئے جائیں گے اور جب دس دس مہینے کی گامبھن اونٹنیاں چھٹی چھٹی پھریں گی اور جب وحشی (جانور یا انسان) اکٹھے ہو جائیں گے۔ اور جب سمندر بھر دیئے جائیں گے (۱-۶/۸۱)؛ (۸-۱۰/۷۷)۔

(۶) جس دن لوگ بکھرے ہوئے پروانوں کی طرح اور پہاڑ دھنی ہوئی اون کی طرح ہو جائیں گے (۱۱/۵)۔

(۷) لوگ تجھ سے پہاڑوں کے متعلق پوچھتے ہیں۔ کہہ دے کہ میرا رب انہیں دھول کر دے گا۔ انہیں ہموار میدان بنا دے گا جس میں نہ کہیں بلندی ہوگی نہ پستی (۱۰۵-۱۰۷/۲۰)۔

(۸) جس دن ہم آسمان کو اس طرح لپیٹ لیں گے جس طرح کاغذوں کا صحیفہ لپیٹا جاتا ہے۔
(۲۱/۱۰۴)۔ اس دن زمین ساری اس کے قبضے میں ہوگی اور آسمان لپٹے ہوئے اس کے داہنے ہاتھ
میں ہوں گے (۳۹/۶۷)۔

(۹) جس دن زمین بدل کر دوسری زمین بنا دی جائے گی اور آسمان دوسرے آسمان میں تبدیل
کر دیئے جائیں گے اور لوگ خدائے واحد القہار کے حضور نمودار ہو جائیں گے (۱۴/۴۸)۔
(۱۰) جس دن آسمان پھٹ کر بدلی نمایاں ہوگی اور ملائکہ کا نزول ہوگا۔ اس دن اختیار و اقتدار

سب خدائے رحمان کے لئے ہوگا (۲۵/۲۶-۲۵)؛ (۱-۸۴/۵)۔
(۱۱) اور آسمان پھٹ جائے گا اور اس دن وہ کمزور ہوگا اور اس کے کناروں پر ملائکہ ہونگے
(۶۹/۱۷)۔

(۱۲) جس دن ملائکہ اور روح، صف بستہ کھڑے ہوں گے۔ کوئی بول نہ سکے گا مگر وہی جس کو
اللہ اجازت دے اور وہ بات بھی معقول کہے (۴۸/۳۸)؛ (۱۱/۱۰۵)۔
(۱۳) جس دن پہاڑ چلائے جائیں گے اور تو زمین کو دیکھے گا کہ وہ اُٹھ جائے گی اور ان سب
کو اکٹھا کیا جائے گا۔ ایک کو بھی نہیں چھوڑا جائے گا اور خدا کے حضور صف بستہ حاضر کئے جائیں گے
(۴۷-۱۸/۴۸)۔

(۱۴) یہ پہاڑ، جنہیں تو سمجھتا ہے کہ بہت مستحکم اور اپنے مقام پر جمے ہوئے ہیں بادلوں کی طرح
اُڑتے پھریں گے (۲۷/۸۸)۔

(۱۵) جس دن آسمان لرز رہا ہوگا اور پہاڑ چل رہے ہوں گے (۵۲/۱۰-۹)۔
(۱۶) جب وہ واقعہ ہوگا تو بلندیاں پستیوں میں بدل جائیں گی جب زمین میں سخت زلزلہ آئے گا
اور پہاڑ گر کر ریزہ ریزہ ہو جائیں گے اور دھول بن جائیں گے (۵۶/۶-۱)۔
(۱۷) جس دن آسمان پگھلے ہوئے تانبے کی طرح ہو جائے گا اور پہاڑ اون کی طرح (۷۰/۹-۸)۔
(۱۸) جس دن زمین اور پہاڑوں میں زلزلہ آجائے گا اور پہاڑ ایسے ریت کے ڈھیر بن جائیں گے
جو نیچے کی طرف پھسلتی چلی جائے (۷۳/۱۴)۔

(۱۹) جب آسمان کھلا ہوا دُخان (دھواں) ہوگا (۴۴/۱۰)۔

- (۲۰) جب زمین پھٹ جائے گی اور وہ تیزی سے نکل پڑیں گے (۵۰/۴۴)۔
- (۲۱) جس دن ایک بلا نے والا انہیں ایسی بات کی طرف بلائے گا جو ان پر سخت ناگوار گزرے گی۔ وہ آنکھیں جھکائے اس طرح قبروں سے نکل پڑیں گے جس طرح مٹی دل پھیل جاتا ہے اور دوڑ کر اس پکارنے والے کے پاس پہنچ جائیں گے (۵۲/۸-۶)۔
- (۲۲) جب لگا ہی خیر ہو جائیں گی۔ چاند گہن میں آجائے گا اور شمس و قمر اکٹھے ہو جائیں گے (۵۵/۹-۷)۔
- (۲۳) جس دن صور پھونکا جائے گا تو تم فوج در فوج نکل آؤ گے اور آسمان کھول دیا جائے گا تو وہ (چوہٹ) دروازوں کی طرح ہو جائے گا اور پہاڑ چل پڑیں گے تو وہ سراب کی طرح ہو جائیں گے (۵۸/۲۰-۱۸)۔
- (۲۴) وہ ایک عظیم حادثہ ہے جس کے بارے میں یہ اختلاف کرتے ہیں (۵۸/۳-۱)۔
- (۲۵) جس دن کانپنے والی کانپ اٹھے گی اور اس کے پیچھے آنے والی آئے گی۔ اس دن کتنے دل دھڑک رہے ہوں گے اور لگا ہی جھکی ہوئی ہوں گی (۵۹/۹-۶)۔
- (۲۶) یہ طاعۃ الکبریٰ — بہت بڑا حادثہ ہوگی (۵۹/۳۴)۔
- (۲۷) جب وہ تصادم کا حادثہ واقع ہوگا جس میں کانوں پڑی آواز سنائی نہیں دے گی (۸۰/۳۳)۔
- (۲۸) وہ ایسی مصیبت ہوگی جو ہر طرف سے چھا جائے گی (۸۸/۱)۔
- (۲۹) جب زمین میں زلزلہ آجائے گا اور وہ اپنے دبلے ہوئے بوجھوں کو اُگل دے گی۔ وہ اپنے حالات کو عام کر دے گی۔ لوگ منتشر گرد ہوں گی شکل میں نکل آئیں گے (۹۹/۶-۱)۔
- (۳۰) خدا کا امر آنکھ جھپکنے کے وقفہ میں آجائے گا (۵۳/۵۰)۔

۞۞۞

یہ ہیں اس انقلاب کی تفصیل جس کا ذکر قرآن کریم میں آیا ہے۔ جیسا کہ شروع میں لکھا جا چکا ہے، ہم نے ان آیات کا لغوی ترجمہ دیدیا ہے (اور حوالہ بھی تاکہ آپ انہیں قرآن کریم سے خود نکال کر دیکھ لیں) اور فیصلہ کر لیں کہ ان کے معانی لغوی (حقیقی) لینے چاہئیں یا مجازی۔ اور یہ بھی کہ انکا تعلق انقلاب کے ان تین گوشوں میں سے کس سے ہے جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں دو تین آیات اور بھی ہیں جو خصوصی توجہ کی محتاج ہیں۔ سورہ مطففین میں ہے۔

يَوْمَ يَقُومُ النَّاسُ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ (۸۳/۶)

جس دور میں نوح انسان "رب العالمین" کیلئے اٹھ کھڑی ہوگی۔

اور

وَجَاءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا (۸۹/۲۳)
تیرا رب اور ملائکہ صف در صف آئیں گے۔

اور

وَأَشْرَقَتِ الْأَرْضُ بِنُورِ رَبِّهَا (۳۹/۷۹)
زمین اپنے نشوونما دینے والے کے نور سے جگمگاٹھے گی
یہ اور اس قسم کی دیگر آیات سے تو یہی مترشح ہوتا ہے کہ یہ کسی ایسے عالمگیر انقلاب سے متعلق ہیں
جو اس زمین پر واقع ہوگا۔ بہر حال ہم اب آگے بڑھتے ہیں۔

لوگوں کی حالت

ادھر جو آیات درج کی گئی ہیں ان کا تعلق اشیائے کائنات سے ہے۔ اب ہم ان آیات کو سامنے
لاتے ہیں جن میں یہ مذکور ہے کہ اس انقلاب میں لوگوں کا کیا حال ہوگا؟ ان آیات کے سلسلہ میں بھی
آپ اُن کے حقیقی اور مجازی معانی کے فرق کو پیش نظر رکھئے اور یہ بھی دیکھئے کہ مذکورہ صدر ہر انقلابات
میں سے ان کا تعلق کس انقلاب سے ہے۔

- (۱) جس دن کچھ چہرے سیاہ ہوں گے کچھ سفید (روشن) (۱۰۵-۳/۱۰۴)؛ (۴۶/۲۶)۔ کچھ چہرے شکستہ
و شاداب کچھ افسردہ و پشیمان (۲۲-۶۵/۲۴)؛ (۶۶/۱۱)؛ (۳۸-۸۰/۴۲)؛ (۲۱-۸۸/۶)۔
- (۲) مجرمین سر جھکائے رکھے حضور آئیں گے (۳۲/۱۴)۔ آواز بھی پست ہوگی (۱۰۸-۲۰/۱۱)۔
- (۳) لوگ اپنے خلاف آپ سے شہادت دیں گے (۴/۱۳۱)؛ (۶/۳۶)۔ ہر شخص اپنے آپ سے جھگڑتا
ہو آئے گا (۱۱/۱۱۱)۔ ہاتھ پاؤں زبانی اس کے خلاف گواہی دیں گے (۲۴-۲۵/۲۴)؛ (۲۱-۲۰/۲۰)۔
- (۴) ہر ایک اپنا اپنا اعمال نامہ لئے ہوئے آئے گا (۱۴/۴۱)؛ (۱۹۱-۴۹/۲۶)۔
- (۵) جس طرح پہلی بار پیدا کیا گیا تھا اسی طرح فردنی حاضر ہوں گے (۶/۹۵)۔
- (۶) مختلف گروہ آپس میں اختلاف کریں گے۔ اس دن ان کی سماعت و بصارت بڑی تیز ہوگی۔

اس دن تمام معاملات کے فیصلے ہو جائیں گے اور ظالمین کے لئے وہ دن بڑی ہی حسرت کا ہوگا (۳۷-۳۸/۱۹)۔
 (۷) اس دن عدل کے ترازو کھڑے کئے جائیں گے اور اعمالِ انسانی کا ذرہ ذرہ سامنے آجائے گا
 (۴۱/۴۱)؛ (۷۹/۸-۷۹) جس کا پڑا جھک جائے گا وہ کامیاب ہوگا جس کا اٹھا رہے گا وہ ناکام ہوگا
 (۱۰۱/۱۱-۱۰۱)۔

(۸) اختیارِ اقدار سب خدا کے لئے ہوگا وہ ان سب میں فیصلہ کرے گا (۲۲/۵۶)۔ ہر ایک کو اس
 کے کئے کا پورا پورا بدلہ ملے گا۔ کسی پر ظلم و زیادتی نہیں ہوگی (۱۶-۱۷/۴۰)۔
 (۹) آنکھیں اور قلوب الٹ جائیں گے (۲۳/۳۷)۔ دل اچھل کر حلق تک آجائیں گے (۱۸/۴۰)۔ وہ کنکھوں
 سے دیکھیں گے (۲۲/۴۵)۔

(۱۰) ان پر عذاب اور پراور نیچے سے محیط ہو جائے گا (۱۲۹/۵۵)۔
 (۱۱) مجرم الگ ہو جائیں گے (۳۶/۵۹)۔ وہ اپنی پیشانیوں سے پہچانے جائیں گے (۵۵/۴۱)۔
 (۱۲) ان کی گردنوں میں طوق پہنائے جائیں گے۔ ان کے آگے اور پیچھے دیواریں کھڑی کر دی جائیں گی۔
 وہ اس طرح ڈھانپ دیئے جائیں گے کہ کچھ دیکھ ہی نہیں سکیں گے (۳۶/۹)۔
 (۱۳) ان کے جرائم نمایاں ہو کر ان کے سامنے آجائیں گے اور ان کے نتائج انہیں اپنے اندر گھریں
 (۴۷-۴۸/۳۹)؛ (۴۰/۱۶)؛ (۴۵/۳۳)۔

(۱۴) جس دن مجرموں کو یوں عدالت میں لایا جائے گا کہ ایک پیچھے سے ہانکنے والا ہوگا اور ایک
 ساتھ نگران (یا گواہ) ہوگا (۵۰/۲۱)۔ گواہ ساتھ کھڑے کئے جائیں گے (۴۰/۵۱)۔
 (۱۵) اس دن نگاہوں پر پڑے ہوئے پردے اٹھ جائیں گے اور نظریں بڑی تیز ہو جائیں گی
 (۵۰/۲۲)۔

(۱۶) متقیوں کے علاوہ باقی سب کے دوست بھی دشمن ہو جائیں گے (۴۳/۶۷)۔
 (۱۷) اس دن (خوف کے مارے) کوئی بات نہیں کر سکے گا۔ نہ ہی کسی کی معذرت قبول کی جائیگی
 (۳۵-۳۶/۷۷)۔

(۱۸) وہ اپنے رب سے محبوب ہوں گے (۸۳/۱۵)۔
 (۱۹) اس دن ہر ایک سے نعمائے خداوندی کے متعلق باز پرس ہوگی (۸/۱۰۲)۔

اقوام کا ذکر

بعض مقامات پر افراد کے بجائے اقوام کا بھی ذکر آیا ہے۔ مثلاً سورۃ اعراف میں ہے کہ جب ایک قوم جہنم میں داخل ہوگی تو دوسری قوم اس پر لعنت بھیجے گی اور ان کا باہمی جھگڑا ہوگا۔ ہر قوم دوسری کو مطعون کرے گی کہ اس نے اسے گمراہ کیا تھا اور خدا سے کہے گی کہ اسے دوہرا عذاب دیا جائے جو آپ ملے گا کہ تم سب کو دوہرا عذاب دیا جائے گا۔ اس لئے کہ ہر قوم کی روش اور مسلک کا اثر دوسری اقوام پر پڑتا ہے (۳۸-۴۰/۱۴)۔ سورۃ جاثیہ میں ہے کہ ہر قوم گھٹنوں کے بل جھکی ہوئی آئے گی اور ہر ایک کو اس کے اعمال نامہ کی طرف دعوت دی جائے گی تاکہ اسے اس کے اعمال کا بدلہ دیا جائے (۲۸/۴۵) نیز (۵۹/۳۸)۔

باہمی جھگڑے

شُرّانِ کریم نے متعدد مقامات میں بتایا ہے کہ جہنم میں مختلف افراد اور مختلف گروہ ایک دوسرے کے ساتھ جھگڑیں گے (۱) اور ایک دوسرے کو مطعون کریں گے کہ اس نے اسے غلط راستے پر ڈال دیا تھا۔ ان میں وہ جھگڑے بڑے عبرت انگیز اور بصیرت افروز ہیں جو مفاد پرست لیڈروں اور ان کے متبعین (FOLLOWERS) میں ہوں گے۔ شُرّانِ کریم نے ان کی باہمی بحث و تھقیص اور طعن و تشنیع کو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ مثلاً

(۱) سورۃ ابراہیم میں ہے کہ متبعین اپنے لیڈروں سے کہیں گے کہ ہم تمہارے پیچھے پیچھے چلا کرتے تھے اب اس عذاب کو ہم سے ہٹا دو۔ تم تو اپنی قوت کے اقتدار کے بڑے بڑے دعوے کیا کرتے تھے۔ وہ جواب میں کہیں گے کہ ہم خود عذاب میں مبتلا ہیں تمہاری مدد کیا کریں۔ اب چیخنا چلانا بیکار ہے (۲۱/۱۱۴) (۴۷-۴۸/۴۰)۔

(۲) سورۃ احزاب میں ہے کہ متبعین خدا سے کہیں گے کہ ہم اپنے جرائم کے ذمہ دار نہیں۔ ہم ان اکابرین کی اطاعت کیا کرتے تھے۔ انہوں نے ہمیں گمراہ کیا۔ سو انہیں دوہرا عذاب دو (۶۷-۶۸/۴۲)۔ ظاہر ہے کہ ان کا یہ عذر قابل پذیرائی نہیں ہوگا۔ ان سے کس نے کہا تھا کہ تم اپنی عقل و بصیرت کو کام

میں نہ لاؤ اور اندھا دھند دوسروں کے پیچھے چلتے جاؤ۔

(۳۱) سورہ سبأ میں ہے کہ جب لیڈر عوام سے کہیں گے کہ تم خود ہی غلط راستے پر چلنا چاہتے تھے، ہمارا تم پر کیا زور تھا جو ہم تمہیں غلط راستے پر زبردستی چلا تے! وہ جواب میں کہیں گے کہ تم دن رات اس قسم کی شاطرانہ چالیں چلتے رہتے تھے کہ ہم جیسے سادہ لوح تمہارے دایم زویر میں آجاتے تھے۔ یوں تم ہمیں اگلے راستے پر ڈال دیتے تھے (۳۱-۳۳/۳۳)؛ (۲۶۱-۲۶۲/۳۴)۔

(۳۲) سورہ ص میں ہے کہ ہم مسلک لوگوں کا ایک گروہ جہنم میں داخل ہوگا تو ان میں بھی باہمی یہی تکرار ہوگی کہ اس عذاب کا ذمہ دار کون ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی کہیں گے کہ وہ لوگ کہاں گئے جو ہمیں دنیا میں غلط کاموں سے روکا کرتے تھے اور ہم کہا کرتے تھے کہ وہ بدترین خلائق ہیں (وہ جنت میں ہوں گے) (۵۹۱-۳۸/۴۳)۔

یہ کچھ کہنے کے بعد قرآن میں ہے کہ إِنَّ ذَلِكَ لَحَقٌّ تَخَاصُّمُ أَهْلِ النَّارِ (۳۸/۴۳) جہنم والوں کے یہ باہمی جھگڑے یقینی بات ہے۔ (نیز ۳۱/۳۹)۔

(۵) سورہ مومن میں متبعین اور لیڈروں کے باہمی جھگڑے کے بعد ہے کہ وہ لوگ جہنم کے مخاطبین سے کہیں گے کہ تم ہی کچھ کرو کہ ہم پر یہ عذاب ہلکا ہو جائے۔ لیکن انہیں اس کا اختیار ہی نہیں ہوگا (۴۷-۵۰)۔ (۶) سورہ ق میں لیڈروں اور متبعین کے شخاصم کے بجائے ان لوگوں کی باہمی تکرار کا ذکر ہے جو دنیا میں ایک دوسرے کے دست تھے۔ وہاں ان میں سے ہر ایک دوسرے کو مطعون کرے گا کہ اس نے اسے بہکایا کہ غلط راستوں پر ڈال دیا تھا (۲۳-۵۰/۲۸)۔ ان کے برعکس، سورہ صافات میں ایک ایسے دست کا ذکر ہے جو اپنے رفقاء کو بہکایا کرتا تھا لیکن وہ اس کی باتوں میں نہیں آتے تھے اس لئے وہ جنت میں تھے اور ان کا یہ مصاحب (قرین) دوزخ میں (۵۱-۳۷/۵۷)۔

مذہبی پیشواؤں کے ساتھ جھگڑے

یہ جھگڑے لیڈروں کے ساتھ ان کے متبعین کے تھے۔ دیگر مقامات پر روحانی پیشواؤں اور مذہبی مقتداؤں کے ساتھ ان کے عقیدت مندوں اور مقتدیوں کے جھگڑوں کا بھی ذکر آیا ہے۔ ان میں بھی یہی کہا گیا ہے کہ وہ ایک دوسرے کو مطعون کریں گے اور مذہبی پیشوا ان کی گمراہی کی ذمہ داری لینے سے انکار

کردیں گے (۶۲۱-۶۲۸/۶۶)؛ (۶۴-۶۵/۶۸)؛ (۱۳-۱۴/۳۰)۔

اہل جنت اور اہل جہنم کی باہمی گفتگو

سورۃ حدید میں ہے کہ اہل جنت کی پیشانیوں کا نور ان کے آگے آگے چل رہا اور اس طرح ان کی راہوں کو روشن کر رہا ہوگا۔ منافقین ان سے کہیں گے کہ ہم بھی تو تمہارے ساتھ ہوا کرتے تھے ذرا کو کہ ہم تمہارے چراغوں سے تھوڑی سی روشنی مستحار لے لیں۔ وہ جواب میں کہیں گے کہ یہ ویسے تو اپنے اعمال کے تیل سے جلتے ہیں، مانگے سے کسی کو روشنی نہیں مل سکتی۔ اس روشنی کا سرمایہ حاصل کرنا ہے تو پھر دنیا میں جانا ہوگا۔ (جہاں اب کوئی واپس جا نہیں سکتا)۔ پھر کہا ہے کہ ان دونوں کے درمیان ایک دیوار حائل ہوگی جس میں ایک دروازہ ہوگا۔ اس کے اندر کی طرف رحمت ہوگی اور باہر کی طرف عذاب (۱۲۱-۱۳/۵۴)۔

سورۃ مدثر میں ہے کہ اہل جنت، اہل جہنم سے پوچھیں گے کہ تم نے کیا کیا تھا کہ جو تم اس عذاب میں گرفتار ہو گئے اور وہ بتائیں گے کہ ہم نے کیا کیا جرائم کئے تھے (۴۰-۴۴/۴۶)۔ اور اہل جنت تو چونکہ ایک برادری کی حیثیت سے یک جا ہوں گے۔ اس لئے ان کی زندگی ایک معاشرہ کی سی ہوگی۔ ان کی باہمی گفتگو کے تذکرے بڑی شرح و بسط سے آئے ہیں (مثلاً ۲۵-۵۲/۲۶) تفصیل جنت کے عنوان میں ملے گی۔

اہل جہنم کا تاسف

اہل جہنم اپنے مال کو دیکھ کر سخت متاسف ہوں گے۔ سورۃ الحاقہ میں ہے کہ جب ایسے شخص کا اعمال نامہ اس کے ہاتھ میں دیا جائے گا تو اس میں اپنا انجام دیکھ کر چیخ اٹھے گا اور باصد حسرت دیاں کہے گا کہ یَلَيْتُهَا كَانَتْ الْقَاضِيَةَ (۲۷/۶۹) اے کاش! موت میرا خاتمہ کر دیتی۔ يَلَيْتُ تَنِي كُنْتُ شَرَابًا (۴۸/۴۰) اور میں مٹی کا ڈھیر ہوتا۔ اُس وقت اسے اس کا احساس ہوگا کہ اس نے دنیا کی

لے متبوعین اور متبعین کے باہمی جھگڑوں کے سلسلہ میں ”جہنم“ کا عنوان بھی دیکھے۔

زندگی میں اس حقیقت کو نہ سمجھا۔ یَقُولُ یَلِکْتَنِی قَدْ مُتَ لِحَیَاتِی (۸۹/۲۳) زندگی کہلانے کی مستحق تو یہ زندگی ہے۔ اے کاش! میں نے اپنی اس زندگی کے لئے کچھ پہلے سے بھیجا ہوتا۔

واپسی نہیں ہوگی

لیکن اس تاسف کا وہاں کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ انسانی ذات کا مستقبل تو اس دنیا کے اعمال کے مطابق مرتب ہونا تھا اور اس دنیا کی زندگی ختم ہوگئی۔ وہاں اس کے لئے کوئی موقع نہیں ہوگا اور تاسف بالائے تاسف کہ وہاں اس سے دنیا کی طرف واپسی بھی نہیں ہو سکے گی۔ (جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے) مرنے والا کہے گا کہ رَبِّ ارْجِعُونِ لَعَلِّیْٓ اَعْمَلُ صَالِحًا فِیْمَا تَرٰکْتُ (۲۳/۱۰۰) اے میرے نشوونما دینے والے! تو مجھے ایک بار پھر واپس بھیج دے تاکہ میں وہ اچھے کام جو پہلے نہیں کر سکا تھا اب کر کے دکھاؤں۔ جواب ملے گا۔ کَلَّا (۲۳/۱۰۰) نہیں۔ اب ایسا وقت گیا۔ اب واپسی نہیں ہو سکتی۔ اسی سورۃ میں ذرا آگے چل کر ہے کہ جہنم والا پکارے گا کہ اے میرے پروردگار! مجھے یہاں سے نکال کر بھیج دے۔ اگر میں پھر یہی کچھ کروں تو واقعی میں مجرم ہوں گا۔ جواب ملے گا کہ اب ایسا نہیں ہو سکتا (۲۳/۱۰۴)۔ سورۃ سجدہ میں ہے کہ مجرمین کہیں گے کہ اب ہم نے حقیقت کو اپنے سامنے بے نقاب دیکھ لیا ہے اور ان فیصلوں کو اپنے کانوں سے سُن لیا ہے۔ فَارْجِعْنَاْ لَعْمَلْ صَالِحًا اِنَّا مُؤْمِنُوْنَ ۵ (۳۲/۱۲) اب ہمیں یقین آگیا ہے کہ واقعی غلط روش کا نتیجہ تباہی ہوتا ہے۔ تو ہمیں واپس بھیج دے تاکہ وہاں جا کر اچھے کام کریں۔ لیکن ایسا نہیں ہو سکے گا۔ زندگی صراطِ مستقیم پر سیدھی آگے بڑھتی ہے۔ اس کی حرکت دوری (CYCLIC) نہیں۔ سورۃ فاطر میں مجرمین کی اس استدعا کے جواب میں کہا گیا ہے کہ اب جو تم کہتے ہو کہ ہمیں اگر دوبارہ موقع ملے تو ہم صحیح راستے پر چل کر دکھائیں۔ تم یہ بتاؤ کہ تمہیں پہلی زندگی میں کوئی کم موقع ملا تھا؟ تمہارے پاس وقت بھی تھا اور بتانے والے تمہیں بتا بھی رہے تھے کہ صحیح راستہ کونسا ہے اور غلط کونسا۔ اس سے تم نے فائدہ کیوں نہ اٹھایا۔ سورۃ زمر میں یہاں تک کہہ دیا گیا ہے کہ تمہیں اس وقت کہا جاتا تھا کہ اب وقت ہے۔ اپنی روش کو بدل لو، بعد میں یہ نہ کہنا کہ اگر ہمیں دوبارہ موقع دے دیا تو ہم اپنی اصلاح کر لیں دوبارہ موقع نہیں ملے گا (۳۹/۵۸)۔ نیز (۴۲/۲۷)۔

وہاں موت بھی نہیں آئے گی

اس عذاب سے چھٹکارا حاصل کرنے کی دوسری صورت یہ ہو سکتی تھی کہ انسان کو موت آجائے لیکن وہاں موت بھی نہیں آئے گی۔ لَا يُقْضٰی عَلَيْهِمْ فِيمَوْثُوْا (۳۵/۳۶)؛ (۴۳/۷۷)۔ قرآن کریم میں ہے کہ اس دنیا کی زندگی سے پہلے انسان زندہ نہیں تھا۔ وہ بھی گویا موت کا عالم تھا۔ اس کے بعد زندگی ملی۔ یہ ایک موت اور ایک زندگی ہو گئی۔ اس کے بعد پھر ایک موت آئے گی اور پھر زندگی ملے گی۔ اس طرح دو موتیں اور دو زندگیاں ہو گئیں۔ قرآن نے انہی (دو زندگیاں اور دو موتوں) کا ذکر کیا ہے (۲/۲۸)؛ (۴۰/۱۱)۔

لیکن جہنم کی زندگی، نہ زندگی ہوگی نہ موت۔ قرآن میں ہے۔ لَا يَمُوتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰی (۲۰/۷۴)۔ وہ اس (جہنم) میں نہ جنیں گے نہ مریں گے۔ (نیز ۸۷/۱۳)۔ کیفیت یہ ہوگی کہ يٰۤاَيُّهَا الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَ مَا هُوَ بِمَيِّتٍ (۱۱۳/۱۷) اسے نظر آئے گا کہ موت ہر طرف سے اس کی طرف بڑھتی چلی آ رہی ہے لیکن اس کے باوجود وہ مرے گا نہیں۔ اُس اُس قدر مستقل عذاب کی ہے یہ الم انگیز زندگی جس میں۔

موت آتی ہے پر نہیں آتی

یہ ہیں روز جزا کی وہ تفصیل جن کے متعلق کہا کہ اِنَّهٗ لَحَقُّ الْيَقِيْنِ (۹۹/۵۱) ان کا واقع ہونا ایک یقینی حقیقت ہے۔ مِثْلَ مَا اَنْتُمْ تَنْطِقُوْنَ (۵۱/۲۳) ایسا یقینی جس طرح تم ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہو تو تمہیں اس میں کوئی شبہ نہیں ہوتا کہ یہ گفتگو باہم گمراہی ہے۔

اس موضوع کو ختم کرنے سے پہلے ایک اہم نکتہ کا (باردگر) سامنے لانا ضروری ہے۔ اوپر لکھا جا چکا ہے کہ جہنم میں قویں داخل ہوں گی۔ اس جہنم سے مراد اگر اس دنیا کی تباہی لی جائے تو پھر بات خود بخود واضح ہو جاتی ہے کہ قوی تباہی تمام افراد پر یکساں آیا کرتی ہے۔ اس میں اچھے اور بُرے کی تمیز نہیں ہوا کرتی (تفصیل پہلے گزر چکی ہے) لیکن اگر اس سے مراد اخروی زندگی کا جہنم لیا جائے تو قوم یا گروہ سے مراد ہوگی ہم سب

نے موت نہ اہل جہنم کو ہوگی نہ اہل جنت کے لئے۔ اس سلسلہ میں دیکھئے (۵۸ - ۵۹/۲۷)؛ (۴۳/۵۶)۔ (تفصیل ان امور کی آگے چل کر ملے گی)۔

لوگوں کی جماعت۔ یعنی دنیا میں ایسا ہوتا ہے کہ ایک غلط کار قوم میں ایسے افراد بھی ہوتے ہیں جو ان کے ہم نوا نہیں ہوتے۔ وہ انہیں 'ان کی غلط روش پر ٹوکتے بھی رہتے ہیں اور علیٰ قدر وسعت اسے بدلنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ قرآن کریم نے دربارِ فرعون کے اس مردِ مومن کا ذکر بڑی شرح و بسط سے کیا ہے جس نے بھرے دربار میں فرعون کی پالیسی کی مخالفت اور حضرت موسیٰ کے مسلک کی تائید بڑے مدلل اور پرجوش انداز میں کی تھی۔ یہ تقریر ایسی بصیرت افروز تھی کہ قرآن کریم نے اسے اپنے دامنِ حفاظت میں لے کر ابدیت درکنار کر دیا ہے (۲۸-۴۰/۲۴)۔ اسی طرح اس نے فرعون کی میوی کے ایمان کا ذکر بھی بڑی تبریک و تحسین سے کیا ہے (۱۱/۶۶)۔ آخری زندگی میں اس قسم کے افراد اس قوم سے الگ ہوں گے اور جہنم میں غلط کار لوگوں کا گروہ ہی جائے گا۔ یہی ہیں ہم فکرو ہم عمل افراد کے گروہ جن کے متعلق کہا کہ ذٰلِیْنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا اِلٰی جَهَنَّمَ ذُمْرًا (۳۹/۴۱) اہل کفر جہنم کی طرف گروہ درگروہ لاتے جائیں گے۔ ذٰلِیْنَ الَّذِیْنَ اٰثَقُوْا رَبَّهُمْ اِلٰی الْجَنَّةِ ذُمْرًا (۳۹/۴۲) اور متقی بھی اسی طرح گروہ درگروہ جنت کی طرف بڑھائے جائیں گے۔ یہاں کی زندگی میں تو سب ملے جلے رہتے ہیں۔ لیکن وہاں یہ چھٹ کر دو الگ الگ گروہوں میں منقسم ہو جائیں گے۔ جن افراد کی ذات کی اس حد تک نشوونما ہو چکی ہوگی کہ وہ اس زندگی کے بعد اگلی زندگی کے مزید ارتقائی مراحل طے کرنے کے قابل قرار پائے گی، ان کا گروہ الگ ہوگا۔ یہ اہل جہنم کا گروہ کہلائے گا۔ سال بھر طالب علم ایک ہی کلاس میں رہتے ہیں۔ لیکن سالانہ امتحان کے بعد وہ (پاس اور فیل کے) دو گروہوں میں بٹ جاتے ہیں۔ قانون ارتقاء کی رو سے بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ ایک جنس (SPECIES) کے تمام افراد کا شمار ایک ہی گروہ میں ہوتا ہے۔ لیکن ان میں سے جو "اصح" (THE FITTEST) قرار پاتے ہیں، وہ زندگی کی اگلی منزل میں پہنچ جاتے ہیں۔ جن میں یہ صلاحیت نہیں ہوتی وہ آگے بڑھنے سے روک دیئے جاتے ہیں۔ اسی کو جہنم یا جحیم کہتے ہیں۔ (جحیم کے معنی ہی روک دیئے جانے کے ہیں)۔ تفصیل اس اجمال کی آپ کو چند قدم آگے چل کر جنت اور جہنم کے عنوانات میں ملے گی۔



سترھواں باب

شفاعت

جو موضوع پیچھے سے چلا آ رہا تھا اس میں ہم مسلسل آگے بڑھ سکتے تھے۔ لیکن راستے میں ایک مقام ایسا آتا ہے جہاں رُکنا نہایت ضروری ہے اور وہ مقام ہے عقیدہ شفاعت کا۔
جزا اور سزا کے متعلق شرعی تصور آپ کے سامنے آچکا ہے۔ اس تصور کی رُو سے آپ نے دیکھ لیا ہے کہ

(۱) قانونِ مکافاتِ عمل کی رُو سے انسان کا ہر عمل (حتیٰ کہ دل میں گزرنے والا خیال بھی) اپنا نتیجہ پیدا کرتا ہے۔ یہ خدا کا اٹل اور غیر تبدیل قانون ہے۔

(۲) کچھ کام تعمیری نتیجہ پیدا کرنے والے ہوتے ہیں اور کچھ تخریبی۔ ہر عمل کا نتیجہ ساتھ کے ساتھ مرتب ہوتا چلا جاتا ہے۔

(۳) جس شخص کا تعمیری نتیجہ پیدا کرنے والے اعمال کا پلڑا بھاری ہوتا ہے وہ ارتقائے حیات میں ایک منزل آگے بڑھ جاتا ہے۔ اسے جزایا جنت کی زندگی کہتے ہیں۔ جس کا وہ پلڑا ہلکا رہ جاتا ہے وہ آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اسے سزایا جہنم کی زندگی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اس تصور کی رُو سے آپ نے دیکھ لیا کہ کسی شخص کی جزا اور سزا کے سلسلہ میں خارج سے کسی کی مداخلت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

لیکن (دیگر مذاہب کی طرح) ہمارے ہاں بھی عام طور پر یہ مانا جاتا ہے کہ جن لوگوں پر ان کے

اعمال کے نتائج کی رو سے سزا مستحق ہو جائے گی۔ ”مقررین بارگاہِ خداوندی“ ان کے لئے خدا سے سفارش کریں گے اور ان کی سفارش پر خدا انہیں معاف کر دے گا اور وہ جنت میں چلے جائیں گے۔ اسے شفاعت کہا جاتا ہے اور ایسا کرنے والے کو شفیع (جمع شفاعاء) ظاہر ہے کہ یہ تصور (یا عقیدہ) اس ذہنیت کی تخلیق ہے جس کی رو سے خدا کو عام دنیاوی بادشاہوں (یا حاکموں) جیسا مطلق العنان بادشاہ سمجھا جاتا ہے جس کے ہاں نہ کوئی قاعدہ ہے نہ قانون۔ وہ جس سے خوش ہوتا ہے اسے یونہی گاؤں کے گاؤں جاگیر میں بخش دیتا ہے۔ ناراض ہوتا ہے تو جسے جی میں آئے باندھ لیتا ہے۔ جسے وہ اس طرح باندھ لیتا ہے اس کے حق میں اس (خدا) کے مصاحب یا مقرب سفارش کرتے ہیں۔ وہ ان کی سفارش قبول کر لیتا ہے اور مجرم کو بخش دیتا ہے۔

لیکن اس تصور کی رو سے قرآن کریم کی استوار کردہ قانونِ مکافاتِ عمل کی بلند بامِ عمارت ڈھیر ہو کر رہ جاتی ہے۔ وہ تو خیر عدل کی منزہ ترین شکل ہے۔ عام دنیاوی حکام میں سے جس کے متعلق مشہور ہو کہ وہ سفارشوں سے متاثر ہو کر فیصلے کر دیتا ہے اسے معاشرہ میں بڑی نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ لہذا یہ حقیقت بدامنا واضح ہے کہ سفارش (شفاعت) کا یہ تصور یکسر غیر شرعی ہے اور اس کے نظامِ عدل میں کسی طرح بارپا ہی نہیں سکتا۔

قرآن کریم نے باطل پرستوں کے اس عقیدہ کا ذکر کیا ہے جس کی رو سے وہ مانتے تھے کہ ان کے معبودان کی سفارش کر کے انہیں چھڑالیں گے۔ وَ يَقُولُونَ هُوَ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ شَفَعَاؤُنَا عِنْدَ اللَّهِ (۱۱۰/۱۸) یہ لوگ اپنے معبودوں کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ خدا کے ہاں ان کی سفارش کریں گے۔ لیکن قرآن کریم نے واضح الفاظ میں اس کی تردید کر دی اور کہہ دیا کہ سفارش کا یہ نظریہ ہی باطل ہے۔ سورہ بقرہ میں (یہودیوں کو جو شفاعت کے اس عقیدہ کے حامل تھے مخاطب کر کے) کہا۔

وَأَلْفَوْا يَوْمًا لَّا تَنجِي نَفْسٌ عَنْ نَفْسٍ شَيْئًا ۚ لَّا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ ۚ وَلَا يُظْهِرُ مِنْهَا عَدْلٌ ۚ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ ۝ (۲/۴۸)
 ڈرو اس دن سے جب کوئی شخص کسی دوسرے کے کسی کام نہیں آ سکے گا نہ ہی کسی کی

لے بد قسمتی سے اس عقیدہ کی تائید میں بہت سی وضعی روایات حضور رسالتماں کی طرف منسوب کر دی گئی ہیں۔

سفارش (شفاعت قبول کی جائے گی۔ نہ ہی کوئی شخص فدیہ (یا کفارہ) دے کر چھوڑ سکے گا۔
 نہ ہی مجرمین کی کوئی مدد کر سکے گا۔
 اسی سورہ میں ذرا آگے چل کر انہی الفاظ کو دہرایا گیا ہے اور کہا گیا ہے۔ وَ لَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ
 (۲/۱۷۳) کسی شخص کو کسی کی شفاعت کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکے گی۔
 ذرا آگے چل کر خود مسلمانوں سے کہا کہ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا مِمَّا رَزَقْنَاكُمْ مِنْ قَبْلِ أَنْ
 يَأْتِيَ يَوْمٌ لَا بِنَعٍ فِيهِ وَلَا نُعْلَىٰ وَلَا شَفَاعَةٌ ۖ وَالْكَافِرُونَ
 هُمْ الظَّالِمُونَ ۝ (۲/۲۵۴)

اے جماعت مومنین! جو کچھ ہم نے تمہیں دیا ہے اسے منعت عامہ کے لئے کھلا رکھو قبل
 اس کے کہ وہ دن آجائے جب جنت نہ تو مال و دولت کے عوض خریدی جا سکے گی۔ نہ ہی کسی
 دوست کی دوستی کسی کے کام آ سکے گی۔ نہ ہی کسی کی سفارش (شفاعت چل سکے گی جو اس حقیقت
 سے انکار کرتے ہیں وہ اپنے آپ پر بہت ہی ظلم کرتے ہیں۔

سورہ سبأ میں ہے۔ فَالْيَوْمَ لَا يَمْلِكُ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ نَفْعًا وَلَا ضَرًّا ۖ (۳۴/۳۲) آج
 تم میں سے کوئی بھی اس کا اختیار نہیں رکھتا کہ کسی کو نفع یا نقصان پہنچا سکے۔ سورہ مومن میں ہے۔ الْيَوْمَ
 تُجْزَىٰ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ ۖ اس دن ہر ایک کو اس کے کئے کا پورا پورا بدلہ ملے گا۔ مَا
 لِلظَّالِمِينَ مِنْ حَافِظٍ وَلَا شَفِيعٍ يُطَاعُ ۖ (۴۱/۱۸) اور جنہوں نے ظلم و زیادتی کی
 ہوگی ان کا کوئی دوست نہیں ہوگا نہ ہی کوئی سفارش کرنے والا جس کی اطاعت انہیں کوئی فائدہ
 دے سکے۔ دوسری جگہ ہے۔ لَمْ يَكُنْ لَهُمْ مِنْ شَرِّ مَا بِهِمْ شُفَعَاؤُ (۳۰/۱۳) جن لوگوں
 کو یہ شریک شفاعت کیا کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ وہ ان کی سفارش کریں گے ان میں سے کوئی بھی ان
 کا شفیع نہیں ہوگا۔ ایک اور مقام پر ہے۔ فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشَّافِعِينَ ۝ (۴۳/۴۸)۔
 شفاعت کرنے والوں میں سے کسی کی شفاعت ان کے کام نہیں آئے گی۔ سورہ انعام میں ہے کہ جن کے
 متعلق ان کا خیال تھا کہ وہ ان کی شفاعت کریں گے وہ سب ان کا ساتھ چھوڑ جائیں گے۔ ان کے
 تعلقات منقطع ہو جائیں گے اور جو کچھ وہ دل میں سمجھے بیٹھے تھے وہ سب زعم باطل ثابت ہوگا (۶/۹۵)۔

وہ خود اس کا اعتراف کریں گے کہ ان کا کوئی شفاعت کرنے والا نہیں (۴/۵۳)؛ (۲۶/۱۰۰)۔
 ان تصریحات سے سفارش کے متعلق قرآن کریم کا نظریہ واضح ہو گیا۔ لیکن اس میں بعض آیات ایسی بھی ہیں جن میں ”شفاعت“ کا ذکر ہے۔ سوال یہ ہے کہ ان آیات میں شفاعت کا مفہوم کیا ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ پہلے یہ متعین کیا جائے کہ لغت اور خود قرآن کریم کی رو سے اس لفظ (شفع) کے معنی کیا ہیں۔ میں نے (اپنی تالیف) لغات القرآن میں اس مادہ کی تشریح بڑی تفصیل سے کی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ موضوع کی اہمیت کے پیش نظر یہ زیادہ مناسب ہو گا کہ لغات کے متعلقہ حصہ کو یہاں درج کر دیا جائے۔

لغات القرآن کی رو سے شفیع کا مفہوم

”شَفَعْتُ“ اس لفظ کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کو کسی دوسری چیز کے ساتھ ملا دینا۔ دو چیزوں کو ایک دوسرے کے ساتھ ملا دینا۔ دو چیزوں کو ایک دوسرے کے ساتھ متصل کر دینا اور اس طرح ایک کو دوسرے کا (زَوْج) جوڑا بنا دینا۔ ”شَفَعْتُ“ کے معنی ہیں ”اکیلا رہنا (طاق ہونا) اور ”شَفَعْتُ“ کے معنی ہیں ”ذَوْج“ (بھت) ہونا۔ راغب نے کہا ہے کہ ”شَفَعْتُ“ کے معنی کسی چیز کو اس جیسی دوسری چیز کے ساتھ ملا دینے اور ضم کر دینے کے ہیں اور ”شَفَاعَةٌ“ کے معنی دوسرے کے ساتھ اس کی مدد کرتے ہوئے یا اس کی خبر گیری کرتے ہوئے مل جانے کے ہیں۔ ”شَفَعْتُ“ کے معنی ہوتے ہیں ”کوشش کر کے مطلوبہ شے کو اپنی چیزوں میں ملا لینا اور اس طرح اپنی چیز کو بڑھا لینا۔ فقہ کی اصطلاح میں یہ ایک خاص حق ملکیت ہوتا ہے جس کو رکھنے والا وہ قیمت دے کر جائیداد کا مالک بنا دیا جاتا ہے جو قیمت دوسرے لوگ اس جائیداد کی لگائیں۔ عَيْنُ شَفَاعَةٍ وہ آنکھ جو کمزوری کی وجہ سے ایک چیز کو دودیکھے۔ نَاقَةُ شَافِعٍ وہ اونٹنی جس کا ایک بچہ اس کے پیچھے لگا ہو اور دوسرا پیٹ میں ہو۔ نَاقَةُ شَفُوعٍ وہ اونٹنی جو ایک مرتبہ دودھ دوہنے میں دونوں وقت اکٹھا دیدے۔ الشَّفَائِعُ مختلف قسم کے گھاس جو دودھ ہو کر اکٹھے آگئیں۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ ”الشَّفَاعَةُ“ اس بکری کو کہتے ہیں جس کے ساتھ اس کا بچہ بھی ہو۔

ان مثالوں سے واضح ہے کہ ”شَفَعْتُ“ کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کا کسی دوسری چیز کے ساتھ مل جانا اور اس طرح ایک سے دو ہو جانا۔ اس کے بعد ”شَفَاعَةٌ“ کے معنی سفارش اس لئے ہو گئے کہ اس میں

ایک شخص کسی دوسرے شخص کی معاونت کے لئے اس کے ساتھ کھڑا ہو جاتا ہے اور اس کے حق میں سفارش کرتا ہے نیز اس کے معنی دعا کرنے کے بھی آتے ہیں۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ شَفَعَ فَلَانٌ لِفُلَانٍ اس وقت کہتے ہیں جب کوئی آدمی کسی کے ساتھ اس کا مددگار بن کر آئے اور جو کچھ وہ چاہتا ہے اس کے حصول کا طلب گار ہو۔

قرآن کریم انفرادی زندگی کے بجائے اجتماعی زندگی سکھاتا ہے کیونکہ فرد کی صلاحیتوں کی نشوونما اور اس کی ذات کی بالیدگی اجتماعی نظام ہی میں ممکن ہے۔ اس اعتبار سے جماعت مومنین کا ہر فرد دوسرے کا شَفِيعٌ ہوتا ہے۔ یعنی اس کی معاونت کے لئے ہر وقت اس کے ساتھ۔ اس نظام کا مرکز (امیر) ہر ایک کا شَفِيعٌ۔ وہ افراد کارواں میں سے کسی کو محسوس ہی نہیں ہونے دیتا کہ وہ تنہا ہے یہی باہمی (شفاعت) اس کی بنیادی خصوصیت ہے۔

اس جماعت کی یہ شَفَاعَةُ (معاونت) اپنے حلقہ سے باہر بھی جاتی ہے۔ اس لئے کہ ان کا فریضہ تمام نوع انسانی کی ربوبیت ہوتا ہے۔ اس کے لئے ان سے کہا گیا ہے کہ یہ بِرِّ وَ تَقْوٰی (کشادگی اور قوانین خداوندی کے مطابق) کاموں میں دوسروں سے تعاون کریں لیکن ان کے برعکس اِثْمٌ وَ عُذْرٌ ان میں تعاون نہ کریں (۵/۲)۔ اسی کو دوسرے الفاظ میں یوں کہا گیا کہ مَنْ يَشْفَعُ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَكُنْ لَّهِ نَصِيبٌ مِّنْهَا وَمَنْ يَشْفَعُ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَكُنْ لَّهِ كِفْلٌ مِّنْهَا (۴/۸۵) جو شخص حُسن کا رانہ انداز میں (اچھے کام میں) کسی دوسرے کے ساتھ مدد کے لئے اُٹھ کھڑا ہوتا ہے اسے اس میں سے حصہ مل جاتا ہے اور جو شخص تخریبی انداز سے (برے کام میں) کسی کا ساتھ دیتا ہے تو اس کو بھی اس میں سے حصہ مل جاتا ہے۔ واضح رہے کہ تعاون میں ایک دوسرے کی مدد کرنا مقصود ہوتا ہے لیکن شفاعت میں ایک شخص دوسرے شخص کی مدد کے لئے اس کے ساتھ ہو جاتا ہے۔

اب اس سے آگے بڑھتے۔ ہمارے ہاں مروجہ عقیدہ یہ ہے کہ جب قیامت میں حساب کتاب ہوگا اور مجرمین کو دوزخ کی سزا کا حکم ہو جائے گا تو خدا کے مقرب بندے، بالخصوص حضرات انبیاء کرامؑ اور ان میں سے بھی خصوصیت کے ساتھ نبی اکرمؐ خدا کے حضور ان مجرمین کی سفارش کریں گے اور ان کی سفارش پر اللہ تعالیٰ انہیں بخش دے گا اور وہ جنت میں چلے جائیں گے۔ اسے شفاعت

کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ شفاعت کا یہ عقیدہ دین کی ساری عمارت منہدم کر دیتا ہے جس کی بنیاد قانونِ مکافاتِ عمل پر ہے۔ فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ وَ مَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ (۹۹/۸-۷) ہر عمل کا ذرہ ذرہ نتیجہ خیز ہوتا ہے اور سامنے آ جاتا ہے۔ نظر آتا ہے کہ شفاعت کا یہ عقیدہ ہمارے دور ملکیت کی پیداوار ہے جب مستبد حکمرانوں کے مقربین ان کے پاس لوگوں کی سفارش کیا کرتے تھے اور ان کی سفارش پر مجرمین کو معافی مل جایا کرتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس عقیدہ کو عیسائیوں کے کفارہ کے عقیدہ نے بھی تقویت دی۔ وہ جب کہتے ہوں گے کہ ہمارے رسول (حضرت عیسیٰ) کو دیکھو کہ جو شخص ان پر ایمان لے آتا ہے وہ اس کے گناہوں کا کفارہ دے کر اسے جہنم سے بچا لیتے ہیں۔ اس کے برعکس تمہارا رسول گنہگاروں کے لئے کچھ بھی نہیں کر سکتا، تو اس اعتراض کے پیش نظر اس قسم کی روایات وجود میں آ گئیں کہ قیامت میں جب حساب کتاب ہو چکے گا اور مجرمین دوزخ میں بھیج دیئے جائیں گے تو نبی اکرمؐ سجدے میں گر جائیں گے اور جب تک اللہ تعالیٰ آپؐ کی امت کے تمام افراد کو دوزخ سے نکال کر جنت میں نہیں بھیج دے گا حضورؐ نہ سجدے سے سہراٹھائیں گے نہ خود جنت میں جائیں گے۔ اس سے عیسائیوں کے اعتراض کا جواب وضع کر لیا گیا لیکن دین کی ساری عمارت بنیاد سے ہل گئی اور قوم تباہیوں کے جہنم میں جا گری۔ قرآن کریم سے اس قسم کی شفاعت کی کوئی سند نہیں ملتی (نہ ہی اس میں اس قسم کے عقیدہ کی گنجائش ہو سکتی تھی)۔ اس میں صاف الفاظ میں کہا گیا ہے کہ قانوںِ مکافاتِ کی رو سے لَا يَجْزِي نَفْسٌ عَنْ نَفْسٍ شَيْئًا وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ (۲/۲۸) کوئی شخص کسی دوسرے شخص کے کسی کام نہیں آسکے گا نہ ہی کسی کی شفاعت (سفارش) قبول کی جاسکے گی نہ ہی کسی سے اس کے گناہوں کا معاوضہ لے کر اسے چھوڑ دیا جائے گا اور نہ ہی مجرمین کی کوئی مدد کر سکے گا۔

شفاعت کے عقیدہ کی تائید میں قرآن کریم کی اس قسم کی آیات پیش کر دی جاتی ہیں جن میں (مثلاً) آیا ہے۔ مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ (۲/۲۵۵) ”وہ کون ہے جو اس کے پاس اس کے اذن کے بغیر شفاعت کرے“ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ خدا کی اجازت سے شفاعت کی جاسکتی ہے اور حضورؐ اپنی امت کی شفاعت خدا کی اجازت ہی سے کریں گے۔

لیکن ان آیات سے اس قسم کا نتیجہ نکالنا غلط ہے۔ سب سے پہلے تو اس لئے کہ اس قسم کی

شفاعت کا عقیدہ قانونِ مکافات کے یکسر خلاف ہے جو قرآن کریم میں شروع سے آخر تک مسلسل بیان ہو رہا ہے۔ لہذا اگر قانونِ مکافات کے ساتھ شفاعت کا عقیدہ بھی اسی قرآن کریم میں موجود ہو تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ قرآن کریم میں (معاذ اللہ) متضاد عقائد دیئے گئے ہیں، مثلاً اسی آیت کو دیکھئے جسے اوپر درج کیا گیا ہے۔ اس سے پہلی آیت یہ ہے: ”اے ایمان والو! جو کچھ تمہیں اللہ نے دیا ہے اسے ربوبیتِ عامہ کے لئے کھلا رکھو قبل اس کے کہ وہ وقت آجائے لَا بَیْعُ فِیْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَلَا شُفَاعَةٌ“ (۲/۲۵۳) جس میں نہ گناہوں کی قیمت ادا کر کے جنت خریدی جاسکے گی نہ کسی بزرگ کی دوستی کسی کے کام آئے گی اور نہ ہی کسی کی شفاعت۔ اس کے بعد اگلی آیت میں ہے مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَکَ اِلَّا بِاِذْنِہٖ“ (۲/۲۵۵)۔ اس کا مطلب اگر یہ لیا جائے کہ خدا کی اجازت سے سفارش کی جاسکے گی اور یہ سفارش قبول بھی ہو جائے گی تو ان دونوں آیات میں کھلا ہوا تضاد پایا جائے گا۔

اب سوال یہ ہے کہ اس (دوسری) آیت کا صحیح مطلب کیا ہے؟ قانونِ مکافات کی رُسے انسان کے ہر عمل کا نتیجہ ساتھ کے ساتھ مرتب ہوتا رہتا ہے۔ لیکن قرآن کریم نے جزا و سزا کی مجرود حقیقت کو سمجھانے کے لئے ایسا نقشہ کھینچا ہے جسے ملزموں کی عدالت میں پیشی ہوتی ہے اور مقدمہ کی سماعت کے بعد حکم سنایا جاتا ہے۔ مقدمہ میں حاکم کے علاوہ ملزم ہوتا ہے۔ مستغیث ہوتا ہے۔ گواہ ہوتے ہیں۔ پولیس کے سپاہی ہوتے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ قرآن کریم نے اسی قسم کے استعاذوں میں حقیقت کو بیان کیا ہے۔ مثلاً ایک جگہ ہے کہ جس شخص کا احتساب ہو رہا ہو گا وہ عدالت کے کٹہرے میں اکیلا کھڑا ہو گا۔ وَ لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰی..... وَ مَا نَرٰی مَعَكُمْ شُفَعَاۤءَکُمْ..... (۶/۹۵) تم ہمارے حضور تنہا پیش ہو گے..... تمہارے ساتھ کھڑا ہونے والا کوئی نہیں ہو گا اور پولیس کا سپاہی تمہیں پیچھے سے ہانکتا ہوا ہمارے سامنے آئے گا۔ وَ جَاۤءَتْ کُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَآءٍۭ وَ نَحْسٌ (۵۰/۲۱) ہر شخص کے ساتھ ایک پیچھے سے ہانکنے والا ہو گا۔ اس کے علاوہ گواہ بھی ہوں گے..... وَ شَہِیْدٌ (۵۰/۲۱)۔ یہ گواہ خود بخود اس شخص کے ساتھ کھڑے نہیں ہو جائیں گے۔ ان میں سے جسے بلایا جائے گا وہ آجائے گا اور اسے گواہی دینے کی اجازت دی جائے گی۔ یہ ہیں وہ شَفِیْعُ (ساتھ کھڑے ہونے والے) جن کا ذکر قرآن کریم کی اس قسم کی آیات میں آیا ہے جن میں کہا گیا ہے کہ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ

عِنْدَكَ إِلَّا بِإِذْنِهِ" (۲/۲۵۵) "وہ کون ہے جو خدا کی اجازت کے بغیر اس کے حضور کسی کے ساتھ کھڑا ہو سکے؟" یہ گواہ رسول بھی ہوں گے جن کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے: يَوْمَ يَجْمَعُ اللَّهُ الرُّسُلَ فَيَقُولُ مَا ذَا أُجِبْتُمْ؟ (۵/۱۰۹) جس دن اللہ رسولوں کو جمع کرے گا اور ان سے پوچھے گا کہ تمہاری دعوت کا جواب کس طرح دیا گیا تھا؟ اور رسولوں کے علاوہ (ملائکہ) کا سناتی قوتیں بھی اسی طرح بلانی جائیں گی: يَوْمَ يَقُومُ الزُّوْجُ وَالْمَلَائِكَةُ صَفًّا لَا يَتَكَلَّمُونَ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمَنُ وَقَالَ صَوَابًا (۷۸/۳۸) جس دن "الزُّوْجُ اور مَلَائِكَةُ" صف باندھے کھڑے ہوں گے اور کوئی بات نہ کر سکیں گے سوائے اس کے جسے رحمان اجازت دے اور وہ درست بات کہے: "لِذَا" ان آیات میں شفاعت کے معنی شہادت کے ہیں۔ اس لئے کہ کسی کے حق میں سچی شہادت دے دینا بھی اس کی بہت بڑی مدد ہوتی ہے۔ اس کی وضاحت خود قرآن کریم نے کر دی ہے جہاں فرمایا: وَلَا يُمْلِكُ الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ الشَّفَاعَةَ إِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ (۲۳/۸۶) جنہیں یہ لوگ خدا کے سوا پکارتے ہیں وہ شفاعت کا کوئی اختیار نہیں رکھتے۔ اس کا اختیار وہ رکھتا ہے جو حق کے ساتھ شہادت دیتا ہے۔ یعنی شفاعت کے معنی شہادت ہیں۔ اسی التباس کے رفع کرنے کے لئے رسول اللہ کو شہید کیا گیا ہے (۱۶/۸۹) شَفِيعٌ کہیں نہیں کہا۔ اور دوسرے مذاہب کے لوگ جو شفاعت کا عقیدہ رکھتے ہیں ان کے متعلق اکثر مقامات پر کہہ دیا کہ فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشَّافِعِينَ (۷۴/۲۸) انہیں ان کے سفارشچیوں کی سفارش کچھ کام نہیں دے سکتی۔ اس لئے کہ خدا کا قانون یہ ہے کہ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَى (۶/۱۶۵) کوئی شخص کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔ جنت فقط اعمال کے بدلے ملتی ہے۔ تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِي نُتَمَوُّهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ (۷/۴۳) سفارشوں سے جنت حاصل کرنے کا عقیدہ اس قوم میں پیدا ہوتا ہے جو قوتِ عمل سے محروم ہو جاتی ہے۔ قرآن کریم نے بتایا ہے کہ اس قسم کا عقیدہ یہودیوں میں اس زمانے میں پیدا ہوا تھا جب وہ اپنی پستیوں کی انتہا تک پہنچ چکے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ ہم بجز چند دنوں کے کبھی جہنم میں نہیں رہیں گے (۲/۸۰) اس پر قرآن کریم نے کہا کہ ان سے پوچھو کہ کیا تم نے اللہ سے اس قسم کا کوئی عہد لے رکھا ہے؟ اور پھر خود ہی کہہ دیا کہ ان سے کہہ دو کہ یہ سب عقائد غلط ہیں۔ خدا کا قانون یہ ہے کہ جو بھی غلط روش اختیار کرے گا وہ تباہ و برباد ہوگا اور جو ایمان کے ساتھ عمل صالح کرے گا وہ جنت

کا وارث ہوگا (۸۱ - ۸۲/۲)۔

ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ

(۱) اس دنیا میں شفاعت کے معنی ہوں گے کسی کام میں کسی کی مدد کے لئے اس کے ساتھ ہو جانا۔ اگر وہ اچھا کام ہے تو اس ساتھ ہونے والے کو بھی اس کا اچھا اجر ملے گا۔ اگر وہ کام بُرا ہے تو یہ بھی مجرم کے ساتھ سزا کا کچھ حصہ پائے گا۔

(۲) آخرت میں شفاعت کا تصور اس قسم کا ہے جیسے کوئی گواہ کسی کے حق میں سچی شہادت دینے کے لئے کھڑا ہو جائے۔ یہ تمثیلی بیان ہے۔

(۳) بحرموں کا کسی کی سفارش سے چھوٹ جانا یا کسی کی سفارش سے کسی کو وہ کچھ مل جانا جس کا وہ حقدار نہیں، قرآن کریم کی بنیادی تعلیم کے خلاف ہے، اس لئے شفاعت کا یہ مفہوم صحیح نہیں۔ قرآن کریم میں جہاں جہاں یہ لفظ آئے، سیاق و سباق سے دیکھ لینا چاہیے کہ وہاں کونسا مفہوم متصور ہے۔

یہ ہے اس لفظ کا صحیح قرآنی مفہوم۔ اس سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم نے ”سفارش“ کے عقیدہ کی بڑی شدت سے مخالفت کی ہے لیکن ”شفاعت“ کے لفظ کو تعاون یا شہادت کے معنوں میں اور لفظ شفیع کو ساتھی یا مددگار کے مفہوم میں استعمال کر کے، اس کی اجازت بھی دی ہے اور تائید بھی کی ہے۔ یہ بات اس سے بھی واضح ہو جاتی ہے کہ کئی ایک مقامات پر خود خدا نے اپنے آپ کو ”شفیع“ کہا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ اگر اس کے معنی ”سفارش کرنے والا“ لئے جائیں تو بات کچھ نہیں بنے گی۔ خدا تو حاکم یا فیصلہ کرنے والا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ کوئی حاکم خود ہی سفارش کرنے والا نہیں ہو سکتا۔ لہذا، اس کے معنی ساتھی یا مددگار کے ہیں۔ مثلاً سورۃ النعام میں ہے: لَيْسَ لَهُمْ مَن دُونِهِ وَلِيٌّ وَ لَا شَفِيعٌ (۵۱/۶) خدا کے سوا ان کا کوئی سرپرست اور ساتھی نہیں (۴۰/۴۳-۳۲)۔ سورۃ زمر میں پہلے کہا۔

أَمِ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ شُفَعَاءَ ۖ قُلْ أَدُلُّكُمْ عَلَىٰ مَلَكُوتٍ لَّا يَعْلَمُونَ
شَيْئًا ۚ لَّا يَعْلَمُونَ (۳۱/۳۹)

کیا یہ لوگ اللہ کے سوا اوروں کو اپنا ”شفیع“ بناتے ہیں۔ ان سے پوچھو کہ خواہ وہ کسی بات کا اختیار نہ رکھتے ہوں اور نہ ہی عقل و فکر سے کام لینا جانتے ہوں، تو کیا تم پھر بھی

انہی کو اپنا "شفیع" بناؤ گے۔

اس کے بعد ہے۔ قُلْ لِلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيعًا ۝ (۳۹/۲۴) ان سے کہو، شفاعت تمام تر (ساری کی ساری) صرف خدا کے لئے ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہاں "شفاعت" کے معنی کسی کی مدد کرنا یا ساتھ دینا ہے اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو تائید و حمایت صرف قوانین خداوندی کے ساتھ ہم آہنگی سے حاصل ہو سکتی ہے۔ ان قوانین کے خلاف کوئی کسی کی مدد نہیں کر سکتا۔ یہی مفہوم ان مقامات میں ہے جہاں کہا گیا ہے کہ "خدا کے اذن" کے سوا کسی کی شفاعت کام نہیں دے سکتی۔ یعنی اگر کوئی شخص کسی کے ساتھ قوانین خداوندی کے مطابق کھڑا ہوتا ہے تو اس کا اس طرح اس کے ساتھ کھڑا ہونا اسے فائدہ دے سکتا ہے۔ ورنہ نہیں۔ مَا مِنْ شَفِيعٍ إِلَّا مِنْ بَعْدِ اِذْنِهٖ ۝ (۱۰/۳) سورہ مریم میں ہے۔ لَا يَمْلِكُوْنَ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنْ اِتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ۝ (۱۹/۸۷) ان کے سوا جہوں نے خدا سے عہد باندھ رکھا ہو، کوئی کسی کی تائید و حمایت کا حق نہیں رکھتا۔ دوسری جگہ ہے۔

يَوْمَئِذٍ لَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنْ اِذْنُ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَرَضٰى لَهُ
قَوْلًا ۝ (۱۲/۱۰۹)

اس دن کسی کی شہادت کسی کو فائدہ نہیں پہنچا سکے گی۔ بجز اس کے کہ جسے خدا کا اذن

حاصل ہو اور وہ ایسی بات کہے جو خدا کی بات سے ہم آہنگ ہو (۳۳/۲۳؛ ۲۱/۲۸)۔

"خدا کی بات سے ہم آہنگی" کے معنی ہی یہ ہیں کہ وہ شہادت قانون خداوندی کے مطابق ہو۔

دو ایک مقامات میں 'ملائکہ کی' "شفاعت" کا بھی ذکر ہے۔ ملائکہ وہ فطرت کی قوتیں ہیں جن سے

نظام کائنات چل رہا ہے۔ فطرت کی یہ قوتیں آدم (انسان) کے سامنے سجدہ ریز ہو سکتی ہیں۔

یعنی انسان انہیں سحر کر سکتا ہے۔ اب اگر انسان ان قوتوں کا استعمال قوانین خداوندی کے

مطابق کرے گا تو یہ اس کا ساتھ دیں گی، اس کی مدد کریں گی۔ اگر یہ ان قوانین کی خلاف ورزی

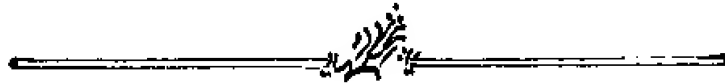
لے اذن کے عام معنی تو حکم یا اجازت کے ہوتے ہیں لیکن جب یہ لفظ خدا کی طرف منسوب ہو تو اس سے مراد

قوانین خداوندی ہوتا ہے۔ اس لئے کہ خدا نے کہا ہے کہ اس کے احکام میں تبدیلی نہیں ہوتی۔ سو جس حکم میں

کبھی تبدیلی نہ ہو وہ قانون بن جاتا ہے۔

کرے گا تو یہ اس کا ساتھ چھوڑ دیں گی۔ یہ مقصد ہے ”ملائکہ کی شفاعت“ سے جو ”اذنِ خداوندی“ کے بعد کی جائے (۵۳/۲۶)۔

یہ ہے شُرآنِ کریم کی رُو سے ”شفاعت“ کا صحیح مفہوم۔ اس سے مقصد یہ نہیں کہ مجرم کسی کی سفارش سے چھوٹ پائیں گے۔ جو شخص آگ میں انگلی ڈال کر اسے جلانے کسی بڑے سے بڑے ذی اثر کی سفارش بھی اس کے درد میں کمی نہیں کر سکتی۔ یہ خدا کا اٹل قانون ہے۔ اس کی مدد (شفاعت) وہی کر سکے گا جو خدا کے قانون کے مطابق اس کا علاج کرے۔



اٹھارواں باب

اُخروی عذاب کا تعارف

اُخروی عذاب کے سلسلہ میں ہمیں اب براہ راست جہنم کے موضوع کی طرف آجانا چاہیے تھا کہ اس سے اس کا پورا تصور سامنے آسکتا ہے، لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اس (عذاب) کے لئے قرآن کریم میں جو مختلف الفاظ آئے ہیں پہلے ان کا اجمالی ذکر کر دیا جائے۔

لفظ عذاب کے مادہ (ع۔ ذ۔ ب) کے بنیادی معنی ہیں۔ (۱) وہ اذیت اور تکلیف جو زندگی کے آرام میں خلل انداز ہو اور (۲) رکاوٹ جو کسی کے راستے میں حائل ہو۔ بنیادی عذاب میں ہر قسم کی تباہی اور بربادی، جسمانی تکلیف اور ذہنی اور قلبی اذیت سب شامل ہیں۔ لیکن اُخروی عذاب کی نوعیت کیا ہوگی اسے ہم اپنے شعور کی موجودہ سطح پر سمجھ نہیں سکتے، کیونکہ اس وقت ہم اس کا بھی ادراک نہیں کر سکتے کہ خود اس زندگی کی نوعیت، اُگتہ اور کیفیت کیا ہوگی۔ قرآن کریم سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ وہاں احساس بڑا شدید ہو جائے گا اس لئے اپنی ناکامیوں اور نادرادیوں کی شدت احساس سے جس قسم کی اذیت ہو سکتی ہے اس کا کچھ اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ لفظ "عذاب" کا دوسرا مفہوم — یعنی زندگی کے راستے میں ناقابلِ تسخیر کاؤں میں اس کی کچھ وضاحت کرتا ہے۔ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، زندگی کی موجودہ سطح میں مقصدِ حیات انسانی ذات کی نشوونما ہے جس فرد کی ذات اس قدر نشوونما پا چکی ہوگی کہ وہ زندگی کی اس منزل سے اگلی منزل طے کرنے کے قابل ہو جائے، وہ آگے چلا جائے گا۔ اسے جنت کی زندگی سے تعبیر کیا گیا ہے جس کی ذات میں اس قدر صلاحیت پیدا نہیں ہوگی، وہ آگے نہیں بڑھ سکے گا، روک دیا جائیگا۔

یہ ہے وہ ناکامی جس کی شدت احساس کا نام عذاب ہے۔ عَذُوبٌ یَا عَذِیْبُ اس آدمی یا اونٹ یا گھوڑے کو کہتے ہیں جو پیاس کی شدت کی وجہ سے کھانا پینا چھوڑ دے۔ اس میں آپ نے اس لطیف نکتہ کو بھی دیکھ لیا کہ یہ محرومی کہیں خارج سے عائد نہیں ہوتی۔ یہ انسان کی داخلی کیفیت کا فطری نتیجہ ہوتی ہے۔ اس سے واضح ہے کہ قرآن کریم میں آخری عذاب کے لئے الفاظ تو اس محسوس دنیا سے متعلق استعمال کئے گئے ہیں۔ (کیونکہ انہی سے بات سمجھائی جاسکتی تھی) لیکن اس سے مقصود انسان کی داخلی اضطراب انگیز کیفیت کا اظہار ہے۔ (جیسا کہ کہا جا چکا ہے) یہ کیفیت انسان کی ترقی کے رک جانے کے احساس کی پیدا کردہ ہوگی۔ اس بنا پر اسے عذاب الجحیم سے تعبیر کیا گیا ہے۔

عَذَابُ الْجَحِیْمِ

جَحِیْمُ جہنم ہی کا دوسرا نام ہے۔ اَجْحَمَ عَنْهُ کے معنی ہیں وہ اس سے رک گیا۔ زندگی کی ارتقائی منازل طے کرنے کے راستے میں روک ہے جسے عَذَابُ الْجَحِیْمِ کہا گیا ہے۔ یہ عذاب زندگی میں آگے بڑھنے سے رک جانے کی اضطراب انگیز کیفیت کا نام ہے۔ اہل جنت کے متعلق کہا گیا ہے کہ ان کی پیشانیوں کا نور ان کے راستوں کو روشن کئے چلا جائے گا اور یوں وہ آگے بڑھتے جائیں گے اور اس کا (آگے بڑھنے کا) سلسلہ غیر منقطع ہوگا۔ اِسْ لَیْ لَا یَذُوقُوْنَ فِیْہَا الْمَوْتَ اِلَّا الْمَوْتَ الْاُولٰی وَ قَدْ هُمُ عَذَابُ الْجَحِیْمِ ۝ (۴۴/۵۶) اُس موت کے بعد جو انہیں دنیا کی زندگی میں لگتی پھر ان پر موت وارد نہیں ہوگی اور انہیں اس عذاب سے محفوظ رکھا جائے گا جو آگے بڑھنے کے راستے بند ہو جانے سے قلب انسانی کو وقفِ اضطراب کر دیتا ہے۔ (نیز ۴۰/۱۸؛ ۵۲/۱۸)۔ ان کے برعکس "اہل جہنم" کے متعلق ہے۔ اِنَّ لَدٰیْنَا اَلْکَلٰٓءَ وَ جَحِیْمًا (۴۳/۱۲) ان کے لئے ہمارے ہاں بڑی بڑی بیڑیاں ہیں۔ یعنی جَحِیْمُ اَلْکَلٰٓءِ نے تجھ کا مفہوم واضح کر دیا۔ یعنی ایسی روک جو انسان کو چلنے نہ دے۔ یہ رکاوٹیں کہیں خارج سے نہیں آئیں گی۔ یہ تو اس وقت بھی قدم قدم پر انسان کے دامن گیر ہو رہی ہیں لیکن اس وقت اسے ان کا احساس نہیں ہوتا۔ اُس وقت وہ نمودار ہو کر سامنے آجائیں گی۔ وَ بُرِّئَتْ الْجَحِیْمُ لِمَنْ یَّتَرٰی (۴۹/۳۶؛ ۲۶/۹۱) دیکھنے والے کے لئے جَحِیْمُ ابھار کر سامنے لے آئی جائے گی۔ اب وہ مستتر ہے۔ اُس وقت بارز ہو جائے گی۔

عَذَابُ مُّهِينٍ

آگے بڑھ جانے والوں کے مقابلہ میں پیچھے رہ جانے والوں کو جو احساس کمتری ہوگا اس جہت سے اس کیفیت کو ”عَذَابُ مُّهِينٍ“ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی ذلت آمیز عذاب (۴/۱۴) یا عَذَابُ الْهُونِ (۹۴/۱۶)۔ اس کی وجہ یہ بتائی گئی کہ مِمَّا كُنْتُمْ تُسْتَكْبِرُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ (۴۶/۲۰)۔ یعنی یہ لوگ دنیا میں نوع انسانی کے لئے کوئی نفع بخش اور تعمیری کام کئے بغیر بڑا بننا چاہتے تھے۔ اب یہ حقیقت کھلی کہ جھوٹی بڑائی، نقاب اٹھ جانے کے بعد ذلت و کمتری کا موجب بننا کرتی ہے۔ ملمع کو ایک تاؤ دیا جائے تو اصلیت ظاہر ہو جاتی ہے اور اس سے جو احساس ذلت پیدا ہوتا ہے وہ بالکل واضح ہے۔ یہی عذاب مہین یا عذاب الہون ہے۔ اسی کو تبدیلیِ جلوہ اکھال اور چیر کر صحیح شخصیت کے سامنے آ جانے سے بھی تعبیر کیا گیا ہے (۴/۵۶)۔

عَذَابُ يَوْمٍ عَقِيمٍ

”عقیم“ کے معنی بانجھ بن یا بے اولاد رہ جانا ہی نہیں۔ انسان کی کوئی کوشش جب ثمر بار نہ ہو تو اسے بھی عقیم کہتے ہیں۔ نیز (۳۱) کے معنی بند کرنا۔ روکنا یا قطع کرنا بھی ہیں۔ اس لئے اس اصطلاح کا اطلاق انسان کی انتہائی ناکامی اور نامرادی پر ہوگا۔ اسے عَذَابُ يَوْمٍ عَقِيمٍ سے تعبیر کیا گیا ہے (۲۲/۵۵)۔

تقابل

سورہ رعد میں ہے۔

لَهُمْ عَذَابٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَ لَعَذَابُ الْآخِرَةِ أَشَقُّ ۚ وَمَا لَهُمْ مِّنْ اللَّهِ مِنْ دَاقٍ ۝ (۱۳/۳۳)

ان کے لئے دنیاوی زندگی میں بھی عذاب ہے اور آخرت کا عذاب اس سے کہیں زیادہ

شاق گزرنے والا ہے اور انہیں خدا کے اس عذاب سے بچانے والا کوئی نہیں ہو سکتا۔

اس سے ظاہر ہے کہ دنیاوی زندگی میں کتنی ہی بڑی اذیت اور پریشانی کیوں نہ ہو، وہ اُخروی زندگی

کی اذیت کے مقابلہ میں بہر حال کمتر ہے۔ وہاں احساسات کی شدت یہاں کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہوگی۔

عَذَابٌ عَظِيمٌ

اسی جہت سے وہاں کے عذاب کو عَذَابٌ عَظِيمٌ کہا گیا ہے۔ سورہ بقرہ میں ہے لَٰهُمَّ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ ۖ وَ لَٰهُمَّ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝ (۲/۱۱۳) ان کے لئے دنیاوی زندگی میں ذلت و رسوائی ہوگی اور آخرت کا عذاب عظیم ہوگا۔ یعنی یہاں کی ذلت و رسوائی اس کے مقابلہ میں کچھ شے نہیں ہوگی۔ (نیز ۲۲/۲۳ : ۵/۲۱ : ۵/۲۲)۔ یہ ”عذاب عظیم“ کس جرم کی پاداش میں ہوگا۔ سورہ آل عمران میں اس کے متعلق کہا گیا۔

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ
وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ (۳/۱۰۳)

(مسلمانو! دیکھنا) تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے خدا کی طرف سے واضح تعلیم آجانے کے بعد باہمی اختلاف کیا اور فرقہ پیدا کر لئے۔ ان لوگوں کے لئے عذاب عظیم ہوگا۔

بعض مقامات پر اسے عذاب یوم عظیم بھی کہا گیا ہے (۵۱/۱۶ : ۱۵/۱۱ : ۱۳/۳۹)۔ ان ہر سہ مقامات میں نبی اکرمؐ نے فرمایا ہے کہ اگر میں بھی قوانین خداوندی کی خلاف ورزی کروں گا تو ”عذاب یوم عظیم“ سے محفوظ نہیں رہ سکوں گا۔

کہیں اسے عذاب یوم القیمۃ کہا گیا ہے (۲۶/۳۹ : ۲۲/۳۹ : ۵/۲۶)۔

عَذَابٌ مُّقِيمٌ

آخری زندگی کا عذاب وقتی اور منگامی نہیں ہوگا۔ اس کی تفصیل جہنم کے عنوان میں ملے گی۔ آگے بڑھنے والے آگے بڑھتے جائیں گے اور رک جانے والے رُکے رہیں گے۔ اس لئے ان کا یہ احساس مستقل ہوگا۔ اس لئے اسے عذاب مُّقِيمٌ کہا گیا ہے۔ سورہ اندہ میں ہے۔

يُرِيدُونَ أَن يُخْرِجُوكَ مِنَ النَّارِ ۖ وَمَا هُمْ بِمُخْرِجِينَ مِنْهَا ۖ وَلَهُمْ

عَذَابٌ مُّقْتَضٍ ۝ (۵/۲۷)؛ (۹/۶۸)؛ (۳۲/۴۵)۔

وہ (لاکھ) چاہیں گے کہ کسی طرح اس نار (آگ) کے عذاب سے باہر نکل جائیں۔ لیکن وہ اس سے نکل نہیں سکیں گے۔ وہ عذاب قائم رہنے والا ہوگا۔

اسے عذاب خلد (۳۲/۱۴) بھی کہا گیا ہے۔ یعنی ہمیشہ رہنے والا عذاب۔ (خلود جہنم و جنت کے متعلق اپنے مقام پر تشریح کی جائے گی)۔ اس عذاب میں تخفیف نہیں ہوگی (۳۰/۴۹)؛ (۳۵/۳۶)۔ بلکہ جوں جوں احساس تیز ہوتا جائے گا، عذاب کی شدت بڑھتی جائے گی (۷۸/۳۰)۔

عَذَابُ النَّارِ

مکمل تباہی کے لئے عام طور پر آگ کی مثال لائی جاتی ہے جو ہر شے کو جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیتی ہے۔ چونکہ غلط روش پر چلنے والوں کی متاعِ حیات (آخرت میں) مجلس کرتباہ ہو جاتی ہے، اس لئے قرآن کریم نے جہنم کو آگ (نار) سے تشبیہ دی ہے اور اس کی تمام تفصیلات اسی تشبیہ کے محور کے گرد گھومتی ہیں جہنم کی آگ اس دنیا کی طبعی آگ نہیں۔ وہ آگ وہ ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ نَارُ اللَّهِ الْمُوقَدَةُ الَّتِي تَطْلُعُ عَلَى الْأُفُقِ الْأَوْسَطِ ۖ لَا يَمَسُّهَا الْفَنَاءُ ۚ وَنُورُهَا سَيِّدُ الْبُحْرِ ۖ (۱۰۴/۴)۔ اللہ کی بھڑکائی ہوئی آگ جس کے شعلے دلوں کو لپیٹ لیتے ہیں۔ سو جہنم کی آگ دلوں کو اپنی لپیٹ میں لیتی ہے۔ وہ طبعی آگ نہیں۔ یہ مراد ہے عَذَابُ النَّارِ سے۔ یہی وہ عذاب ہے جس سے محفوظ رہنے کی، مومنین آرزو میں کرتے ہیں۔ وَرَقْنَا عَذَابَ النَّارِ (۲/۲۱)؛ (۳/۱۵)۔ عَذَابُ النَّارِ کا نتیجہ ذلت و رسوائی ہوتا ہے۔ رَبَّنَا إِنَّكَ مَنْ تَدْخُلِ النَّارَ فَقَدْ أَخْزَيْتَهُ (۳/۱۹)۔ جو آگ میں داخل کیا جاتا ہے وہ ذلیل و رسوا ہو جاتا ہے۔ اس سے بھی واضح ہو گیا کہ عَذَابُ النَّارِ سے مفہوم کیا ہے۔ وہ آگ نہیں جو چولہوں میں جلائی جاتی ہے۔ یہ شرفِ انسانیت سے محرومی کی آتش سوزاں ہے۔ یہ فاسقین کا مقام ہے (۱۹-۲۰/۳۲) اور مفہوم اس سے ہلاکت ہے (۳۵/۳۶)۔

تپش و سوز

نار (آگ) کی نسبت سے عذابِ جہنم کی مختلف کیفیات کو ایسے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے جن میں تپش و سوز اور شدید حرارت کا پہلو نمایاں ہو۔ (مثلاً) کئی ایک مقامات پر اسے عذابِ حریق سے

تعبیر کیا گیا ہے۔ بنیادی طور پر یہ اس حرارت کو کہتے ہیں جو لوہے کو ریتی سے رگڑنے سے پیدا ہوتی ہے۔ اسی کو سوبانِ روح کہتے ہیں۔ یہی اس عذاب کا صحیح مفہوم ہے۔ سورۃ انفال میں ہے کہ بحرین کو ملائکہ طمانچہ ماریں گے اور کہیں گے کہ وَ ذُوقُوا عَذَابَ الْحَرِيقِ (۸/۵۰) سوز و پیش پیدا کرنے والے عذاب کا مزہ چکھو۔ یعنی لَذِی الدُّنْيَا خِزْيٌ وَ نَذِيقُهُ يَوْمَ الْقِيَمَةِ عَذَابَ الْحَرِيقِ (۲۹/۱۵) ان کے لئے دنیاوی زندگی میں ذلت و رسوائی ہوگی اور قیامت کے دن عذابِ حریق۔ یہ عذاب حریق کس کیفیت کا نام ہے اسے چند آیات آگے چل کر ان الفاظ میں بیان کیا گیا کہ کَلَّمَآ اَرَادُوْا اَنْ يَخْرُجُوْا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ اُعِيْدُوْا فِيْهَا قَا وَ ذُوقُوا عَذَابَ الْحَرِيقِ (۲۲/۲۲) جب بھی وہ اس سے باہر نکلنے کا ارادہ کریں گے کہ ان کا غم دُور ہوا انہیں اس میں پھر سے دھکیل دیا جائے گا اور کہا جائے گا کہ عَذَابَ الْحَرِيقِ کا مزہ چکھو۔ "مِنْ غَمٍّ" نے بات واضح کر دی۔ سورۃ بروج میں عَذَابُ الْجَحِيْمِ اور عَذَابُ الْجَحِيْمِ کو مرادف بتایا گیا ہے (۸۵/۱۰)۔

شدتِ حرارت کی جہت کے ایک مقام پر اسے عَذَابُ الْجَحِيْمِ بھی کہا گیا ہے (۵۲/۲۴)۔ اس کے لغوی معنی ہوتے ہیں وہ گرم تیز ہوا (لُ) جو جسم کے اندر گھس کر زہر کا اثر پیدا کرے صحراؤں میں بادِ موم کی پیداکردہ تباہ کاریاں بڑی دہشت انگیز ہوتی ہیں۔

عَذَابُ الْجَحِيْمِ

اسی نسبت سے بعض آیات میں عذابِ جہنم کے سلسلہ میں کہا گیا ہے کہ وہاں پینے کے لئے گرم کھولتا ہوا مشروب ملے گا۔ لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ وَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (۷/۴۰) گرم کھولتا ہوا مشروب۔ یعنی الم انگیز عذاب۔ (نیز ۱۰/۴)۔ سورۃ دخان میں ہے کہ کھولتا ہوا گرم پانی اس کے سر پر لٹھایا جائے گا اور کہا جائے گا کہ ذُقْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْكَرِيْمُ (۲۲/۲۹) اس کا مزہ چکھ۔ تو دنیا میں اپنے آپ کو بہت بڑی قوت اور عزت کا مالک سمجھا کرتا تھا۔ جھوٹی عزت کا انجام ذلت آمیز تباہی ہوتا ہے۔

عَذَابُ اَلِيْمٌ

کرب و اذیت کی ان تمام کیفیات کو کہ ان کریم نے ایک لفظ میں سمٹا کر رکھ دیا ہے جہاں اس

عذاب کو الیم کہہ کر پکارا گیا ہے۔ اَلَمْ اس تکلیف کو کہتے ہیں جو اپنی درد انگیزی میں انتہائی شدت تک پہنچی ہو۔ اس سے عذاب الیم کا تصور سامنے آسکتا ہے۔ یہ المناک کیفیت کس کس قسم کی محرومیوں کا نتیجہ ہوگی۔ اس کے متعلق کہا کہ یہ وہ لوگ ہیں۔ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ۔ ان کے لئے حیاتِ آخری میں کوئی حصہ نہیں ہوگا۔ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ۔ خدا ان سے بات نہیں کرے گا۔ وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ۔ ان کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا۔ وَلَا يُزَكِّيهِمْ۔ یہ سامانِ نشوونما سے محروم رہیں گے۔ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيمٌ ۝ (۳/۷۹)۔ یعنی انہیں نہایت الم انگیز عذاب ہوگا۔ یہ اس الم انگیز کیفیت کا نام ہے جس میں منافق مبتلا ہوتا ہے (۲/۱۰) یا وہ لوگ جنہیں اپنی غلط روش کا احساس زیادہ اس وقت پیدا ہو جب اس کی تلافی کی کوئی صورت باقی نہ رہے۔ ایسے شخص کی المناک قلبی کیفیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے (۴/۱۸)؛ (۵/۳۶)؛ (۱۰/۴۴)۔

عَذَابٌ شَدِيدٌ

درد ہو اس قدر الم انگیز اور پھر اس کی شدت میں اضافہ ہوتا چلا جائے! اسی جہت سے اس اضطرابی کیفیت کو عَذَابٌ الشَّدِيدُ سے تعبیر کیا گیا ہے (۱۱/۷۰)؛ (۳۵/۴)۔ یہ شرک کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے۔ یعنی قوانینِ خداوندی کے ساتھ اپنے یا دیگر انسانوں کے خود ساختہ قوانین کی اطاعت کا (۵۰/۲۶) یا ان کمرے جو مقصودِ حیات، فقط دنیاوی مفادِ عاجلہ سمجھیں اور مستقل اقدارِ خداوندی کو درخورِ اعتنا قرار نہ دیں (۵۴/۲۰)۔ جہنم کے عذاب کی شدت کا اندازہ اس کیفیت سے لگائیے جسے ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ وَيَاٰتِيهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَ مَا هُوَ بِمَحِيَّتٍ (۱۴/۱۷) وہاں اسے ہر طرف سے موت آتی دکھائی دے گی لیکن وہ مرے گا نہیں اور اس کے بعد ہے۔ وَ مِنْ ذٰلِكَ عَذَابٌ غَلِيظٌ (۱۴/۱۷) اس کے علاوہ ایسا عذاب جس میں تمام اذیتیں مرکب ہو کر سخت ہو گئی ہوں۔ اسی جہت سے جہنم کے داروغوں کو غَلَاظٌ مِشْدَادٌ کہا گیا ہے (۶۴/۶)۔

یہ ہیں اس عَذَابِ اللّٰهِ (۱۴/۲۱) کی تشبیہی کیفیات جو انسان کی غلط روشِ زندگی کے فطری نتائج ہیں۔ ان سب کے لئے ایک جامع اصطلاح جہنم ہے جس کا تفصیلی تعارف آئندہ باب میں وجہ ہزار عبرت ہوگا۔

اُنیسواں باب

جہنم

زمانہ قدیم میں، یروشلم کے جنوب میں ایک دادی تھی جس میں مولوک دیوتا کا مندر تھا۔ وہاں انسانوں کو زندہ جلا کر اس (دیوتا) کے حضور قربانی پیش کی جاتی تھی۔ عبرانی زبان میں دادی کو جی کہتے ہیں اور جس شخص کی طرف دادی منسوب تھی اس کا نام ہنوم تھا۔ اس لئے اس دادی کو (جس میں انسانوں کو جلا کر شربان کیا جاتا تھا) ”جی۔ ہنوم“ (یا جہنم) کہا جاتا تھا۔ اس اعتبار سے جہنم سے مراد انسانیت کی قربان گاہ ہوگی۔ قرآن کریم میں یہ لفظ اسی مفہوم کے لئے استعمال ہوا ہے۔

قرآن کریم کی رو سے، انسانی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ اس کی ذات نشوونما پا کر، اس دنیا میں خوشگوار یوں کی زندگی بسر کرے اور اس کے بعد (آخرت میں) مزید ارتقائی منازل طے کرنے

لے بعض اہل لغت کا خیال ہے کہ یہ لفظ (جہنم) عربی الاصل ہے اور اس کے معنی گہرے گڑھے کے ہیں۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ یہ عبرانی لفظ ہی ہے جسے قرآن کریم نے اپنے مفہوم کی ادائیگی کے لئے اختیار کر لیا ہے۔

کے قابل ہو جائے۔ جس زندگی میں یہ مقصد حاصل ہوا سے جنت کی زندگی کہا جائے گا۔ اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ اس کے برعکس جس زندگی میں انسانی ذات کی نشوونما رک جائے اور یوں اس کی مزرع حیات جھلس کر رہ جائے وہ جہنم کی زندگی ہوگی۔ انسانی ذات کی نشوونما کے لئے ضروری ہے کہ (۱) اس کی طبیعی زندگی کی ضروریات بغیر کسی پریشانی کے نہایت باعزت طور پر پوری ہوتی رہیں اور

(۲) انسان سوائے ان حدود کی پابندی کے جنہیں خدا نے عائد کیا ہے ہر طرح سے آزاد ہو۔ وہ احتیاج آدمیت کی فضاؤں میں سانس لے اور شرف و تحکیم انسانیت کی وادیوں میں پروان چڑھے۔ وہاں نہ کوئی فرد کسی دوسرے کا محکوم یا محتاج ہو، نہ کسی کو کسی قسم کا خوف و حزن دامن گیر ہو۔ یہ معاشرہ جنتی کہلائے گا۔ اس کے برعکس جس معاشرہ میں ایک انسان دوسرے انسانوں کا محکوم و محتاج ہو جس میں انسانیت کی تذلیل اور آدمیت کی تحقیر ہوتی ہو جس میں افراد معاشرہ اپنی بنیادی ضروریات تک کے لئے دوسروں کے دستِ نگر، فلہذا ذلیل و خوار ہوتے ہوں جس میں مستقل اقدار خداوندی کا کوئی خیال نہ رکھا جائے اور قوانینِ الہیہ سے سرکشی برتی جائے وہ معاشرہ جہنمی کہلائے گا۔ باقی رہی اگلی زندگی کے جہنم کی کیفیات سو قرآنِ کریم نے انہیں تمثیلی انداز میں بیان کیا ہے۔ اور بیان بھی اسی انداز میں کیا جاسکتا تھا اس لئے کہ انسان اپنے شعور کی موجودہ سطح پر اس زندگی کے کوائف کا احساس و ادراک کر ہی نہیں سکتا جو عالم محسوسات سے ماوراء ہو۔

شُرآنِ کریم یہ بتاتا ہے کہ جو لوگ (اس زندگی میں) شعور کی اس سطح تک پہنچ چکے ہوں کہ جب غلط اور صحیح کو ان کے سامنے رکھا جائے تو وہ ان کے خط امتیاز کو تو سمجھ سکیں، لیکن اس کے باوجود وہ اپنی غلط روش کو چھوڑ کر صحیح راستہ اختیار نہ کریں۔ وہ ان میں سے ہوں گے جو زندگی کے ارتقائی سفر میں پیچھے رہ جائیں گے۔ اس دنیا میں تو وہ اس نقصان کو محسوس نہیں کرتے جو انہیں اس طرح لاحق ہو جاتا ہے۔ (کیونکہ وہ دنیاوی مفاد کے حصول ہی کو مقصودِ حیات سمجھتے ہیں اور جب یہ مفاد انہیں حاصل ہو جاتے ہیں تو وہ اپنے آپ کو بڑے کامیاب و کامران تصور کرتے ہیں) لیکن حیاتِ اخروی میں ان کی نگاہوں پر پڑے ہوئے پردے اٹھ جائیں گے اور وہ یقین کی آنکھ سے دیکھ لیں گے کہ زندگی کی دوڑ میں اس طرح پیچھے رہ جانے سے ان کا کس قدر نقصان ہوا ہے۔ اس احساسِ زیاں سے ان پر جو اضطراب انگیز اور المناک کیفیت وارد ہوگی اس کا نام جہنم کا عذاب ہے اور چونکہ وہاں اس نقصان کی تلافی (اس کمی کو پورا

کرنے کی کوئی صورت نہیں ہوگی۔ (۱) اس لئے کہ قانون ارتقاء کی رو سے جو نوع آگے نہیں بڑھتی بلکہ کسی ایک مقام پر رُک جاتی ہے وہ پھر کبھی آگے نہیں بڑھ سکتی (۲) اس لئے ان کے دل کی یہ جلن مستقل اور ان کی اضطرابی کیفیت غیر منقطع ہوگی۔

غلط اور صحیح کا خط امتیاز وحی کی رو سے واضح ہوتا ہے۔ نزولِ شُرّانِ کریم تک یہ خط امتیاز حضرت انبیاء کرام کی وساطت سے دوسرے انسانوں کے سامنے آتا رہا۔ لیکن نبی اکرم کی بعثت کے ساتھ نبوت کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ غلط اور صحیح کے امتیازی حدود و قیود شُرّانِ کریم کے اندر منضبط اور محفوظ کر دیئے گئے اور یہ فریضہ امت محمدیہ کے ذمہ عائد کر دیا گیا کہ وہ دوسروں تک اس پیغام کو پہنچا دے۔ گذشتہ صدیوں میں اس امت نے یہ فریضہ کس حد تک ادا کیا، ہم اس تفصیل میں نہیں جانا چاہتے۔ لیکن ہمارے زمانہ میں سامانِ رسل و رسال کی فراوانی اور اسباب و ذرائع افہام و تفہیم کی ارزانی کا نتیجہ ہے کہ شُرّانِ کریم کا پیغام تمام مہذب دنیا تک پہنچ چکا ہے اور ان کی شعوری سطح بھی اتنی بلند ہو چکی ہے کہ وہ ان امتیازی خطوط کو اچھی طرح سمجھ سکیں۔ لہذا (کم از کم) اس دور کے مہذب انسانوں کے لئے یہ کہنے کی گنجائش نہیں ہو سکتی کہ انہیں غلط اور صحیح کا علم نہیں ہو سکا تھا یا وہ اسے سمجھنے کے قابل نہیں تھے ہم سمجھتے ہیں کہ قرآن کریم نے اس باب میں جن ”جہنمی“ قوموں کو مثلاً پیش کیا ہے، عصرِ حاضر کی مہذب اقوام اس زمرہ میں داخل ہیں۔ جہاں تک عقل و شعور کا تعلق ہے، شُرّانِ کریم نے متعدد آیات میں اس حقیقت کو واضح کر دیا ہے۔ مثلاً سورہ اعراف میں ہے کہ اس بات کے پہچانے میں چنداں وقت نہیں ہو سکتی کہ جہنم میں کون لوگ جائیں گے؟ یہ وہ لوگ ہیں۔ لَوْ هُمْ قُلُوبٌ لَا يَفْقَهُوْنَ بِهَا۔ وہ سمجھنے سوچنے کی صلاحیت رکھنے کے باوجود سمجھ سوچ سے کام نہیں لیں گے۔ بلکہ اندھے گونگے بہرے بن کر اپنے جذبات کے پیچھے چلتے جائیں گے۔ اُولَٰئِكَ كَانُوا لَنَا عَامِرًا بَلْ هُمْ أَضَلُّ (۲۹/۲۸)۔ یہ انسان نہیں حیوانوں کی مثل ہیں۔ بلکہ ان سے بھی گئے گزرے۔ یعنی یہ دیکھنے سننے سمجھنے سوچنے کی صلاحیت رکھتے ہیں لیکن پھر بھی عقل و فکر سے کام نہیں لیتے۔ اندھا دھند اپنی مفاد طلبی کی رو میں بہے چلے جاتے ہیں۔ اقوامِ عاد و ثمود کے متعلق کہا ہے کہ کَانُوا مُسْتَبْصِرِينَ (۲۹/۲۸) وہ اربابِ بصیرت تھے۔ سب کچھ دیکھتے بھالتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود زینِ لَوْ هُمْ الشَّيْطَانُ اَعْمَا لَوْ هُمْ ان کی جذبات پرستی نے ان کی غلط روش کو بڑا مزین بنا کر ان کے سامنے کھڑا کر رکھا تھا فَصَدَّ هُمْ

عَنِ السَّبِيلِ (۲۹/۳۸) اور یہ وہ دیوار تھی جو صحیح راستے میں رک بن کر مائل ہو گئی تھی۔ سورہ احقاف میں ہے کہ دَجَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَ أَبْصَارًا وَ آفِئَةً۔ ہم نے انہیں سماعت و بصارت اور قلب (MIND) سب دے رکھے تھے۔ فَمَا أَغْنَىٰ عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَ لَا أَبْصَارُهُمْ وَ لَا أَفِئَتُهُمْ مِّنْ شَيْءٍ إِذْ كَانُوا يَتَّبِعُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ (۴۶/۲۴) لیکن جب انہوں نے قوانین خداوندی سے اپنی ضد اور ہٹ کی بنا پر سرکشی اختیار کی تو ان کی آنکھیں ان کے کان اور ان کے دل ان کے کسی کام نہ آ سکے۔ جذبات پرستی نے انہیں اندھے بہرے اور جاہل بنا دیا۔ سورہ ملک میں ہے کہ جہنم کے داروغے جہنم میں داخل ہونے والوں سے پوچھیں گے کہ تم بڑے مہذب اور ارباب علم و دانش نظر آتے ہو تم جہنم میں کیسے پہنچ گئے؟ وہ جواب دیں گے کہ

لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ أَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِي أَصْحَابِ السَّعِيرِ ۝ (۶۷/۱۰)
اگر ہم پیغامات خداوندی کو دل کے کانوں سے سنتے اور عقل و فکر سے کام لیتے تو ہم اہل جہنم میں سے نہ ہوتے۔

ان (اور اسی قسم کی مشدّد ان کریم کی بیشتر اور) آیات سے واضح ہے کہ غلط روش اختیار کرنے کی ذمہ داری انہی لوگوں پر عائد ہوتی ہے جن میں غلط اور صحیح کے امتیازی خط کو سمجھنے کی صلاحیت ہو۔ جن کی ذہنی سطح اتنی بلند نہ ہو وہ مرفوع القلم ہوتے ہیں۔

دوسری شرط یہ تھی کہ صحیح اور غلط کے امتیازی خطوط ان لوگوں کے سامنے آچکے ہوں۔ اس سلسلہ میں بھی قرآن کریم کی بے شمار آیات حقیقت کشا ہیں۔ سورہ بنی اسرائیل میں ہے۔

مَا كُنَّا مَعَكُمْ بَيْنَ حَتَّىٰ نَبْعَثَ رَسُولًا ۝ (۱۷/۱۵)

ہم کسی قوم کو ماخوذ عذاب نہیں کرتے جب تک ان کے پاس کوئی پیغام پہنچانے والا نہ آجائے۔

اس حقیقت کو دوسری جگہ ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ ذَلِكَ أَن لَّمْ يَكُنْ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُلُوبِ بِظُلْمٍ وَ أَهْلَهَا غُفْلُونَ ۝ (۶/۱۳۲) یہ اس لئے کہ خدا کسی کو تباہ نہیں کرتا جو بے خبری کی حالت میں ہوں۔ ایسا کرنا ظلم ہے۔ (نیز دیکھئے ۲۰۹ - ۲۴/۲۰۸) سورہ مؤمن میں ہے کہ جہنم کے داروغے اہل جہنم سے پوچھیں گے کہ اَوَلَمْ نَكُ تَأْتِيكُمْ رُسُلُكُمْ بِالْبَيِّنَاتِ ۝

کیا تمہارے پاس پیغامات پہنچانے والے واضح تعلیم لے کر نہیں آئے تھے۔ قَالَ لَا بَلٰیؕ (۴/۵۰) وہ کہیں گے کہ ہاں! وہ آئے تھے۔ (نیز ۸-۹/۶۷)۔ ان مجرمین سے خود خدا کہے گا کہ وَ قَدْ قَدْ مُتَ اِلَيْكُمْ بِالْوَعْدِ (۵۰/۲۸) یہ حقیقت ہے کہ میں نے تمہیں پہلے ہی اس سے آگاہ (WARN) کر دیا تھا۔ (اس سلسلہ میں یہ آیات بھی دیکھئے ۱۹/۵۰ : ۱۱۵/۹ : ۳۰/۹ : ۳۵/۲۲)۔

ان حقائق سے واضح ہے کہ "اثباتِ جرم" کے لئے جن دو بنیادی حجتوں کی ضرورت ہوتی ہے وہ پوری ہو جانے کے بعد ہی انہیں مجرم قرار دیا جائے گا۔ یعنی قانون کا علم اور اسے سمجھنے کی صلاحیت۔ اصل یہ ہے کہ انسانی ذات پر اثر ہی ان اعمال کا مرتب ہوتا ہے جو بقائمی ہوش و حواس اپنے اختیارِ ارادہ کے ساتھ جانتے بوجھتے سرزد ہوں۔ اور چونکہ جہنم نام ہی ان نقوش کے اثرات کا ہے جو غلط روشِ زندگی سے انسانی ذات پر برسرِ تم ہوں۔ اس لئے ان لوگوں کے لئے جنت و جہنم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جو نہ عقل و شعور رکھتے ہوں نہ اختیار و ارادہ۔ اور اختیار و ارادہ کا سوال تو اس وقت سامنے آتا ہے جب غلط اور صحیح دونوں راستے متمیز ہو کر انسان کے سامنے آجائیں۔ اس لئے قرآنِ کریم نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ لَا اِكْرَاكَ فِي الدِّينِ ۚ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ (۲/۲۵۶)۔ چونکہ دین میں زبردستی کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس لئے غلط اور صحیح راستے واضح کر دیئے گئے ہیں۔ وَ قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكُمْ ۚ فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمَرْ ۚ وَ مَنْ شَاءَ فَلْيُكْفُرْ ۚ (۱۸/۲۹) ان سے کہہ دو کہ حق تمہارے نشود نما دینے والے کی طرف سے آگیا اب جس کا جی چاہے اسے تسلیم کر لے جس کا جی چاہے اس سے انکار کر کے غلط روش اختیار کر لے۔

اور جانتے بوجھتے غلط روش اختیار کرنے کا احساس اور اس کے تباہ کن نتائج کی نمود وہ عذابِ جہنم ہے جس کے شعلے دلوں کو پیٹ لیں گے (۱۱۰/۷)۔ جیسا کہ سابقہ عنوان میں بتایا جا چکا ہے۔ قرآنِ کریم نے اس اضطرابی کیفیت کو مختلف محسوس تشبیہات سے سمجھایا ہے۔ انہی کی تفصیل آئندہ سطور میں سامنے آئیں گی۔

دُنیا میں جہنم

جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے، جن جرائم کی پاداش اسی دنیا میں سامنے آجاتی ہے قرآنِ کریم نے

اس (سزا) کو بھی عذاب سے تعبیر کیا ہے اور اس عذاب کو اکثر مقامات پر جہنم کہا گیا ہے۔ اس میں وہ سزائیں بھی شامل ہیں جو مجرمین کو اسلامی نظام کی عدالتوں کی طرف سے ملتی ہیں اور قوموں کا وہ انجام بھی جو اس دنیا میں تباہی اور بربادی کی شکل میں سامنے آتا ہے۔ یہ تباہی اور بربادی خود اس قوم کے افراد کے ہاتھوں سے بھی ظہور میں آتی ہے اور دوسری قوموں کے ساتھ ٹکراؤ کی صورت میں بھی۔

لیڈروں کی بدعنوانیوں سے قوم جہنم میں

سورۃ البراہیم میں ہے:

کیا تم نے ان لوگوں کی حالت پر غور کیا جنہوں نے خدا کی عطا کردہ نعمتوں سے ناپاس گزاری کا ثبوت دیا۔ (انہیں غلط طریق سے صرف کیا) اور اس طرح اپنی قوم کے کاروان کو اس منڈی میں جا اتارا جہاں اس جلس کا سدکا کوئی خریدار نہیں تھا۔ یعنی جہنم میں۔ وہاں ان کی متاع حیات مجلس کر رکھ کا ڈھیر ہو گئی۔ کیسا تباہ کن تھاپہ مقام جس میں (ان کے لیڈر) انہیں لے گئے! (۲۸۱-۲۹/۱۳)۔

ذلت کی زندگی جہنم میں

جو قومیں، کارگرہ کائنات پر غور و فکر نہیں کرتیں اور اس طرح فطرت کی قوتوں کو سخر کر کے ان سے کام نہیں لیتیں، وہ ذلت کی زندگی بسر کرتی ہیں۔ اس زندگی کو عذاب النار سے تعبیر کیا گیا ہے سورۃ آل عمران میں ہے:-

یہ حقیقت ہے کہ تخلیق ارض و سما اور اختلاف لیل و نہار میں ارباب عقل و دانش کے لئے (مقام آدمیت تک پہنچنے کے لئے) بڑی بڑی نشانیاں ہیں۔ یعنی ارباب عقل و دانش کے لئے جو کھڑے بیٹھے، لیٹے، قوانین خداوندی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں اور تخلیق کائنات پر انتہائی غور و فکر کے بعد علی وجہ البصیرت اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ کائنات کی کوئی شے بھی بے مصرف پیدا نہیں کی گئی۔ اس تحقیق و تدقیق کا جذبہ محرکہ یہ خطہ ہوتا ہے کہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو وہ عذاب النار میں ماخوذ ہو جائیں گے اور جو قوم عذاب النار

ہیں مانو ہو جائے وہ ذلیل و خوار ہو جاتی ہے اور دنیا میں اس کا کوئی پرسان حال

نہیں ہوتا (۱۸۹ — ۱۹۱/۳)۔

تسخیرِ فطرت کے بعد بھی جو قومیں مستقل اقدارِ خداوندی کی خلاف ورزی سے معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا کرتی ہیں انہیں بھی اس جہنم کی سزا ملتی ہے۔ یہ سزا ذلت و خواری کی شکل میں ان کے سامنے آتی ہے۔
أُولَئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ (۱۰/۲۷) ان کی زندگی جہنم کی زندگی ہوتی ہے۔

بزدلی اور بے حوصلگی جہنم پیدا کر دیتی ہے

شرک کے معنی یہ ہیں کہ انسان یا تو فطرت کی قوتوں کو اپنے سے بالاتر سمجھ کر ان کے سامنے ٹھک جائے اور یا اپنے جیسے انسانوں کو بالادست تصور کر کے ان کی محکومی اختیار کر لے۔ سورہ آل عمران میں ہے کہ اس قسم کی ذہنیت رکھنے والے لوگ انتہائی بزدل ہوتے ہیں۔ ان کے دل میں فسیق مقابل کا رعب طاری ہو جاتا ہے۔ وَ مَا وَهُمْ بِالْمُتَارِدِينَ (۳/۱۵۰) اور یوں ان کا مستقر جہنم ہو جاتا ہے۔

مغلوبیت بھی جہنم ہے

عربی قبائل نے حضور نبی اکرم کی دعوت کی سخت مخالفت کی اور اسلامی نظام کے قیام کی راہ میں ہر ممکن رکاوٹ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ لیکن قرآن کریم نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ ثُمَّ يُعَذِّبُونَ (۸/۳۶) یہ لوگ مغلوب ہو کر رہیں گے اس کے بعد ہے۔ وَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِلَىٰ جَهَنَّمَ يُحْشَرُونَ (۸/۳۷-۳۶) جو لوگ اس نظام حق و صداقت کی مخالفت کریں گے وہ جہنم میں اکٹھے کر دیئے جائیں گے۔ یہ وہ جہنم تھا جو مختلف معرکوں میں یتیم شکستوں کی صورت میں ان کے سامنے آیا تھا اور جس کا تفصیلی ذکر ذرا آگے چل کر سامنے آئے گا۔ صلح حدیبیہ کے سلسلہ میں عجمیت مومنین کو اطمینان دلایا گیا کہ اس صلح سے (جو بظاہر شکست نظر آتی تھی) افسردہ خاطر ہونے کی وجہ سے نہیں تم عنقریب دیکھو گے کہ تمہیں کس قدر شادا ہیوں اور سرفرازیوں کی جنت کی زندگی نصیب ہوتی ہے اور ان منافقین و مشرکین (مخالفین) کو کس طرح جہنم رسید کیا جاتا ہے (۴۸/۶-۴)۔

باہمی تفرقہ اور عداوت کی زندگی جہنم کی ہے

سورہ آل عمران میں 'جماعتِ مومنین کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے کہ تم سب کے سب اجتماعِ طور پر ایک جا ہو کر، خدا کی کتاب کے ساتھ متمسک رہو اور باہمی تفرقہ پیدا نہ کرو۔ تم خدا کی اس نعمت کو یاد کرو کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ اس نے تمہیں اس حالت سے نکال کر آپس میں بھائی بھائی بنا دیا اور ایک دوسرے کے دل آپس میں جوڑ دیئے۔ تم جہنم کے کنارے تک پہنچ چکے تھے کہ خدا نے تمہیں اس میں گرنے سے بچا لیا۔ اس طرح خدا اپنے احکام و ضوابط کو واضح طور پر بیان کر دیتا ہے تاکہ تم سیدھی راہ پر چلتے رہو (اور پھر جہنم کا راستہ اختیار نہ کر لو)۔ (۳/۱۰۲)۔

گھر کی زندگی میں جہنم

قرآن کریم نے ازدواجی زندگی کے لئے ہم آہنگی، فکر و نظر (یعنی خیالات کی مطابقت) کو ضروری قرار دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر میاں بیوی میں نظریات کی ہم آہنگی ہو تو گھر جنت کا نمونہ بن جاتا ہے اور اگر ان میں اختلاف ہو تو گھر جہنم ہو جاتا ہے فکر و نظر کے سلسلہ میں وہ مشرک اور ایمان کے تقابل سے بات کی وضاحت کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کسی مومن مرد کا مشرکہ عورت سے اور کسی مومن عورت کا مشرک مرد سے نکاح جائز نہیں۔ اس پابندی سے مقصد یہ ہے کہ وَاللّٰهُ يَدْعُوْا اِلَى الْجَنَّةِ (۲/۲۲۱) اللہ تمہیں جنت کی دعوت دیتا ہے۔ لیکن جو اس کے خلاف جاتے ہیں اور ازدواجی زندگی میں خیالات کی مطابقت کو کچھ اہمیت نہیں دیتے۔ اُولٰٓئِكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ (۲/۲۲۱) وہ جہنم کی طرف دعوت دیتے ہیں۔

غلط معاشرہ میں جہنم کی زندگی

جب مدینہ میں اسلامی نظام قائم ہو گیا تو عام دعوت دی گئی کہ جو مسلمان مختلف مقامات میں بستے ہیں وہ وہاں سے ہجرت کر کے مدینہ آجائیں اور اس طرح اسلامی فضا میں زندگی بسر کریں۔ اس

سلسلہ میں کہا کہ جو لوگ ہجرت کر سکنے کی استطاعت اور امکان کے باوجود نقل مکانی نہ کریں اور غیر اسلامی معاشرہ میں زندگی بسر کرنے پر مطمئن رہیں فَأُولَٰئِكَ مَا لَهُمْ جَهَنَّمُ^۵ (۴/۹۷) یہ وہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانا جہنّم ہے۔ یہ جہنّم اس دنیا میں بھی ہے اور آخرت میں بھی۔

جرائم کی سزا کو جہنّم سے تعبیر کیا گیا

جب اسلامی نظام قائم ہو جائے تو قوانین خداوندی سے سرکشی اختیار کرنے والوں کو اسلامی عدالت سے سزا ملتی ہے۔ اس سزا کو بھی قرآن کریم نے اس دنیا کے جہنّم سے تعبیر کیا ہے۔ لیکن یہ جہنّمی زندگی یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ ان کے لئے آخری زندگی میں بھی جہنّم ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن کریم نے جس جہنّم کا ذکر کیا ہے اس کا اطلاق ان دونوں زندگیوں پر ہو سکتا ہے۔ سورہ مجادلہ میں منافقین کے سلسلہ میں کہا کہ وہ اسلامی نظام کے خلاف سازشیں کرنے سے باز نہیں آتے اور پھر اپنے آپ کو یہ کہہ کر فریب میں رکھتے ہیں کہ اگر یہ نظام حق پر مبنی ہے تو ہمیں ہماری کارستانیوں کی سزائیوں نہیں دی جاتی۔ اس کے جواب میں کہا کہ حَسْبُكُمْ جَهَنَّمُ يَصْلَوْنَهَا ۚ فَبِئْسَ الْمَصِيرُ (۵۰/۸)۔ ظاہر ہے کہ اس جہنّم سے مراد وہ سزا بھی ہو سکتی ہے جو انہیں اسلامی نظام کے ہاتھوں بعد میں ملی تھی۔ سورہ نساء میں ہے کہ جو شخص کسی مومن کو عمدًا قتل کر دے تو اس کی سزا جہنّم ہے اور خدا کا غضب اور اس کی لعنت۔ ظاہر ہے کہ اس عذاب جہنّم میں دنیاوی سزا بھی شامل ہے (۲/۹۳)۔

سورہ البقرہ میں ہے کہ جو فتنہ پرداز مومن مردوں اور مومن عورتوں کو اذیت دیتے ہیں اور کہنے سننے کے باوجود اپنی اس روش سے باز نہیں آتے فَلَهُمْ عَذَابٌ جَهَنَّمُ ۚ لَهُمْ عَذَابٌ الْحَرِيقُ ۚ ان کے لئے جہنّم کا سوزندہ عذاب ہو گا۔ یہ وہی سزا ہے جو ان لوگوں کو اسلامی نظام کی طرف سے ملی تھی۔ دوسرے مقام پر ان منافقین کے متعلق جو شریف زادیوں کو راہ چلتے تنگ کرتے تھے مختلف سزاؤں کا ذکر ہے (۳۳/۵۱-۵۰)۔

حضرت سلیمان کے زیر فرمان بہت سے وحشی قبائل کے افراد مختلف کام کیا کرتے تھے۔ ان کے سلسلہ میں کہا کہ ان میں سے جو قوانین خداوندی سے سرکشی برتاؤ تھا اسے عَذَابُ السَّعِيرِ کا مزہ چکھایا جاتا تھا (۲۴/۱۲)۔ دوسرے مقام پر "عَذَابُ السَّعِيرِ" کی تشریح ان الفاظ میں

کر دی کہ ایسے مجرمین کو زنجیروں میں پہنا کر تنگ و تاریک کوٹھڑیوں میں بند کر دیا جاتا ہے (۱۱-۱۳/۲۵)۔
 سورۃ الدھر میں ہے کہ کفار (مجرمین) کے لئے طوق اور زنجیروں اور السّعی یؤبے (۴/۶۶)۔ سورۃ ابراہیم
 میں کہا کہ مجرمین کو اکٹھے زنجیروں میں جکڑا جائے گا (۱۱۳/۴۹) اور اس طرح انہیں گھسیٹ کر شعلہ خیز نار میں
 ڈال دیا جائے گا (۴۱-۴۲/۴۰)۔ سورۃ مزمل میں ہے کہ ان حق کی مخالفت کرنے والوں کو ہمارے قانون
 مکافات کے حوالے کر دو۔ ہمارے پاس ان کے لئے بیڑیاں ہیں، انہیں روک رکھنے کا سامان ہے اور ایسا
 کھانا ہے جو خلق میں ایک کر رہ جائے (۱۱-۱۳/۶۳)۔ سورۃ حاقہ میں کہا گیا کہ وہ زنجیروں بڑی لمبی لمبی ہیں (۶۹/۳۶)۔
 ان تفصیل سے ظاہر ہے کہ یہ اس سزا کا ذکر ہے جو مجرمین کو اس دنیا میں ملتی ہے۔

اسلامی نظام کے مخالفین کا انجام

نبی اکرم کی دعوت کی مخالفت کرنے والوں کا آخری حربہ یہ تھا کہ وہ اس نظام کو ختم کرنے کے لئے
 میدان جنگ میں اُتر آئے۔ قرآن کریم نے جماعتِ مومنین سے کہا کہ اس میں گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ تم
 اگر اپنے پروگرام پر استقامت سے جمے رہے تو ان لوگوں کو شکست ہوگی۔ اس طرح شکست خوردہ مجرمین
 کی جو کیفیت ہوتی ہے قرآن کریم نے اسے بھی جہنّم سے تعبیر کیا ہے۔ مثلاً سورۃ آل عمران میں ہے کہ ان
 لوگوں کو بیشک اس وقت ملک میں غلبہ و اقتدار حاصل ہے لیکن مَتَاعٌ قَلِيلٌ یہ بہت تھوڑی مدت تک
 اس سے متمتع ہو سکیں گے۔ ثُمَّ مَا لَهُمْ جَهَنَّمُ ط وَ بئسَ الْمِهَادُ ۝ (۳/۱۹۷) اس کے بعد ان
 کا ٹھکانہ جہنّم ہوگا اور وہ بہت بُری جگہ پر ہے۔ اس سے ذرا پہلے ہے کہ ان لوگوں کو متنبہ کر دو کہ تم
 عنقریب مغلوب و مفتوح ہو گے۔ وَ تُحْشَرُونَ اِلٰی جَهَنَّمَ ط وَ بئسَ الْمِهَادُ ۝ (۳/۱۱) اور جہنّم
 کی طرف کشاں کشاں لے جائے جاؤ گے۔ اس کے جنگِ بدر کی تفصیل ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ جہنّم
 وہی ہے جو ان سردارانِ قریش کے سامنے جنگِ بدر میں شکست کی صورت میں آیا تھا۔

سورۃ توبہ میں 'اسلامی نظام کے خلاف جنگ کرنے والوں کا ذکر اور ان کے انجام کا تذکرہ متعدد
 مقامات پر تفصیل سے آیا ہے اور ان کے عبرت ناک انجام کو جہنّم سے تعبیر کیا گیا ہے۔ بات یوں شروع
 کی گئی ہے کہ

اَلَمْ يَعْلَمُوا اَنَّهُ مَن يُّحَادِدِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَاَنَّ لَهُ نَارَ جَهَنَّمَ

خَالِدًا فِيهَا ذَلِكَ الْحَزْنُ الْعَظِيمُ ۝ (۹/۴۳)

کیا ان لوگوں کو اس کا علم نہیں کہ جو خدا اور اس کے رسول کی مخالفت کے لئے اٹھا ہے اس کا انجام جہنم کی آگ ہوتا ہے جس میں اسے رکھا جاتا ہے اور یہ ذلت و رسوائی بہت بڑی ہوتی ہے۔

”ذلت و رسوائی“ کے عذاب نے جہنم کی وضاحت کر دی ہے۔ اسی ناریہ جہنم سے منافقین کو آگاہ کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ وہ ذرا اس پر غور کر لیں کہ اقوام گزشتہ میں سے جنہوں نے حق کی مخالفت کی تھی ان کا انجام کیا ہوا تھا (۹/۴۸-۴۹)۔ ظاہر ہے کہ اقوام گزشتہ کی یہ تباہی اسی دنیا میں ہوئی تھی اس لئے اسے ان کے سامنے بطور عبرت و وعظت پیش کیا گیا۔

رسول اللہ سے کہا گیا کہ ان مخالفین اکفار اور منافقین کے خلاف جنگ کرو اور انہیں سختی سے دباؤ۔ مَا ذُهِمُّ جَهَنَّمُ (۹/۴۳) تم دیکھ لو گے کہ کس طرح ان کا انجام جہنم ہوتا ہے۔

مدینہ میں بہت سے منافقین تھے۔ یہ لوگ بظاہر جماعت مومنین کے ساتھ ہوتے تھے۔ لیکن بیاطن ان کی مخالفت کرتے تھے۔ جنگ کے زمانے میں ان کی منافقت کی پردہ دری ہو جاتی تھی۔ یہ اسلامی لشکر کا ساتھ نہیں دیتے تھے اور اس کے لئے طرح طرح کی عذر تراشیاں کرتے تھے۔ ان کے متعلق کہا کہ سر دست ان سے اعراض برتو۔ مَا ذُهِمُّ جَهَنَّمُ جَزَاءُ بِمَا كَانُوا يَعْسَبُونَ (۹/۵۵) انہیں ان کے کئے کی سزا ملے گی، انہیں جہنم رسید کیا جائے گا۔ اور وہ سزایہ تھی کہ اسلامی نظام غالب آیا اور یہ منافقین نیست و نابود ہو گئے۔

سورۃ الفآل میں جنگ بدر کی تفصیل بڑی شرح و بسط سے آئی ہیں۔ ایک مقام پر میدان جنگ میں فریق مقابل کی گردن زدنی کے بعد کہا کہ ان کا یہ انجام اس لئے ہوا کہ انہوں نے اسلامی نظام کے قیام کی شدت سے مخالفت کی تھی۔ اس لئے اب یہ اس عذاب کا مزہ چکھیں اور اس طرح اس حقیقت کو اپنے سامنے بے نقاب دیکھ لیں کہ اِنَّ لِلْمُتَفَعِّرِينَ عَذَابَ الْكَارِ (۸/۱۳-۱۴) حق کی مخالفت کرنے والوں کے لئے آگ کا عذاب ہوتا ہے۔ ان لڑائیوں کے سلسلہ میں ان مخالفین نے جس قدر دولت صرف کی اس کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ یہ جب مغلوب و مفتوح ہوں گے تو انہیں اس کا بے حد افسوس ہو گا کہ ہم نے اس قدر دولت ناحق ضائع کی۔ اس کے بعد ہے کہ وَالَّذِينَ

كَفَرُوا إِلَىٰ جَهَنَّمَ يُحْشَرُونَ ۝ (۸/۳۶) حق کی مخالفت کرنے والوں کو یوں جہنم کی طرف ٹانگ کر لے جایا جاتا ہے۔

سورۃ قمر میں ہے کہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم نے حق کی مخالفت کے لئے متحدہ محاذ قائم کر لیا ہے ہیں کون شکست دے سکتا ہے۔ ان سے کہا کہ تم دیکھو گے کہ تمہارے یہ جزائر شکر، میدان جنگ سے کس طرح پیٹھ دکھا کر بھاگتے ہیں۔ ابھی وہ انقلاب آجائے گا جس سے تمہیں متنبہ کیا جاتا رہا ہے۔ اس وقت واضح ہو جائے گا کہ مجرمین کس تباہی میں ماخوذ ہوتے ہیں۔ اس وقت انہیں التار میں گھیٹا جائے گا اور کہا جائے گا کہ عذاب سقر کا مزہ چکھو (۴۴/۲۸ - ۵۴/۲۸)۔

سورۃ تحریم میں اس تمام تفصیل کو ایک آیت میں سمٹا دیا جب کہا کہ
يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ وَمَا لَهُمْ
بِجَهَنَّمَ وَلَا يَبْسُ الْمَصِیْرُ ۝ (۹/۹۶)

اے نبی! ان حق کے مخالفین، کفار اور منافقین کے خلاف جنگ کرو اور انہیں سختی سے

دباؤ۔ ان کا انجام جہنم ہوگا اور وہ بہت بُری جائے قرار ہے۔

سورۃ توبہ میں اس جہنم کے متعلق کہا کہ وہ انہیں چاروں طرف سے محیط ہے، یہ اب اس سے بچ کر کہیں نہیں جاسکتے (۹/۴۹)۔ اور تاریخ کے اوراق اس پر شاہد ہیں کہ چند ہی دنوں کے اندر اندر یہ حقیقت کس طرح محسوس شہادت بن کر سامنے آگئی، مخالفین سب کے سب، خاصہ نامراد رہ کر ذلیل و خوار ہو گئے اور اسلامی نظام کا مران و شاد کام انسانیت کی نجات کا ضامن بنا۔ انہیں بار بار متنبہ کیا جاتا تھا کہ وہ ایسے حالات پیدا نہ کریں کہ جن میں جماعتِ مومنین کو مجبوراً میدان جنگ میں اترنا پڑے۔ لیکن وہ اپنی قوت کے نشہ میں بدمست، ان تنذیرات کا مذاق اڑاتے تھے اور کہتے تھے کہ تم ہمیں خالی دھمکیاں کیوں دیتے ہو، اس تباہی کو لے کیوں نہیں آتے جس سے ہمیں اس طرح ڈراتے رہتے ہو۔ اس کے جواب میں کہا گیا کہ لے کا ش! انہیں معلوم ہو سکتا کہ جب وہ تباہی آئے گی تو اس کے شعلوں سے انہیں کسی جگہ بھی پناہ نہیں مل سکے گی (۲۱/۳۹)۔ اس وقت ان کی آنکھوں پر (خود فری) کے پردے پڑے ہوئے ہیں اس لئے یہ اس تباہی کو دیکھ نہیں سکتے لیکن مَا هُمْ عَنْهَا بِغَائِبِينَ (۸۲/۱۶) یہ اس کی نگاہوں سے اوجھل نہیں وہ انہیں چاروں طرف سے گھیرے

ہوئے ہے (۹/۴۹)۔

اسلامی نظام کی سب سے زیادہ شدید زرد مذہبی پیشوائیت اور سرمایہ دار طبقہ پر پڑتی ہے۔ کیونکہ اس سے ان کی مفاد پرستیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ اس لئے اس نظام کے قیام کی سب سے شدید مخالفت (ارباب اقتدار کے ہر اول دستوں کی شکل میں) انہی طبقوں کی طرف سے ہوتی ہے اور اس نظام کے قیام کے بعد یہی لوگ سب سے پہلے جہنم کے عذاب میں ماخوذ ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے مذہبی پیشواؤں کے متعلق کہا کہ یہ لوگ حق و صداقت کو لوگوں کی نگاہوں کے سامنے نہیں آنے دیتے اور اس طرح دنیا کماتے ہیں۔ لیکن انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اُدْلِیْکَ مَا یَاکُلُوْنَ فِی بُطُونِہُمْ اِنَّ النَّارَ (۲/۱۷۳) وہ اپنے پیٹ میں آگ بھرتے ہیں۔ یہی الفاظ یموں کا مال کھا جانے والوں کے متعلق آئے ہیں (۴/۱۰)۔

سورۃ توبہ میں سرمایہ دار طبقہ کو انہی کے ساتھ ہم قوس کر کے کہا۔

اے جماعتِ مومنین! اس حقیقت سے کبھی غافل نہ ہونا کہ مذہبی علماء و مشائخ میں سے بیشتر کی حالت یہ ہے کہ وہ بغیر خود کچھ کام کئے لوگوں کی کمائی ناحق کھا جاتے ہیں اور انہیں خدا کے راستے کی طرف آنے سے روکتے ہیں کیونکہ اس سے ان کے مفاد پر زرد پڑتی ہے۔ اور اسے بھی سمجھ رکھنا کہ جو لوگ مال و دولت جمع کرتے رہتے ہیں اور اس خدا کی راہ میں (یعنی نوع انسان کی بہبود کے لئے) کھلا نہیں رکھتے، ان کا انجام بڑی المیہ تباہی ہوگی۔ (اس انقلاب کے وقت) یہ چاندی سونے کے سکے جہنم کی آگ میں تپائے جائیں گے اور ان سے ان کی پیشانیوں، پہلوؤں اور پشتوں کو داغ دیا جائیگا اور ان سے کہا جائے گا کہ یہ ہے وہ مال و دولت جسے تم نے صرف اپنی ذات کے لئے دبا کر رکھ چھوڑا تھا (۳۴ - ۳۵/۹)۔

اس سے دو ہی آیات بعد جماعتِ مومنین سے کہا گیا ہے کہ تم اس نظامِ باطل کے خلاف جنگ کے لئے باہر نکلو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو خدا تمہاری جگہ کسی دوسری قوم کو لے آئے گا جو مذہبی پیشوائیت اور سرمایہ داری کے اس انسانیت کش نظام کو ختم کر دے گی۔

لیکن جو قوم اس نظامِ حق و صداقت کو قائم کرنے کے بعد اسے چھوڑ بیٹھے اور خود سی طو کیت مذہبی

پیشوائیت اور سرمایہ داری کے اس نظام کو قائم کر لے جسے انہوں نے مٹایا تھا، تو ان کے متعلق کہا کہ ان پر عذابِ جہنم مسلط ہو جائے گا۔ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْصَرُونَ ۝ (۲/۸۶) ان کے اس عذاب میں تخفیف نہیں کی جائے گی اور نہ ہی انہیں مہلت دی جائے گی۔

یہ وہ عذابِ جہنم ہے جس میں ہم صدیوں سے مبتلا چلے آ رہے ہیں لیکن خود فریبی ایسی کہ اس زعمِ باطل میں گرفتار ہیں کہ ”دوزخ کا عذاب کافروں کے لئے“ ہے، ہمارے لئے نہیں۔ سچ کہا تھا اقبالؔ نے کہ

ز دوزخ واعظ کافر گرے گفت
حدیثِ خوشتر از دے کافرے گفت
”نہ اند آں عنلام احوالِ خود را
کہ دوزخ را مقامِ دیگرے گفت“



جہنم قلبی کیفیت کا نام ہے

”بانگ درا“ میں۔ سیر فلک کے عنوان سے۔ علامہ اقبالؒ کی ایک نظم ہے جو جہنم کی حقیقت کو بڑے معنی خیز اور بصیرت افروز انداز سے سامنے لاتی ہے۔ اس میں انہوں نے کہا ہے کہ جب جہنم کے ”خاتم آرزوئے دیدہ و گوش“ نظارہ سے فارغ ہو گئے تو انہوں نے دور ایک یخ بستہ سرد خانہ دیکھا۔ اپنے گانڈ (فرشتہ) سے پوچھا کہ یہ خطہ زمہ پر کیا ہے۔ اس نے کہا کہ یہ جہنم ہے۔ اس پر انہوں نے بصد استعجاب کہا کہ ہم نے تو سن رکھا ہے کہ جہنم میں بھڑکتے ہوئے شعلے ہوں گے اور آپ اس یخ بستہ خطے کو جہنم بتا رہے ہیں۔ اس نے کہا کہ یہ جہنم ہی ہے اس کے شعلے اپنے نہیں ہوتے۔

اہل دنیا یہاں جو آتے ہیں

اپنے انگار ساتھ لاتے ہیں

اور انہی کے انگاروں سے اس میں حدت پیدا ہوتی ہے۔ یہی جہنم کی صحیح حقیقت ہے۔ اسی لئے قرآن کریم نے خود انسانوں کو جہنم کا ایندھن بتایا ہے۔ فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي ذُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ﴿۷۴﴾ وہ آگ جس کا ایندھن پتھر نما انسان ہیں۔ (نیز ۷۶/۴)۔ سورہ آل عمران میں کہا کہ اُولَئِكَ هُمُ

لِ النَّاسِ وَالْحِجَارَةُ کے مختلف مفاہیم بیان کئے جاتے ہیں۔ اس مقام پر ہم صرف اتنا بتانا چاہتے ہیں کہ قرآن کریم نے خود انسانوں کو جہنم کا ایندھن بتایا ہے۔ اس لئے انسانوں کے خود اپنے دل کی آگ ان کیسے آتشِ دوزخ بنتی ہے۔

وَقُلُودُ النَّارِ ۵ (۳/۹) یہ لوگ خود ہی جہنم کا ایندھن ہیں۔ سورۃ انبیاء میں باطل پرستوں سے کہا کہ تم اُو جن کی تم معبودیت (مخدویت) اختیار کرتے ہو حَصَبُ جَهَنَّمَ۔ جہنم کا ایندھن ہیں (۲۱/۹۸)۔ سورۃ جن میں صبح رات سے ہٹ جانے والوں کے متعلق کہا کہ فَكَانُوا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا ۵ (۷۲/۱۵) یہ جہنم کا ایندھن ہیں۔ جہنم کی آگ ان کی بھڑکائی ہوئی ہوتی ہے۔ خود ہی اسے جلاتے ہیں اور خود ہی اس میں جلتے ہیں۔ فَادُّ إِلَهِ الْمُوقَدَّةُ النَّارِ تَطْلُعُ عَلَى الْأَفْنَادِ ۵ (۱۰۴/۴) خدا کے قانونِ مکافات کی بھڑکائی ہوئی آگ جس کے شعلے دلوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔

مسجدِ اسلامی نظام کا مقام اجتماعیت ہے۔ اس لئے اس کا نظم و نسق نظام کے مرکز ہی کے زیرِ اہتمام ہونا چاہیے۔ لیکن مدینہ میں مسلمانوں کی ہدایت اجتماعیت میں افتراق و انتشار پیدا کرنے کے لئے کچھ لوگوں نے ایک الگ مسجد تعمیر کر دی۔ ان کا یہ اقدام اسی قدر خطرناک تھا کہ خود خدا نے رسول اللہ کو اس سے آگاہ کیا اور کہا کہ دیکھنا تم اس مسجد میں ایک قدم نہ رکھنا۔ تاریخ میں ہے کہ حضور نے اس مسجد کو منہدم کر دیا اور اس طرح ان لوگوں کی سازش ناکام کر دی گئی۔ ان لوگوں کے متعلق سورۃ توبہ میں ہے کہ انہوں نے اس مسجد کی بنیاد تباہی کے کنارے پر رکھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فَانْفَارَ بِهِ فِي نَارِ جَهَنَّمَ ۵ وہ عمارت اپنے بانی کو ساتھ لے کر جہنم میں گر گئی۔ یہ جہنم کیا تھا؟ رَبِّهِ فِي قُلُوبِهِمْ ۵ اِنَّ تَقَطَّعَ قُلُوبُهُمْ ۵ (۹/۱۱۰) ان کے دل اضطرابِ پیہم کی آماجگاہ بن گئے اور اس اضطرابی کیفیت نے ان کے دلوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ یہ ہے جہنم۔



(جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) جن لوگوں کا اس دنیا کی زندگی میں شعور بیدار ہو چکا ہوگا لیکن انہوں نے اپنی ذات کی نشوونما نہیں کی ہوگی انہیں موت کے بعد کی زندگی میں اس کا شدید احساس ہوگا کہ وہ زندگی کے ارتقائی مراحل میں پیچھے رہ گئے۔ احساس کی بیداری، لیکن زندگی کی بلند سطح سے محرومی کی اس کیفیت کو قرآن کریم نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ لَا يَمُوتُ فِيهَا وَلَا يَحْيٰی (۲۰/۷۴) جہنم میں نہ تو انہیں زندگی نصیب ہوگی اور نہ ہی موت آئے گی۔ یہ کیفیت کس قدر کرب انگیز ہوگی۔ اس کا نقشہ قرآن کریم نے ان الفاظ میں کھینچا ہے کہ يَأْتِيهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَمَا هُوَ بِمَيِّتٍ ۵ (۱۳/۱۷) انہیں چاروں طرف سے موت آتی دکھائی دے گی لیکن وہ

میں گے نہیں! یہی عذاب کچھ کم الم انگیز نہیں ہوگا کہ دَرَّأَتْ مِنْ دَرَّأَتْ عَذَابٌ غَلِيظٌ ۵ (۱۴/۱۸) اس کے ماوراء اور شدید عذاب بھی ہوگا۔ وہ وہاں چلا چلا کر ہلاکت کو پکاریں گے کہ کسی طرح ان کا خاتمہ ہو جائے۔ ان سے کہا جائے گا کہ تم ایک بار چھوڑ، ہزار بار ہلاکت کو آوازیں دو، وہ تمہارا خاتمہ کرنے کو نہیں آسکتی (۱۳-۱۴/۲۵)۔ لَا يُقْضٰی عَلَیْہُمْ فِیْہُمْ قَوْلًا وَلَا یُخَفَّفُ عَنْہُمْ مَرَّتَ عَذَابًا ۵ (۳۶/۲۵) نہ وہ عذاب اتنا ہوگا کہ اس سے وہ مر جائیں اور نہ ہی اس میں تخفیف ہوگی۔ دَ یَقُولُ الْکَافِرُ یَلِیْتَنِّیْ کُنْتُ شَرًّا بَا ۵ (۴۰/۷۸) حق سے انکار کرنے والا شدتِ اضطراب سے تنگ آکر چیخ اٹھے گا کہ اے کاش! میں ذی احساس انسان ہونے کے بجائے مٹی کا تودا ہوتا تو اس عذاب میں گرفتار تو نہ ہوتا!

ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ انسان کے ہر عمل کا اثر اس کی ذات پر مرتسم ہوتا جاتا ہے۔ تخریبی اعمال کا اثر تخریبی۔ تعمیری کا تعمیری۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو انسان کی جنت اور جہنم اس کی زندگی میں ساتھ کے ساتھ تیار ہوتے جاتے ہیں۔ لیکن انسان کی جذبات پرستیاں اس طرح اس کی آنکھوں پر پردے ڈالے رکھتی ہیں کہ وہ اس جہنم کو دیکھ نہیں سکتا۔ مرنے کے بعد کی زندگی میں یہ پردے اٹھ جائیں گے ہر شے اپنی اصلی شکل میں سامنے آجائے گی۔ اس وقت خود فریبی کا کوئی امکان نہیں ہوگا۔ اس لئے جو جہنم یہاں نگاہوں سے مستور ہے وہاں بے حجاب ہو کر نظر آنے لگ جائے گی۔ سورۃ کہف میں ہے۔ وَ عَرَضْنَا جَهَنَّمَ یَوْمَئِذٍ لِّلْکَافِرِیْنَ عَرَضًا ۵ ہم اس دن جہنم کو ابھار کر ان کی آنکھوں کے سامنے لے آئیں گے۔ اَلَّذِیْنَ کَانَتْ اَعْیُنُہُمْ فِیْ غِطَآءٍ عَنْ ذِکْرِیْ وَ کَاوُؤًا لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ سَمْعًا ۵ (۱۸-۱۹) ان لوگوں کے سامنے جن کی دنیاوی زندگی میں کیفیت یہ تھی کہ ان کی آنکھوں پر پردے پڑے رہتے تھے جن کی وجہ سے وہ ہمارے قوانین کو اپنے سامنے دیکھ نہیں سکتے تھے۔ جن کے کانوں میں ڈاٹ لگ چکے تھے جن کی بنا پر وہ تنذیرات کو سُن نہیں سکتے تھے۔ دوسری جگہ ہے بُرِّزَتِ الْجَحِیْمُ لِّلْغَٰوِیْنِ ۵ (۹۱/۲۶) جو لوگ صحیح راستہ چھوڑ کر غلط راہوں پر چل نکلے تھے جہنم کو ابھار کر ان کے سامنے لے آیا جائے گا۔ اس وقت وہ جہنم مستور ہے اس وقت بارز ہو جائے گی۔ وَ بُرِّزَتِ الْجَحِیْمُ لِمَنْ یَّسْرِی ۵ (۳۶/۷۹) اس کے لئے بارز ہو جائے گی جس کے پاس اسے دیکھنے کے لئے آنکھیں ہوں گی۔ اس وقت اُس جہنم کا اندازہ صرف علمی طور پر لگایا جاسکتا ہے۔ لیکن اس وقت یہ کیفیت ہوگی کہ

لَتَرَوُنَّ الْجَحِيمَ۔ تم اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گے۔ ثُمَّ لَتَرَوْهَا عَلَيْنَ الْيَقِينِ ۝ (۹-۱۲/۴) اور یوں تمہیں اس کے متعلق عین الیقین حاصل ہو جائے گا۔ یہی وجہ ہے جو کہا گیا ہے کہ اِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيطَةٌ بِالْكَافِرِينَ ۝ (۲۹/۹، ۲۹/۵۴) یہ حقیقت ہے کہ جہنم کفار کو اس وقت بھی ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ یہ اُسے نہیں دیکھتے لیکن وہ انہیں ہر وقت اپنی نگاہوں میں رکھتی ہے۔ وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَائِبِينَ (۸۲/۱۶) یہ اس کی نظروں سے اوجھل نہیں ہیں وہ ان کی گھات میں ہے (۸۱/۲۱) سورۃ الفجر میں ایک عظیم حقیقت کو ایک بڑے لطیف پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے۔ عام طور پر تو یہی کہا گیا ہے کہ مجرمین کو جہنم کی طرف لے جایا جائے گا۔ لیکن اس سورہ میں ہے وَجَاءَ يَوْمَئِذٍ بِجَهَنَّمَ (۸۹/۲۳) اس دن جہنم کو لایا جائے گا۔ یعنی جہنم خود آگے بڑھ کر انسان کو اپنے اندر دبوچ لے گی۔ اور جہنم ہی کیا۔ وہاں تو یہ بھی کہا گیا ہے کہ اُس دن

وَجَاءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ۝ (۸۹/۲۲)

تیرا رب اور ملائکہ صف در صف آئیں گے۔

اس سے محشر کے متعلق بڑی عظیم حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ یعنی وہ کوئی خاص مقام نہیں جہاں انسان جا کر جمع ہوں گے۔ خدا اور ملائکہ خود آئیں گے اور اسی طرح جہنم بھی لائی جائے گی۔ وَفِيهَا بَصَائِرُ لِقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ ۝



جہنم کی تفصیل

جہنم ہے تو انسان کی قلبی کیفیت کا نام۔ لیکن قرآن کریم کا انداز یہ ہے کہ وہ غیر محسوس، مجرد حقائق (ABSTRACT REALITIES) کو محسوس مثالوں سے سمجھاتا ہے تاکہ جہاں ارباب علم و بصیرت ان حقائق کو فکری طور پر سمجھیں، عام انسان اپنی ذہنی سطح کے مطابق ان کا اثر لے سکیں۔ یہ انداز بیان، بلند اور فروتر ذہنی سطح رکھنے والے دونوں طبقات کے لئے مفید ہوتا ہے۔ بلند فکری سطح کا انسان ان محسوس تمثیلات سے کیفیات کا اندازہ لگا سکتا ہے اور عام ذہنی سطح کے انسان ان سے عبرت و موعظت حاصل کر لیتے ہیں۔ اور یہی درحقیقت جنت اور جہنم کے متعلق تفصیلی بیانات سے مقصود ہے۔ ویسے بھی قرآن کریم انسانوں کی زبان میں نازل کیا گیا ہے اس لئے حقائق کی افہام و تفہیم کے لئے جو انداز انسانی دنیا میں اختیار کئے جاتے ہیں، قرآن کریم نے بھی وہی انداز و اسالیب اختیار کئے ہیں۔ ان محسوس تمثیلات کی رو سے، آگ میں جل جانے کی وجہ سے پیدا شدہ شدت درد کو مرکزی حقیقت دے کر باقی تفصیل کو اس مرکز کے گرد گردش دی گئی ہے یا کھیتی کی مثال سے ایسے عناصر کو سامنے لا کر جن سے فصلیں تباہ ہو جاتی ہیں یہ بتایا گیا ہے کہ انسان کی جو محنت، قوانین خداوندی کے مطابق نہیں ہوتی، وہ کس طرح رائیگاں چلی جاتی ہے۔ ہم ان آیات میں، قرآن کریم کے الفاظ اور ان کے لغوی معانی پیش کریں گے۔ ان کا مجازی مفہوم کیا ہے، اسے قارئین کے اپنے فہم پر چھوڑ دیں گے۔ (البتہ جو صاحب یہ دیکھنا چاہیں کہ میں نے ان کا مجازی مفہوم کیا سمجھا ہے وہ اس کے میری لغات القرآن یا مفہوم القرآن میں دیکھ سکتے ہیں)۔ اس تہبید کے بعد قرآن مجید کے الفاظ

میں جہنم کی تفصیل ملاحظہ کیجئے۔

آگ کے شعلے

سورہ تکویر میں ہے۔ وَ إِذَا الْجَحِيمُ سُعِدَتْ (۸۱/۱۲) جب جہنم کی آگ بھڑکائی جائے گی۔ کَلَّمَآ نَحَبَتْ يَرْذُلُهُمْ سَعِيرًا (۱۰/۹۰) جب اس کی آگ ذرا ٹھنڈی ہونے لگے گی تو اسے اور زیادہ تیز کر دیا جائے گا۔ وہ آگ اہل جہنم کے چہروں کو ٹھاس دے گی (۱۲۳/۱۰۴) اس کا دھواں اور شعلے ہر طرف سے محیط ہوں گے (۵۵/۳۵)۔ اِنَّهَا لَطَلٰ نَزَاعًا لِّلشَّوٰی طَلًا (۷۰/۱۶-۱۵) وہ شعلہ فگن آگ کلیجہ کو کھینچ کر نکال لے گی۔ اس کے دھوئیں کا سایہ تین شاخوں والا ہوگا جس سے کہیں جائے پناہ نہیں مل سکے گی۔ وہ اتنے اتنے بڑے شعلے پھینکے گی گویا وہ بلند عمارت ہیں یا زرد اونٹ (۷۷/۳۳-۳۰)۔ اس میں اہل جہنم کو ڈال کر اوپر سے بند کر دیا جائے گا (۹۰/۲۰)۔ اس کا نام ہاویہ ہے یعنی بھڑکتی ہوئی آگ (۱۱/۱۱-۹)۔ اس طرح ان کے اوپر اور نیچے سب آگ ہی آگ ہوگی (۳۹/۱۶)۔ وہ آگ کھالوں کو پگھلا دے گی۔ جب ان کی ایک جلد (کھال) جل جائے گی تو اس کی جگہ دوسری کھال بدل دی جائے گی اور اس طرح وہ مسلسل عذاب میں ماخوذ رہیں گے (۴/۵۶)۔ اہل جہنم کے کپڑے بھی آگ سے قطع کئے جائیں گے۔ ان کے سروں پر سے کھولتا ہوا پانی بہایا جائے گا۔ اس سے ان کی کھال اور انتڑیاں گل جائیں گی اور لوہے کے گرزوں سے ان کا کچھوڑ نکال دیا جائے گا (۲۲/۲۱-۱۹)۔

کھولتا ہوا پانی

جہنم کی قناتیں اور شامیانے چاروں طرف سے محیط ہوں گے۔ وہ پانی کے لئے واہلا مچائیں گے تو انہیں تلمچٹ جیسا پانی ملے گا جو ان کے منہ جھلا دے گا (۱۱۸/۲۹)۔ اس سے ان کی انتڑیاں کٹ جائیں گی۔ (۴۷/۱۵)۔ اس کھولتے ہوئے پانی سے بڑی الم انگیز اذیت پہنچے گی (۷۰/۴)۔ وہ اسے گھونٹ گھونٹ کر کے پئیں گے لیکن اس کے باوجود وہ حلق سے نیچے نہیں اترے گا (۱۴/۱۴)۔ ان کے چاروں طرف اسی قسم کا کھولتا ہوا پانی ہوگا (۵۵/۴۴)۔ اس کھولتے ہوئے پانی میں اُبلنا اور آگ میں جل جانا اس سے

ان کی تواضع ہوگی (۹۳-۵۶/۹۴)۔ اس کے ساتھ ہی جھلسا دینے والی لڑیاہ دھوئیں کے سائے، پینے کو وہ مشروب جو نہ ٹھنڈا ہو نہ نفع بخش (۲۱-۵۶/۲۵)۔ تھکے ماندے، ذلیل و خوار، جہنم کی آگ میں جھونکے جائیں گے اور کھولتے ہوئے چشمے سے انہیں پانی پلایا جائے گا (۲-۵۸/۵)۔

بعض مقامات میں کھیتی کی مثال سے سخت گرم اور سخت سرد پانی کا بھی ذکر ہے۔ پانی گرم ہو یا بہت ٹھنڈا، کھیتی دونوں سے جل جاتی ہے۔ اس لئے شدید گرم کے ساتھ سخت ٹھنڈا پانی بھی عذاب جہنم میں سے ہے۔ یعنی حَمِيمًا وَّ غَسَاقًا (۲۵/۷۸) ذ (۵۷/۳۸)۔

کھانے کو شجرۃ الزقوم

پینے کو اس قسم کا پانی اور کھانے کے لئے شجرۃ الزقوم۔ یہ عام طور پر ناگ بھین تھوہر کو کہتے ہیں، لیکن عرب محاورہ کی رو سے ہر تلخ اور سخت ناگوار شے کے لئے اس لفظ کا استعمال ہوتا تھا۔ سورۃ الصافات میں ہے کہ

یہ وہ درخت ہے جو جہنم کی جڑ سے اگتا ہے۔ اس کا خوشہ ایسا ہے جیسے ناگ بھین تھوہر ہو۔ اس سے اہل جہنم اپنا پیٹ بھر لیں گے اور اوپر سے کھولتا ہوا پانی پینے کو ملے گا (۶۴-۳۷/۶۷)۔

سورۃ الدخان میں ہے کہ

شجرۃ الزقوم کھانے کو ملے گا تو وہ پچھلے ہوئے تابنے کی طرح پیٹ میں کھولے گا۔ (منظر کچھ اس قسم کا ہو گا کہ) مجرم کو گھسیٹ کر عین دوزخ کے درمیان لایا جائے گا۔ اس کے سر پر کھولتا ہوا پانی انڈیلا جائے گا۔ شجرۃ الزقوم اس کے سامنے رکھا جائے گا اور اس سے کہا جائے گا کہ

اے چمک۔ تو اپنے آپ کو بہت بڑی قوت اور عزت کا مالک سمجھا کرتا تھا!

(۴۲-۴۴/۵۰)۔

وہ اسے نگلنا چاہیں گے تو وہ حلق میں اٹک جائے گا (۱۳/۷۳)۔ وہ کھانا کھا ہو گا، اسے جھاڑ کاٹنے ہوں گے جنہیں رومی سمجھ کر پھینک دیا جاتا ہے، وہ اسے طوعاً و کرہاً نگل تو لیں گے لیکن اس سے نہ

بھوک مٹے گی اور نہ ہی جسم کو توانائی اور فریبی حاصل ہوگی (۸۸/۷-۶)۔ یہ ہوگا اہل جہنم کا (تمثیلی) کھانا۔

جیل خانے کا سانقشہ

(جیسا کہ سابقہ عنوان میں بتایا جا چکا ہے، جہنم کا نقشہ ایسے کھینچا گیا ہے جیسے وہ نہایت صوبت انگیز اور اذیت رساں جیل خانہ ہو۔ جس طرح قیدی اپنے ”نمبروں“ سے پہچانے جاتے ہیں اسی طرح وہاں کے مجرم اپنی پیشانیوں سے پہچانے جائیں گے (۵۵/۴۱)۔ انہیں پیشانی کے بالوں اور پاؤں سے پکڑ کر گھسیٹا جائیگا (۵۵)۔ ان کی گردنوں میں طوق ڈالے جائیں گے اور پاؤں میں بیڑیاں (۴۱-۴۰/۷۲)؛ (۷۲/۴)۔ ان سب کو لمبی لمبی زنجیروں میں جکڑ دیا جائے گا (۳۱-۲۲/۷۹) اور اس طرح جکڑ کر انہیں تنگ و تاریک کوٹھڑیوں میں ڈال دیا جائے گا (۲۵/۱۳) اور لوہے کے بڑے بڑے گرزوں سے ان کی پٹائی ہوگی (۲۲/۲۱)۔

جہنم کے داروغے

جیل خانے کی طرح جہنم کے بھی داروغے ہوں گے۔ وہ بڑے پُر مہیت اور سخت گیر ہونگے (۶۶)۔ ایک چھوڑا، انیس انیس ہوں گے (۳۰-۴۴/۳۱)۔ اہل جہنم ان داروغوں سے درخواست کریں گے کہ ہماری سزا میں کچھ تخفیف کر دی جائے۔ وہ ان سے کہیں گے کہ کیا تمہارے پاس وہ پیامبر نہیں آئے تھے جنہوں نے تنبیہ کی تھی کہ اگر تم نے اپنی غلط روش کو نہ چھوڑا تو سخت عذاب میں مبتلا ہو جاؤ گے۔ وہ کہیں گے کہ ہاں! وہ آئے تو تھے۔ لیکن ہم نے ان کی بات نہیں مانی تھی (۵۰/۴۰)؛ (۸-۹/۷۷)۔ جہنم کے ہیڈ داروغہ کا نام ”مالک“ ہوگا۔ اہل جہنم عذاب کی سختیوں سے تنگ آکر اس سے کہیں گے کہ تم خدا کے حضور عرض کر دو کہ وہ تمہارا کام تمام کر دے تاکہ ہم اس عذاب سے چھٹکارا حاصل کر لیں۔ وہ کہے گا کہ اِنَّكُمْ مَّا كُنتُمْ (۴۴/۴۳) یہاں موت نہیں آسکتی، تمہیں اسی طرح بیڑیاں رگڑتے رہنا ہوگا۔ (یہ مایوسی کی انتہا ہے)۔

ذلت آمیز عذاب

عقوبات کی اس شدت اور سختی کے ساتھ، وہاں ذلت کا عذاب بھی ہوگا۔ وہ جہنم کی طرف

آئیں گے بھی تو اس انداز سے کہ خَشِيعِينَ مِنَ الذِّلِّ يَنْظُرُونَ مِنْ طَرْفٍ خَفِيٍّ ۝ (۴۵/۴۲) جھکی ہوئی نگاہیں اور کن انکھيوں سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے۔ وہ آگے قدم نہیں بڑھائیں گے تو انہیں منہ کے بل گھسیٹ کر جہنم میں داخل کیا جائے گا (۴۵/۴۲)۔ جس طرح قیدی ہونا بذاتِ خود بڑا ذلت آمیز ہوتا ہے اسی طرح جہنم میں داخل ہونا ہی ہزار رسوائیوں کا موجب ہوگا (۳۱/۱۹۱)؛ (۴۰/۴۰)۔ اسی لئے اسے عَذَابٌ مُہینٌ کہا گیا ہے (۴۵/۹۱)۔ یعنی رسوا کرنے والا عذاب۔ (نیز ۴۰/۳۹)۔

جہنم کے مختلف دروازے

جہنم کی نوعیتوں کے اعتبار سے جہنم میں داخل ہونے کے دروازے تو مختلف ہوں گے لیکن جہنم ایک ہی ہوگا۔ لَهَا سَبْعَةُ اَبْوَابٍ ۝ كُلِّ بَابٍ مِّنْهُمْ جُزْءٌ مَّقْشُورٌ ۝ (۴۳/۱۵) اس کے مختلف دروازے ہوں گے اور ہر دروازے کے لئے الگ الگ مجرم مختص کر دیئے جائیں گے۔ ان مجرمین سے کہا جائے گا کہ تم (اپنے اپنے) دروازے سے جہنم میں داخل ہو جاؤ (۲۹/۱۶)؛ (۳۹/۴۲)؛ (۴۰/۴۶)۔

چیخنا چلانا

اس جہنم کے عذاب میں ماخوذ ہو کر وہ اس طرح چیخیں چلائیں گے کہ وہاں کان پڑی آواز سنائی نہیں دے گی (۲۱/۱۰۰)۔ وہ وہاں تنگ آ کر موت کو پکاریں گے لیکن موت ان کی آواز کو نہیں سنے گی (۳۱-۲۵/۱۳)۔ خود جہنم بھی انہیں دیکھ کر جوش میں آجائے گا اور اس میں بڑا ہیبت انگیز شور برپا ہوگا (۴۶/۶)۔

جہنم کی وسعتوں کا یہ عالم ہوگا کہ اس سے پوچھا جائے گا کہ هَلِ امْتَلَأْتِ۔ کیا تو بھر گئی ہے۔ وَ تَقُولُ هَلْ مِنْ مَّزِيدٍ ۝ (۵۰/۳۰) تو وہ کہے گی کہ کیا اور مجرم بھی ہیں؟ اگر ہیں تو انہیں بھی ڈال دیجئے۔

اس عذاب سے محفوظ رہنے کی دعائیں

یہ ہے اس عذابِ جہنم کا تمثیلی بیان جس سے کسی کو کوئی نہیں بچا سکے گا۔ حتیٰ کہ خود نبی اکرم بھی نہیں۔

أَخْمَنُ حَقَّ عَلَيْهِ كَلِمَةُ الْعَذَابِ أَفَأَنْتَ تُنْقِذُ مَنْ فِي النَّارِ (۳۹/۱۹)
 جو خدا کے قانونِ مکانات کے مطابق عذاب کا مستوجب قرار پایا۔ اے رسول! کیا تو
 اسے اس سے بچا سکتا ہے؟

اسی لئے جماعتِ مومنین سے کہا گیا کہ قُوا أَنْفُسَكُمْ وَ أَهْلِيكُمْ نَارًا (۶۶/۶) اپنے آپ کو اور اپنے
 متعلقین کو عذابِ جہنم سے بچالے کی فکر کرو۔ اسی لئے ان (مومنین) کی ہر وقت یہ آرزو ہوتی ہے کہ
 رَقِنَا رَبَّنَا عَذَابَ النَّارِ (۲/۲۱) اے ہمارے نشوونما دینے والے! ہمیں عذابِ جہنم سے محفوظ رکھو
 انیز ۲/۱۵: ۳/۱۹۰) رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ قَطْعًا (۲۵/۶۵) عذابِ جہنم کا رخ ہم سے
 دوسری طرف پھیر دے۔ وہ ادھر کا رخ ہی نہ کرے۔ چونکہ مومنین کا حسنِ عمل کا پلڑا بھاری ہو گا اس لئے
 انہیں اس سے محفوظ رکھا جائے گا (۱۹/۴۱ - ۴۲) لَا يَمَسُّهُمْ السَّوْءُ وَلَا هُمْ يَخْزَوْنَ ۝
 (۳۹/۶۱) انہیں کوئی تکلیف مس تک نہیں کرے گی اور نہ ہی وہ غمگین اور آرزوہ خاطر ہوں گے۔ وَ وَفَّيْمُ
 عَذَابَ الْجَحِيمِ (۲۴/۵۶) اس لئے کہ خدا انہیں عذابِ جہنم سے محفوظ رکھے گا۔ (نیز ۵۲/۱۸)۔ اور یہ
 حقیقت ہے کہ جسے عذابِ جہنم سے محفوظ رکھا جائے وہی کامیاب و کامران ہے (۲/۱۸۴)۔ انہیں جہنم سے
 اتنی دور رکھا جائے گا کہ یہ اس کی سنسہٹ تک بھی نہیں سُن سکیں گے (۲۱/۱۰۲ - ۱۰۱)۔ یعنی وہ اس سے
 بالکل محفوظ رہیں گے۔ لہذا وہ جو تصور ہے کہ مجرمین کو جہنم میں داخل کیا جائے گا اور وہ جب اپنے جرائم کی
 سزا بھگت لیں گے تو انہیں جنت کی طرف منتقل کر دیا جائے گا، قرآنی تصور کے خلاف ہے۔ جو جنت کا سختی
 قرار پا چکا ہے اسے جہنم میں بھیجا ہی نہیں جاتا۔ (تفصیل اس کی ذرا آگے چل کر سامنے آئے گی)۔



جہنم کس کے لئے ہے

اب ہمارے سامنے یہ سوال آتا ہے کہ وہ کون لوگ ہیں جو عذابِ جہنم کے مستحق قرار پاتے ہیں یا یوں کہیے کہ وہ کونسے جرائم ہیں جن کا نتیجہ جہنم کا عذاب ہے۔ یہ سوال بڑا اہم ہے اور اسی لئے قرآن کریم نے بڑی تفصیل سے اس کا جواب دیا ہے۔ یہ اس لئے کہ ہر شخص کو نہایت وضاحت سے معلوم ہو جائے کہ کس کس قسم کے کام انسان کو جہنم کا مستوجب بنا دیتے ہیں تاکہ وہ ان سے بچتا رہے۔ اگر ضابطہ خداوندی میں اس کی تصریح نہ کی جائے تو ملزم کے لئے اتمامِ حجت نہیں ہو سکتا۔ قرآن کریم میں بعض مقامات پر خود ان جرائم کا ذکر آیا ہے جن کا نتیجہ عذابِ جہنم ہوتا ہے لیکن بیشتر انسانوں کی ان شقوں (CATEGORIES) کا ذکر کیا ہے جو جہنم میں جائیں گے۔ یہ اسی طرح ہے جیسے ضابطہ تعزیرات میں کہیں یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ بغاوت کی سزا موت ہے اور کہیں یہ کہہ باغیوں کو قتل کر دیا جائے گا۔

صاحب اختیار و ارادہ انسان

انسان اور دیگر اشیا کے کائنات میں (جن میں تمام ذی حیات شامل ہیں) بنیادی فرق یہ ہے کہ انسان کو اختیار و ارادہ دیا گیا ہے اور دیگر مخلوقات مجبور پیدا کی گئی ہیں۔ یہ وجہ ہے کہ وہ مخلوق ان قوانین کی خلاف ورزی نہیں کرتی۔ (کیونکہ وہ ایسا کر ہی نہیں سکتی) جس کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لئے اسے پیدا کیا گیا۔ لیکن انسان کو اس کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ جس روش کو چاہے

اختیار کر لے۔ اس کا صاحب اختیار و ارادہ ہونا ہی اسے اس کے اعمال کا ذمہ دار ٹھہرتا ہے اور اسی ذمہ داری کی وجہ سے جزا اور سزا (یعنی نتائج اعمال) کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ اگر یہ بھی دیگر اشیائے کائنات کی طرح ایک ہی روش پر چلنے کے لئے مجبور پیدا کیا جاتا تو اس کے لئے نہ غلط اور صحیح کا سوال پیدا ہوتا نہ جنت اور جہنم کی تفریق۔ اس حقیقت کو قرآن کریم نے متعدد مقامات میں، متنوع انداز سے واضح کیا ہے۔ (مثلاً سورہ ہود میں ہے۔ **وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ أُمَّةً وَاحِدَةً**۔ اگر تیرے نشوونما دینے والے کی مشیت ایسی ہوتی تو انسانوں کو پیدا ہی اس طرح کرتا کہ یہ سب ایک ہی روش پر چلتے۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے انسان کو راستے کے انتخاب کا اختیار دیا ہے۔ اس کا نتیجہ ہے کہ **وَلَا يَزَالُونَ مُخْتَلِفِينَ**۔ ان میں ہمیشہ اختلاف رہتا ہے۔ کوئی ایک روش پر چلتا، کوئی دوسری پر۔ **إِلَّا مَن رَّحِمَ رَبُّكَ** البتہ وہ گروہ جو قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے ان میں باہمی اختلاف نہیں ہوتا۔ **وَلِذَلِكَ خَلَقَهُمْ** انسان کے پیدا کئے جانے کا مقصد ہی یہ تھا کہ وہ اپنے اختیار و ارادہ سے صحیح راستہ اختیار کرے۔ **وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ** **لَا مُلْتَمَازَ لَهُمْ** **جَهَنَّمَ** **مِنَ الْجِنَّةِ وَ النَّاسِ أَجْمَعِينَ** ۵ (۱۱۸-۱۱۹/۱۱) خدا کا یہی قانون تخلیقِ انسانی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ انسانوں سے جہنم بھرا جائے گا۔ یعنی جو اپنے اختیار و ارادہ سے غلط راستہ منتخب کریں گے وہ جہنم میں جائیں گے۔

دوسرے مقام پر ہے۔ **وَلَوْ شِئْنَا لَآتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدًى**۔ اگر ہماری مشیت ہوتی تو ہم بھلا بھی کر سکتے کہ ہر انسان سیدھے راستے پر چلتا۔ لیکن اس سے اس کا اختیار و ارادہ سلب ہو جاتا۔ اس لئے ہم نے ایسا نہیں کیا اور اسے اپنے لئے آپ راستہ منتخب کرنے کا اختیار دے دیا۔ اپنے اس اختیار و ارادہ کے غلط استعمال سے انسان اپنے لئے جہنم تیار کرتا رہتا ہے (۱۳۲/۱۳)۔ خدا نے اپنی وحی کے ذریعے (حضرات انبیائے کرام کی وساطت سے) بتا دیا کہ غلط راستہ کون سا ہے اور صحیح کون سا۔ اس کے بعد اسے انسانوں کے اپنے فیصلے پر چھوڑ دیا کہ وہ جو سارا راستہ جی چاہے اختیار کر لیں۔ اسی لئے نئی اکرام سے کہا گیا کہ **إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ بِالْحَقِّ بَشِيرًا وَ نَذِيرًا** **وَلَا تُسْأَلُ عَنْ أَصْحَابِ الْجَحِيمِ** (۲/۱۱۹) ہم نے تجھے اس مقصد کے لئے بھیجا ہے کہ تو لوگوں کو بتا دے کہ صحیح راستہ پر چلنے سے کونسے خوشگوار نتائج سامنے آئیں گے اور غلط راستے پر چلنے کے تباہ کن نتائج کیسے ہونگے۔ اس کے

بعد تمہاری ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے۔ اس کی باز پرس خود انسان سے ہوگی کہ اس نے غلط راستہ کیوں اختیار کیا تھا۔

۲۔ فلسفہ کی دنیا میں ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ انسان کی فطرت بد واقعہ ہوئی ہے اس لئے وہ غلط راستے پر چلتا ہے۔ یہ نظریہ دراصل عیسائیت کے اس عقیدہ کا پیدا کردہ ہے کہ ہر انسانی بچہ، اپنے اولیں ماں باپ (آدم و حوا) کے گناہ کا بوجھ اپنی کمر پر لا دے دنیا میں آتا ہے اور گناہ کا یہ دھبہ کسی طرح مٹ ہی نہیں سکتا۔ بجز اس کے کہ وہ حضرت مسیحؑ کے کفارہ پر ایمان لائے۔ فلسفہ کا وہ نظریہ ہوا عیسائیت کا یہ عقیدہ دونوں کا ماحصل یہ ہے کہ انسان میں اس کی صلاحیت ہی نہیں کہ وہ غلط راستے سے بچ سکے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ انسان بھی دیگر اشیائے کائنات کی طرح مجبور پیدا کیا گیا ہے اور انسان غلط راستے پر چلنے کے لئے مجبور۔ شہر آن کریم نے اس غلط تصور کی بڑی شدت سے تردید کی۔ اس نے کہا کہ انسان کو کچھ امکانی صلاحیتیں عطا کی گئی ہیں اور یہ اس کے اپنے اختیار کی بات ہے کہ وہ ان صلاحیتوں کو کس طرح استعمال کرتا ہے۔ جب وہ ان کا غلط استعمال کرتا ہے تو اسے "ابلیسی تحریک" کہا جاتا ہے۔ لیکن انسان اس تحریک کے سامنے بے بس نہیں۔ وہ اس پر قابو پا سکتا ہے۔ قرآن کریم نے متعدد مقامات پر، ابلیس و آدم کی تمثیلی داستان کے انداز میں اس حقیقت کو نمایاں کیا ہے اور ہر مقام پر اس ابلیسی چیلنج کے جواب میں کہ میں ابن آدم کو غلط راستے پر ڈال دوں گا، بڑی تحدی کے ساتھ کہا گیا ہے کہ **إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ** (۱۷/۶۵) تیرے جی میں جو آئے کر کے دیکھ لے۔ میرے بندوں پر تیرا کوئی زور نہیں چل سکے گا۔ لیکن جو اپنی مرضی سے تیرے پیچھے چلیں گے ان سے جہنم بھرا جائے گا (۳۸/۸۵ i ۴۲-۴۳/۱۵)۔

لہذا جہنم ان کے لئے ہے جو اپنے اختیار و ارادہ سے غلط راستہ اختیار کریں۔ جس کام میں انسان کا ارادہ اور فیصلہ شامل نہ ہو اس کی اس پر ذمہ داری عائد نہیں کی جاسکتی اور جس کام کے لئے کوئی ذمہ داری ہی نہ ہو اس کی سزا یا جزا کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

عقل و فکر سے کام نہ لینے والے

پاگل کو اس کے کسی کام پر قابل مواخذہ قرار نہیں دیا جاتا۔ اس لئے کہ جس میں سمجھنے سوچنے کی

صلاحیت ہی نہ ہو اسے اس کے کسی عمل کا ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ لیکن جس شخص میں سمجھنے سوچنے کی صلاحیت موجود ہو لیکن وہ عقل و فکر سے کام نہ لے اور اپنے جذبات سے مغلوب ہو کر قانون شکنی کرے تو اسے مجرم قرار دیا جاتا ہے۔ اسی طرح جو شخص اپنی عقل و فکر سے کام نہ لے بلکہ دوسروں کی تقلید میں غلط قدم اٹھائے وہ بھی سزا کا مستحق قرار پاتا ہے۔ قرآن کریم نے واضح الفاظ میں بتایا ہے کہ جو لوگ اپنی عقل و فکر سے کام نہ لیں وہ جہنم میں جاتے ہیں۔ سورۃ اعراف میں ہے کہ

ایسے لوگ جو دل و دماغ رکھنے کے باوجود ان سے سمجھنے سوچنے کا کام نہ لیں۔ جو آنکھیں رکھنے کے باوجود راستہ دیکھ کر نہ چلیں۔ جو کان رکھنے کے باوجود دوسرے کی بات نہ سُنیں۔ ان کی یہ کیفیت زبانِ حال سے پکار پکار کر کہتی ہے کہ یہ جہنم میں جانے والی مخلوق ہے انہوں نے انسان ہونے کے باوجود اپنے آپ کو حیوانی سطح پر رکھ چھوڑا ہے بلکہ ان کی حالت حیوانات سے بھی بدتر ہے۔ حیوانات میں سمجھنے سوچنے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ یہ اس صلاحیت کے باوجود مدہوشی کی زندگی بسر کرتے رہتے ہیں (۱۶/۹۱)۔

یہ لوگ جو دنیا میں سماعت، بصارت اور قلبِ سلیم سے کام نہیں لیتے، قیامت کے دن اندھے بہرے گوئیں گے اٹھائے جائیں گے (۱۶/۹۱)۔ ان سے کہا جائے گا کہ تم جہنم میں اس لئے جا رہے ہو کہ تم نے عقل و فکر سے کام نہ لیا (۳۹/۶۲) سورۃ الملک میں اس حقیقت کو بڑے بصیرت افروز انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ کہا گیا ہے کہ جب یہ لوگ جہنم میں داخل ہوں گے تو جہنم کے داروغے ان سے پوچھیں گے کہ کیا تمہارے پاس خدا کے پیغام بر نہیں آئے تھے جو تمہیں غلط اور صحیح راستے میں خطا اختیار کھینچ کر بتا دیتے؟ وہ کہیں گے کہ ہاں آئے تھے! تو وہ کہیں گے کہ پھر کیا ہوا کہ تم جہنم میں آ گئے۔ وہ جواب دیں گے کہ لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ أَوْ نَعْقِلُ لَرَّيْنَا أَصْحَابَ السَّعِيرِ (۱۰/۶۴)۔ اگر ہم ان کی بات توجہ سے سنتے یا عقل و فکر سے کام لیتے تو ہمارا شمار اہل جہنم میں نہ ہوتا۔

لہذا جہنم ان کا ٹھکانا ہے جو سمجھنے سوچنے کی صلاحیت رکھنے کے باوجود عقل و فکر سے کام نہیں لیتے۔ انہی میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو مذہبی پیشواؤں یا سیاسی لیڈروں کے پیچھے آنکھیں بند کئے چلے جاتے ہیں۔ چنانچہ سورۃ احزاب میں ہے کہ اہل جہنم کہیں گے کہ رَبَّنَا اِنَّا اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَ كُبَرَاءَنَا فَاصْلُوْنَا السَّبِيلَ (۳۳/۶۷) اے ہمارے نشوونما دینے والے! ہم اپنے لیڈروں

اور عزت مآب مذہبی پیشواؤں کی اطاعت کرتے رہے اور انہوں نے ہمیں صحیح راستے سے بھٹکا دیا۔ اس آگے ہے کہ وہ خدا سے درخواست کریں گے کہ ان لیڈروں اور راہنماؤں کو دوبرا عذاب دیا جائے۔ ایک تو ان کی اپنی گمراہی کی وجہ سے اور دوسرا اس لئے کہ وہ اوروں کو بھی گمراہ کرتے تھے (۳۲/۶۸)۔ سورۃ الضحٰی میں اہل جہنم کے متعلق ہے کہ اِنَّهُمْ اَلْفَوْا اٰبَاءَهُمْ ضَالِّیْنَ ۙ فَهُمْ عَلٰی اٰثَرِهِمْ یُفْرِعُونَ ۝ (۳۴/۶۰-۶۱) یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے آباء و اجداد کو جس غلط روش پر چلتے دیکھا اس پر یہ خود سرپٹ بھاگتے چلے گئے۔ کہیں کھڑے ہو کر سوچا ہی نہیں کہ ہم بالآخر جا کدھر رہے ہیں۔

لہذا جہنم ان لوگوں کا ستقر ہے جو عقل و فکر سے کام نہیں لیتے۔ یا تو اپنی مفاد پرستیوں کے جذبات سے مغلوب ہو کر غلط راہوں پر چلتے رہے ہیں اور یا اپنے مذہبی پیشواؤں کی تقلید میں آنکھیں بند کر کے اسلاف کے نقوش قدم کا اتباع کرتے چلے جاتے ہیں۔ یہ بھی درحقیقت جذبات پرستی ہی کا دوسرا نام ہے اس لئے کہ اندھی عقیدت انسانی جذبات ہی کی پیدا کردہ ہوتی ہے عقل و فکر کی نہیں۔ قرآن ہر فرد سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ وحی کی روشنی میں عقل و فکر سے کام لے کر اپنے لئے راستے کا انتخاب خود کرے۔ یہ مذہبی پیشوا جو (قرآن کے الفاظ میں) دنیاوی مفاد حاصل کرنے کے لئے اپنی ایک (TRADE UNION) سی بنا لیتے ہیں خود بھی جہنم میں جائیں گے اس لئے ان کے پیچھے چلنے والے کس طرح جنت میں جاسکتے ہیں؟

جذبات کے تابع چلنے والے

انسان کے لئے صحیح روش زندگی یہ ہے کہ اپنے جذبات کو عقل کے تابع رکھے اور عقل سے وحی خداوندی کی روشنی میں کام لے۔ لیکن جو لوگ اپنے جذبات کی تسکین ہی مقصد زندگی قرار دے لیں ان کے جہنمی ہونے میں شبہ کیا رہ سکتا ہے! قرآن کریم نے انسان کے سرکش جذبات یا اس عقل کو جو جذبات کے تابع رہے شیطان یا ابلیس کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے اور شیطان یا ابلیس کا اتباع کرنے والوں کو اہل جہنم قرار دیا ہے۔ (قصۃ ابلیس و آدم میں) ابلیس سے کہا گیا ہے کہ لَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ لَآ مَلٰئِئَۃٌ جَہَنَّمَ مِنْکُمْ اَجْمَعِیْنَ ۝ (۷۱/۸) ان (انسانوں) میں سے جو کبھی تیرا اتباع کریں گے ان سب سے جہنم بھر دیا جائے گا۔ (نیز ۳۳/۵۱ : ۲-۲۲ : ۳۸/۵۸) — اپنی میں وہ

لوگ بھی شامل ہیں کہ اِذَا قِيلَ لَهُمْ اتَّبِعُوا مَا أَنْزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا۔ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ خدا نے نازل کیا ہے (یعنی شُرَآنِ کریم) اس کا اتباع کرو تو وہ کہتے ہیں کہ نہیں! ہم تو اپنے اسلاف کے رستے پر چلتے جائیں گے۔ اس کے بعد ہے۔ اَوَلَوْ كَانَ الشَّيْطَانُ يَدْعُوهُمْ إِلَىٰ عَذَابِ السَّعِيرِ (۳۱/۲۱) یعنی خواہ شیطان انہیں جہنم کے عذاب کی طرف ہی کیوں نہ بلارہا ہو یہ اس کے پیچھے چلیں گے۔ حالانکہ انہیں متنبہ کر دیا گیا تھا کہ شیطان تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔ یہ تمہیں جہنم میں پہنچا دے گا (۳۵/۶)۔ سورۃ یٰس میں اس تنبیہ (WARNING) کو ”بنی آدم کے عہد“ سے تعبیر کیا گیا ہے ۴۰۱-۳۶۴/۶۴۔

انہی شیطانیں میں وہ سرغنے بھی شامل ہیں جو لوگوں کو غلط کاموں پر اکساتے ہیں اور جب گرفت کا موقع آتا ہے تو اپنے آپ کو صاف بری الذمہ قرار دے کر الگ ہو جاتے ہیں۔ ایسے لوگ دنیاوی عدالتوں میں تو شاید بے گناہ قرار پا جائیں، لیکن عدالتِ خداوندی میں ان کا شکار بھڑین میں ہی ہوگا۔ اسی لئے انہیں اور ان کے ساتھ ان لوگوں کو جنہوں نے ان کا کہا مانا تھا سب کو مستحقِ جہنم قرار دیا گیا ہے (۳۲/۲۲)۔ نیز (۱۹/۶۸) اور انہیں بھی جو روحانی تقدس کا جال بچھا کر ”آسمان کی خبریں“ لانے کے دعویدار بنتے اور اٹھکیں دوڑا دوڑا کر اپنے کشف و کرامات کا رعب گانٹھتے رہتے ہیں (۶۶/۵)۔

حیاتِ اخروی کا مُنکر، جہنم میں

دین کا مدار قانونِ مکافاتِ عمل پر ہے۔ یعنی اس اصول پر کہ جو انسان تعمیری کام کرے گا اس کی ذات اس قدر نشوونما حاصل کر لے گی جس سے وہ اس زندگی کے بعد آئندہ زندگی کے ارتقائی مراحل طے کرنے کے قابل ہو جائے۔ جس کا تعمیری کاموں کا پتلا ہلکا ہوگا، اس کی ذات آگے نہیں بڑھ سکے گی۔ اسے جہنم کی زندگی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جو شخص انسانی ذات اور اس کے مستقبل (یعنی حیاتِ آخرت) ہی کو تسلیم نہ کرے، اس کی ذات کی نشوونما کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لہذا، ان لوگوں کے اہلِ جہنم ہونے میں کلام کیا ہو سکتا ہے۔ شُرَآنِ کریم نے متعدد مقامات میں کہا ہے کہ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے وہ اہلِ جہنم ہیں سے ہیں۔ حیوان اور انسان میں بنیادی فرق یہ ہے کہ حیوان کی زندگی، محض طبعی زندگی (PHYSICAL LIFE) ہوتی ہے جو موت کے ساتھ ختم

ہو جاتی ہے اور انسان کی زندگی موت کے بعد بھی آگے چلتی ہے۔ لہذا جو شخص تسلسل حیات کا قائل نہیں وہ انسان اور حیوان میں فرق نہیں کرتا۔ وہ حیوانی سطح پر زندگی بسر کرتا ہے۔ لیکن اس کے تسلسل حیات کو تسلیم نہ کرنے کے یہ معنی نہیں کہ اس کی زندگی کا خاتمہ بھی موت کے ساتھ ہو جاتا ہے۔ یہ اسے تسلیم کرے یا نہ کرے اس کی زندگی آگے چلے گی اور اس کا ٹھکانہ جہنم ہوگا۔ اس لئے کہا گیا کہ

وَالَّذِينَ كَفَرُوا يَتَمَتَّعُونَ وَيَأْكُلُونَ كَمَا تَأْكُلُ الْأَنْعَامُ ۚ جَوْلُوكَ تَسْلُسِلِ حَيَاتِ كِي حَقِيقَتِ كُو تَسْلِيمِ نَہِی كرتے، وہ حیوانی سطح پر زندگی بسر کر کے مر جاتے ہیں۔ لیکن اس طرح ان کی زندگی کا خاتمہ نہیں ہو جاتا۔ وَ النَّارُ مَثْوًى لِّهُمُ ۚ (۱۴/۱۲) ان کا ٹھکانہ جہنم ہوگا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ

ءَاِذَا كُنَّا تُرَابًا ؕ اِنَّا لَفِیْ خَلْقٍ جَدِیْدٍ ۚ کہ جب ہم مگر مٹی میں مل جائیں گے تو کیا اس کے بعد ہمیں پھر نئی زندگی ملے گی۔ کہا کہ اُولَٰئِكَ اَصْحَابُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خَالِدُوْنَ (۱۳/۵) ان لوگوں کا آل جہنم کی زندگی ہوگا۔ یہ لوگ دنیاوی زندگی ہی کو منتہائے حیات سمجھتے تھے اور اس پر مطمئن ہو کر بیٹھ گئے تھے۔ ان کے غلط کاموں کی وجہ سے ان کا ٹھکانہ جہنم ہوگا (۱۱/۴) اِنَّهُمْ كَاذِبُوْنَ لَا یُؤْخَذُوْنَ حِسَابًا ؕ (۷۸/۲۷) یہ سمجھتے تھے کہ جو کچھ ہمارے جی میں آئے ہم کریں ہمیں کوئی پوچھنے والا نہیں۔ چونکہ دنیاوی زندگی میں انسانی کوششوں کے نتائج طبعی قوانین کے مطابق مرتب ہوتے ہیں اس لئے اس میں حیات بالآخرت پر ایمان رکھنے والوں اور اس سے انکار کرنے والوں میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ اس لئے انہیں متاع دنیا قول جاتی ہے لیکن اُخروی زندگی میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ لیکن یہ متاع دنیا کتنی ہی کثیر کیوں نہ ہو، متاع آخرت کے مقابلہ میں بہر حال حقیر و قلیل ہوتی ہے، کیونکہ دنیا کی زندگی مختصر ہے اور اس کے بعد کی زندگی کے ارتقائی مراحل بے شمار۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے کہا ہے کہ زندگی کہلانے کی سختی وہی زندگی ہے (۲۹/۶۳)۔ لہذا جس کا متاع آخرت میں حصہ نہ ہو اس کے جہنمی ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔ سورۃ آل عمران میں ہے کہ ان لوگوں کا جو حق و صداقت سے انکار کرتے ہیں دنیاوی زندگی میں اقتدار تمہیں دھوکے میں نہ ڈال دے۔ مَتَاعٌ قَلِیْلٌ ۚ ثُمَّ مَا وَكَلَهُمْ جَهَنَّمَ ؕ وَ یُخْسِ الْاِمْتِٰازُ (۳/۱۹۶)؛ (۲/۱۲۶) یہ متاع بڑی ہیچ مقدار ہے۔ اس کے بعد ان کا مستقر جہنم ہے جو بہت بڑا مقام ہے۔ سورۃ بنی اسرائیل میں ہے کہ جو لوگ اس دنیا کے مفاد عاجلہ ہی کو مقصود و حیات قرار دے لیتے ہیں انہیں یہ مفاد مل جاتے ہیں۔ ثُمَّ جَعَلْنَا لَہٗ جَهَنَّمَ (۱۷/۱۸) لیکن اس کے بعد ان

کا ٹھکانہ جہنم ہوتا ہے۔ (نیز ۱۵-۱۱/۱۶) (۱۱/۸۱)۔ سورۃ احقاف میں ہے کہ یہ لوگ (آخرت میں) کہیں گے کہ ہمیں یہاں کی آسائشوں اور خوشگوار یوں سے کیوں محروم رکھا جا رہا ہے، تو ان سے جواب میں کہا جائے گا کہ اَذْهَبْتُمْ طَيْبَاتِكُمْ فِي حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا (۲۱/۴۶) تم نے آسائشوں اور نعمتوں کا اپنا سارا حصہ دنیاوی زندگی میں صرف کر لیا تھا اس لئے اب یہاں جہنم کا رسوا کن عذاب ہو گا۔ اس کو سورۃ کہف میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ الَّذِينَ صَلَّيْ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا (۱۸/۱۰۳) یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنی تمام تنگ و تار متاع دنیا حاصل کرنے میں ضائع کر دی اس لئے قیامت کے دن ان کے لئے میزان تک کھڑی نہیں کی جائے گی (۱۸/۱۰۵)۔ انہوں نے حیات دنیا کو آخرت پر ترجیح دی تھی (۴۹/۳۸)۔ یعنی متاع دنیا کا حصول بجائے خوش معیوب نہیں، لیکن جب اس کے حصول اور کسی مستقل قدر میں تصادم ہو جائے تو اس وقت جو شخص متاع دنیاوی کو ترجیح دیتا ہے اور مستقل قدر کو چھوڑ دیتا ہے اس کا درحقیقت حیات آخرت پر ایمان نہیں ہوتا۔ یہ وہ ہیں جو "آخرت کو دے کر دنیا خرید لیتے ہیں" (۲/۱۷۵)۔ ان کی نشوونما رک جاتی ہے اور اس کا نام جہنم ہے (۲/۱۷۵)۔ (۳/۷۶)

خَفَّتْ مَوَازِينُ

لیکن جو لوگ حیات آخرت کو تسلیم کرنے کے باوجود قوانین شکنی کرتے رہتے ہیں ان کی صورت میں یہ دیکھا جائے گا کہ ان کا تعمیری اعمال کا پلڑا بھاری ہے یا تخریبی اعمال کا۔ اگر تخریبی اعمال کا پلڑا بھاری ہو گا تو وہ اہل جہنم میں سے ہوں گے۔ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنْفُسَهُمْ فِي جَهَنَّمَ خَالِدُونَ (۲۳/۱۰۳) ذ ۸-۹ (۱۰۱/۹)۔

مختلف اقسام

مندرجہ بالا اصولی شقوں کے علاوہ، قرآن کریم نے اہل جہنم کی مختلف اقسام کا ذکر کیا ہے۔ مثلاً (۱) کفار یعنی جو مستقل اقدار خداوندی کو تسلیم ہی نہیں کرتے۔ ان میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو صحیح اسلامی نظام کی مخالفت کرتے اور اس سے سرکشی

برتتے ہیں۔

(۲) مشرکین

جو خدائی اقتدار و اختیار میں غیر خداوندی قوتوں کو بھی شریک کر لیتے ہیں۔
قوانین خداوندی کے ساتھ انسانوں کے وضع کردہ قوانین کی بھی اطاعت کرتے ہیں۔

(۳) مکذبین

جو دجی کی عطا کردہ مستقل اقدار کو جھوٹا ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔
ان میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو زبان سے ان اقدار کو تسلیم تو کرتے ہیں
لیکن اپنے اعمال سے ان کی تکذیب کرتے ہیں۔

(۴) مرتدین

جو ان اقدار کی صداقت کو تسلیم کر لینے کے بعد پھر ان سے انکار کر کے کفر کی راہ
اختیار کر لیں۔ ان میں اور کفار میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ حتیٰ کہ وہ لوگ جو
مسلمان کہلاتے ہوئے بعض امور میں کفار کا اتباع کریں وہ بھی مرتدین کے
زمرہ میں شامل ہوتے ہیں (۴۷/۲۵)۔

(۵) منافقین

جو دل سے ان کی صداقت کو تسلیم نہیں کرتے لیکن بر بنائے مصلحت جماعت
مومنین میں شریک ہوئے رہتے ہیں۔

(۶) مجرمین

جو قوانین خداوندی کی خلاف ورزی کریں۔ انہیں ”ظالمین“ بھی کہا گیا ہے۔
نیز فاسقین اور فجار بھی۔ ان قوانین سے اعراض برتنے والے بھی انہی میں
شامل ہیں۔

قرآن کریم میں ان تمام اقسام کے متعلق بے شمار آیات ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ یہ اہل جہنم ہیں سے ہیں۔
عدم گنجائش کی بنا پر ان آیات کا استیعاب مشکل ہے۔ اس لئے ان میں سے ایک ایک دود آیات پر
ہی اکتفا کیا جائے گا۔ البتہ جرائم کے سلسلہ میں ذرا تفصیل سے بتایا جائے گا کہ ان کی نوعیت کیا ہے،
(تاکہ ہم اپنی حالت کا جائزہ لے کر دیکھ لیں کہ ہم کون کون سے جرائم کا ارتکاب کر رہے ہیں)۔



کافرین کے لئے جہنم

سورہ بنی اسرائیل میں ہے۔ وَ جَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكَافِرِينَ حَصِيرًا (۱۷/۸) اور ہم نے

کفار کو محصور کرنے کے لئے جہنم بنایا ہے۔ سورۃ یٰس میں ہے کہ کفار سے کہا جائے گا کہ یہ وہ جہنم ہے جس سے تمہیں متنبہ کیا جاتا تھا۔ اِصْلَوْهَا الْيَوْمَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ ۝ (۳۴/۶۳) تم اپنے کفر کی وجہ سے اس میں داخل ہو جاؤ۔ سورۃ فاطر میں ہے۔ وَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَهُمْ نَارُ جَهَنَّمَ ۚ (۳۵/۳۶) جو لوگ کفر کرتے ہیں ان کے لئے جہنم کی آگ ہے۔

واضح رہے کہ قرآن کریم نے وضاحت سے بتا دیا ہے کہ اجزائے ایمان کیا ہیں اور ان سے انکار کا نام کفر ہے۔ ایمان کے متعلق سورۃ بقرہ میں ہے۔

وَلِكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ الْمَلَائِكَةِ وَ الْكِتٰبِ
وَ النَّبِيِّنَ ۚ (۲/۱۷۷)

کشاہد کی راہ اس کے لئے ہے جو ایمان لائے اللہ پر آخرت پر ملائکہ پر اور نبیوں پر۔ دوسری جگہ ہے۔

وَمَنْ يَكْفُرْ بِاللّٰهِ وَ مَلَائِكَتِهِ وَ كُتُبِهِ وَ رُسُلِهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ
فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِيْدًا ۝ (۳۱/۳۶)

جس نے اللہ، ملائکہ، کتب، رسل اور یوم آخرت سے انکار کیا وہ بہت بڑی گمراہی میں جا پڑا۔

ایمان کے متعلق اس کی بھی تصریح کر دی کہ اس سے یہ مطلب نہیں کہ اللہ، کتب، رسل، ملائکہ اور آخرت کے متعلق کوئی جس قسم کا تصور بھی چاہے رکھے اسے اس کا ایمان سمجھ لیا جائے گا۔ بالکل نہیں۔ اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَا اٰمَنُتُمْ بِهِ فَقَدْ اٰهْتَدُوْا ۚ (۲/۱۳۷) اگر یہ لوگ اس طرح ایمان لائیں جس طرح تم ایمان لائے ہو تو پھر سمجھا جائے گا کہ یہ صحیح راستے پر آگئے۔ ورنہ نہیں یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم (اور تو اور) اہل کتاب (یہود و نصاریٰ وغیرہ) کو بھی مومن باللہ تسلیم نہیں کرتا۔ ایمان کے لئے بِمَا نُنَزِّلُ عَلٰی مُحَمَّدٍ ۚ (۲۴/۳) جو کچھ محمد پر نازل کیا گیا ہے اس پر ایمان لانا بنیادی شرط ہے۔

ارتداد

جو شخص ایمان لانے کے بعد پھر کفر اختیار کر لیتا ہے اس کا سابقہ ایمان اسے کچھ فائدہ نہیں دیتا۔

وہ بھی کفار کی طرح) اہل جہنم میں شمار کیا جاتا ہے (۲/۲۱۷)۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، مسلمان کہلا کر بعض امور میں کفار کا اتباع کرنا بھی ارتداد ہے (۲۶/۲۶)۔

مشرکین

سورۃ میں ہے۔ **نَ الَّذِیْ جَعَلَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَاَلْقِیْہُ فِی الْعَذَابِ الشَّدِیْدِ** (۵۰/۲۶) ”جو خدا کے ساتھ کسی اور کو بھی صاحبِ اقتدار سمجھتا ہے، اسے جہنم کے عذاب شدید میں ماخوذ کر دو“۔ انہی کو مشرک کہتے ہیں اور **وَ فِی النَّارِ هُمْ خَالِدُونَ** (۹/۱۷) ان کا ٹھکانہ جہنم ہے۔

واضح رہے کہ مشرک وہی نہیں جو بتوں کی پرستش کرتے ہیں۔ جو بھی قوانین خداوندی کے ساتھ (جو شرانِ کریم میں مذکور ہیں) انسانوں کے خود ساختہ قوانین کی اطاعت کرتا ہے، وہ مشرک کرتا ہے۔ حتیٰ کہ دین میں فرقے پیدا کرنے والے بھی مشرک ہیں (۳۰/۳۱)۔ عیسائیوں کے متعلق قرآن کریم نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ ”جو لوگ سچ کو خدا کا بیٹا کہتے ہیں یا تثلیث کے قائل ہیں، وہ کفر بھی کرتے ہیں اور مشرک بھی“ ان پر جنت حرام ہے۔ **وَمَا ذُوہُ النَّارُ** (۵/۷۳) اور ان کا ٹھکانہ جہنم ہے۔ وہ تمام اہل کتاب اور کفار اور مشرکین کو ایک ہی زمرے میں شمار کرتا ہے (۹۸/۶)۔ شرک تو ایسا جرمِ عظیم ہے جس کی رو سے آئی ہوئی تباہی سے حفاظت کا سامان ہی نہیں مل سکتا۔ **اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ** (۴/۱۱۶)۔

واضح رہے کہ مشرکانہ رسوم ادا کرنے والوں کا شمار بھی مشرکین ہی میں ہوتا ہے اور وہ بھی جہنم کے سزاوار ہوتے ہیں (۴/۱۲۱)۔

جب مشرک ایسا جرمِ عظیم ہے تو جو لوگ خود خدا بن بیٹھیں ان کے اہل جہنم ہونے میں کیا کلام ہو سکتا ہے (۲۱/۲۹)۔ یہ بھی جہنم میں اور ان کے پرستار بھی جہنم میں (۲۱/۹۸)۔

مکذبین کیلئے جہنم

سورۃ طور میں ہے ”اس دن مکذبین کے لئے بڑی تباہی ہوگی جب انہیں جہنم کی طرف

بلایا جائے گا اور کہا جائے گا کہ یہ ہے وہ عذابِ نار جس کی تم تکذیب کیا کرتے تھے (۱۱-۱۲/۵۲)۔
سورۃ اعراف میں ہے: اِنَّ الَّذِیْنَ کَذَّبُوْا بِآیٰتِنَا..... لَهُمْ مِنْ جَهَنَّمَ مِهَادٌ (۴/۴۱-۴۰)
جو لوگ ہمارے قوانین کی تکذیب کرتے ہیں وہ کبھی جنت میں داخل نہیں ہو سکیں گے، ان کا گہوارہ جہنم
ہوگا۔ سورۃ الذیل میں ہے کہ جہنم اس کے لئے ہے۔ الَّذِیْ کَذَّبَ وَ تَوَلٰی (۹۲/۱۶) جو قوانین
خداوندی کی تکذیب کرتا ہے اور ان سے گریز کی راہیں تراشتا ہے۔

منافقین، جہنم میں

منافق تو اس دنیا میں بھی ایک ایک سانس میں جہنم میں رہتا ہے۔ اس کا سینہ جس شمشک
کی آماجگاہ بنا رہتا ہے اور اس سے جو قلبی اضطراب پیدا ہوتا ہے وہ مستقل عذاب ہوتا ہے۔ یہ جہنم
اس دنیا کی ہے اور یہی جہنم آگے بڑھ کر اخروی زندگی کا ”عذاب النار“ بن جاتا ہے۔ قرآن کریم نے
کفار اور منافقین کو ایک ہی زمرہ میں شمار کیا ہے اور رسول اللہ سے کہا ہے کہ جَاهِدِ الْکُفَّارَ وَ
الْمُنَافِقِیْنَ وَ اَعْلَظْ عَلَیْهِمْ ۖ وَ مَا دِیْهُمْ جَهَنَّمَ ۚ (۹۶/۹۶) کفار اور منافقین کے خلاف جہاد کرو
اور ان کے مقابلہ میں بڑی شدت برتو۔ ان کا ٹھکانہ جہنم ہے۔ (نیز ۹/۴۳)۔ بلکہ منافقین کے متعلق یہاں
تک کہا ہے کہ

اِنَّ الْمُنَافِقِیْنَ فِی الدَّرَجَةِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ (۴/۱۳۵)

وہ جہنم کے سب سے پچھلے حصہ میں ہوں گے۔

یعنی کفار سے بھی زیادہ شدید عذاب میں مبتلا۔ جن لوگوں نے مدینہ میں ایک جگہ مسجد تعمیر کی تھی تاکہ
اس سے مسلمانوں میں تفرقہ پڑ جائے ان کے متعلق کہا ہے کہ ان کی یہ تخریبی کارروائی، اضطرابِ پیہم کی
ایسی آتش خاموش بنے گی جس سے ان کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا اور یہ مسجد اور اس کے بنانے
والے سب داخل جہنم ہوں گے (۱۰۴-۱۱۰/۹)۔

اسلامی نظام سے سرکشی برتنے والے

جو لوگ، اپنی دولت اور قوت کے نشہ میں بدمست، اسلامی نظام کے خلاف سرکشی پر اتر آتے

ہیں یا اس کے قیام کی راہ میں روڑے اٹکاتے ہیں ان کا ٹھکانہ بھی جہنم ہوتا ہے۔ اس دنیا میں بھی اور
آخری زندگی میں بھی۔ سورۃ توبہ میں ہے۔

أَلَمْ يَعْلَمُوا أَنَّهُ مَنِ يُحَادِدِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَأَنَّ لَهُ نَارَ جَهَنَّمَ
خَالِدًا فِيهَا ذَلِكَ الْخِزْيُ الْعَظِيمُ ۝ (۹/۶۳)؛ (۴/۱۴)؛ (۴۲/۲۳)۔

کیا ان لوگوں کو معلوم نہیں کہ جو خدا اور اس کے رسول (اسلامی نظام) کے خلاف اٹھتا
ہے اس کا ٹھکانہ جہنم ہوگا اور یہ بہت بڑی ذلت و رسوائی کا مقام ہوگا۔

سورۃ حج میں ہے کہ جو لوگ اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ قوانین خداوندی کو بے بس بنا دیں
(انہیں چلنے نہ دیں) وہ اہل جہنم میں سے ہیں (۲۲/۵۱)۔ سورۃ مومن میں ہے کہ جو لوگ خدا کی محکومیت اختیار
کرنے سے تکبر کرتے ہیں وہ ذلیل و خوار ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے۔ (۴۰/۶۰)۔ دوسرے مقام پر انہیں
”أَعْدَاءُ اللَّهِ“ اللہ کے دشمن کہا ہے اور ان کا انجام جہنم بتایا ہے (۱۴۱/۲۸)۔

مجرمین کیلئے جہنم

قبل اس کے مجرمین کے متعلق قرآنی تصریحات سامنے آئیں، ایک اصولی نکتہ کا سمجھ لینا ضروری ہے۔
قرآن کریم نے کافرین، مشرکین، منافقین، کاذبین، مجرمین (وغیرہ) الفاظ استعمال کئے ہیں تو اس
طرح نہیں کہ ان کا جو مفہوم کوئی متعین کرنا چاہے کر لے۔ شرآن کریم نے ان الفاظ کو (آل) کے ساتھ معرفہ
بنا دیا ہے۔ یعنی انہیں ’الکافرین‘، ’المشرکین‘ وغیرہ لکھا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ کافروہ ہیں جنہیں
قرآن نے کافر قرار دیا ہے۔ مشرک وہ ہیں جنہیں قرآن مشرک کہتا ہے۔ مجرم وہ ہیں جو شرآن کی
(DEFINITION) کے مطابق مجرم قرار پاتے ہیں۔ قرآن کریم کی تعریف کی رو سے مجرم وہ ہیں
جو احکام و قوانین خداوندی کی خلاف ورزی کرتے ہیں جو ان قوانین کو توڑتے ہیں۔ اس اعتبار سے
جہاں شرآن کریم نے اگرچہ بعض جرائم کا تفصیلی ذکر بھی کیا ہے۔ لیکن اس نے بہ حیثیت مجموعی یہی کہا
ہے کہ امل جرمین کا ٹھکانہ جہنم ہوگا۔ ان جرائم کا ارتکاب غیر مسلموں کی طرف سے ہو یا مسلمانوں
کی طرف سے دونوں مجرم قرار پائیں گے۔ یہاں ہم جرائم کے اثرات کا ذکر کر رہے ہیں جو انسانی ذات
پر مرتب ہوتے ہیں اور ان کا نتیجہ آخری زندگی کا جہنم۔ جرائم کی ان سزاؤں کا ذکر نہیں کر رہے جو دنیاوی

عدالت سے اس دنیا میں مل جاتی ہے۔ (اس نکتہ کی اصولی بحث پہلے آچکی ہے کہ جن جرائم کی سزا یہاں مل جاتی ہے آخروی زندگی سے ان کا کیا تعلق ہوتا ہے)۔

اجمالی طور پر سورہ قمر میں ہے إِنَّ الْعُجْرِمِينَ فِي ضَلَالٍ ذَّسَعِيرَةٍ يَوْمَ يُسْحَبُونَ فِي النَّارِ عَلَى وُجُوهِِهِمْ ذُوقُوا مَسَّ سَقَرَہ (۵۴/۴۸-۴۹) یہ حقیقت ہے کہ مجرمین غلط راہوں پر چل رہے ہیں اور عذاب جہنم میں مانوڑ ہوں گے جس دن انہیں منہ کے بل گھسیٹ کر جہنم میں داخل کیا جائے گا اور کہا جائے گا کہ دوزخ کے عذاب کا مزہ چکھو۔ سورہ رحمن میں ہے کہ ان سے کہا جائے گا کہ هٰذِهِ جَهَنَّمُ الَّتِي يُكَذِّبُ بِهَا الْعُجْرُمُونَ (۵۵/۴۳) مجرمین سے کہا جائے گا کہ یہ ہے وہ جہنم جسے تم جھٹلایا کرتے تھے۔ سورہ مدثر میں ہے کہ اہل جنت جہنم والوں سے کہیں گے کہ اے مجرمو! تم کن جرائم کی پاداش میں یہاں آپہنچے ہو؟ (۴۴/۴۱-۴۲) کہیں انہیں اَلْفَجَارِ کہا گیا ہے (۸۲/۱۴) کہیں اَلْفَاسِقِينَ (۳۲/۲۰) الظَّالِمِينَ متعدد مقامات پر کہا گیا ہے (۲۱/۲۹) جادۂ عدل و انصاف سے ہٹ جانے والے (۴۲/۱۵) انہیں مسلمین کی ضد بتایا گیا ہے (۴۲/۱۴)۔

بعض جرائم کی تفصیل

(۱) زندگی کی جو آسائشیں خدا کی طرف سے عطا ہوتی ہیں انہیں چھپا کر رکھنے والے۔ غلط جگہ استعمال کرنے والے۔ دولت کو روک رکھنے والے۔ حدود فراموش۔ قوانین کی صداقت میں شبہ کرنے والے جہنم کے عذاب شدید میں گرفتار ہوں گے (۲۴-۵۰/۲۶)۔

(۲) علماء و مشائخ جو لوگوں کا مال ناحق کھا جاتے ہیں اور اپنی مفاد پرستیوں کی وجہ سے لوگوں کو خدا کے راستے کی طرف آنے سے روکتے ہیں (۹/۳۴)۔

(۳) دولت کو محض اپنے مفاد کے لئے جمع کرنے والے اور اسے نوع انسانی کی منفعت عامہ کے لئے صرف نہ کرنے والے جہنم کے سخت عذاب میں ہوں گے (۲۴-۳۵/۹) ذ (۱۸-۴۰/۲۱)۔ سورہ الہمزہ میں ہے۔ تبای ہے اس کے لئے۔

جَعَمَ مَالًا وَ عَدَدًا لَا يَحْسَبُ أَنَّ مَالَهُ أَخْلَدَهُ... مُمَدَّدَةً (۲-۱۰۴/۹)

جو دولت جمع کرتا ہے اور پھر اسے گنتا رہتا ہے (اور اس طرح ننانوے کے پھر میں پڑ جاتا)

کیا وہ سمجھتا ہے کہ اس کا مال و دولت اسے حیات جاوید عطا کر دے گا؟ بالکل نہیں۔ اسے جہنم کی آگ میں جھونکا جائے گا..... یہ وہ آگ ہے جس کے شعلے دلوں کو پھیٹ لیتے ہیں۔ یہ بڑے بڑے ستونوں میں بند ہے اور ان بحرین کو اپنے اندر لئے ہوئے۔

نظام سرمایہ داری کا انجام اسی قسم کا جہنم ہوتا ہے۔ اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی! (۴) خدا کے دین کو (جو اس نے قرآن کریم میں محفوظ کر کے دیا ہے) لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل رکھنے والے یا دین فردوسی کرنے والے (۱۴۴۱-۲/۱۴۵)۔

(۵) لوگوں کا مال ناجائز طریقوں سے کھا جانے والے (۲۹-۴/۳۰)۔ یاد رہے کہ ہر وہ طریق جس کی اجازت شرعاً ان کریم نے نہیں دی، ناجائز ہے۔ اس میں یتیموں کا مال ہڑپ کر نیوالے بالخصوص شامل ہیں (۱۴۱/۱۰)۔

(۶) محض سرمایہ پر نفع کمانے والے۔ خواہ وہ کسی کو قرضہ دے کر زائد وصول کرنے کی شکل میں ہو یا کسی اور طرح روپیہ (INVEST) کر کے اس سے نفع حاصل کرنے کی شکل میں۔ اسے دیکھتے ہیں۔ اس کا نتیجہ اس دنیا میں بھی جہنم ہے اور آخرت میں بھی (۱۲۹-۳/۱۳۰)۔

(۷) ان لوگوں کے رزق کا انتظام نہ کرنے والے جن کا چلتا ہوا کاروبار رُک گیا ہو، یا وہ کام کرنے کے قابل نہ رہے ہوں۔ وہ لمبی چوڑی باتیں بناتے رہیں اور عملاً اس قسم کے رفاہ عامہ کے کام نہ کریں۔ یہ وہ ہیں جو مُصَلِّیْنَ (نمازی) ہونے کے باوجود درحقیقت مصلّین (تو انہیں خداوندی کا اتباع کرنے والے) نہیں ہوتے (۴۱-۴۲/۴۵)۔ جو لوگ رزق کے سرچشموں پر سانپ بن کر بیٹھ جائیں اور خالی نمازیں پڑھ کر سمجھ لیں کہ ہم مصلّین ہو گئے، ان کے لئے تباہی ہے (۴-۱۰۴/۷)۔ حقیقی مصلّین وہ ہیں جن کے مال و دولت میں ہر محتاج و مسکین کا حَقُّ مُعْلَن ہو رہا ہے (۲۲-۶۰/۲۵)۔

(۸) جو لوگ معاشرہ میں تنہا رہ جائیں ان کی عزت نہ کرنے والا۔ لوگوں کو اس کی ترغیب نہ دلانے والا کہ محتاجوں اور مسکینوں کے سامان رزق کا بندوبست کرنا چاہیے۔ جو مال و دولت وراثت میں ملے یہ سمجھنے والا کہ وہ اس کا واحد مالک ہے۔ پھر سرمایہ کے زور پر ایسا انتظام کرنے والا کہ دوسروں کے گاڑھے پیسے کی کمائی چاروں طرف سے سمٹ سمٹا کر اس کے پاس آتی چلی جائے (۱۴-۸۹/۲۰)۔

(۹) اگر کسی جگہ صحیح اسلامی نظام قائم ہو چکا ہو، تو غیر خداوندی نظام میں رہنے والوں کے لئے

ضروری ہے کہ وہ اس نظام خداوندی کے تابع زندگی بسر کرنے کے لئے وہاں سے ہجرت کر آئیں۔ جو لوگ ایسا کر سکنے کی استطاعت کے باوجود، ایسا نہ کریں بلکہ غیر خداوندی نظام میں مطمئن ہو کر بیٹھے رہیں، ان کا ٹھکانہ جہنم ہے (۹۷-۱۳/۹۸)۔

(۱۰) بلا علم و دلیل اور شر آئی سند کے بغیر دین خداوندی کے خلاف جھگڑے کرنے والے (۸-۲۲/۹)۔

(۱۱) قوانین خداوندی کو مذاق سمجھنے والے۔ یعنی انہیں (SERIOUSLY) نہ لینے والے (۱۸/۱۰۹)۔ قرآنی حقائق کے متعلق یہ کہنے والے کہ یہ محض اگلے لوگوں کی کہانیاں ہیں (۱۳-۸۳/۱۴) یا قوانین خداوندی میں افراط و تفریط سے کسی ایک طرف نکل جانے والے۔ اسے اتحاد کہا جاتا ہے (۴۱/۴۰) یا خدا کے بارے میں مذاق کرنے والے (۱۳/۱۸۰)۔

(۱۲) خدا کی طرف غلط باتیں منسوب کرنے والے (۱۴/۴۲)۔

(۱۳) جب نظام خداوندی کسی کام کے لئے بلائے تو اس کی دعوت پر لبیک نہ کہنے والے (۱۳/۱۰) یا اس کے قوانین کی محکومیت اختیار کرنے سے تکبر برتنے والے (۴۰/۴۰)۔ میدان جنگ سے پیٹھ دکھا کر بھاگ جانے والے (۸/۱۴-۱۵)۔

(۱۴) کسی مومن کو بالارادہ قتل کر دینے والا (۴/۹۳)۔ جتنی کہ مومن مردوں یا عورتوں کو اذیت پہنچانے والا بھی (۱۰/۸۵؛ ۳۳/۵۴)۔

واضح رہے کہ یہ ان جرائم کی مکمل فہرست نہیں جو مجرمین کو جہنم کا مستحق بنا دیتے ہیں۔ یہ تو محض چند نمایاں جرائم کا ذکر ہے۔ اس قسم کی تفصیلی فہرست کے لئے ایک مستقل تصنیف کی ضرورت ہے۔ اصولاً قرآن کریم نے بتا دیا کہ حسنات کے حامل جنت میں ہوں گے اور سیئات کے مرتکبین جہنم میں (۲۴/۹۰)۔ حسنات اور سیئات کی تفصیل سے سارا قرآن بھرا ہوا ہے۔

چند ایک کا خصوصی ذکر

شہان کریم نے فرعون کو سیاسی استبداد کے نمائندہ کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ اس لئے اس کے اور اس کی قوم کے اہل جہنم ہونے کا خصوصیت سے ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ وہ اپنی قوم

کی قیادت کرتا ہوا اسے جہنم میں لے گیا۔ ۱۱/۹۰ اس کو ان لوگوں کا "امام" (لیڈر) قرار دیا ہے جو جہنم کی طرف دعوت دیتے ہیں ۲۸/۴۱۱ اور کہا ہے کہ وہ مسلسل جہنم کے عذاب میں ماخوذ ہیں ۱۱/۴۰۱۔

رسول اللہ کے زمانے میں اسلامی نظام کے قیام کا سب سے زیادہ شدید مخالفانہ کعبہ کا متولی اور بہت بڑا سرمایہ دار حضور کا چچا ابولہب تھا۔ قرآن کریم نے اس کے جرائم کی شکست کا ذکر کرتے ہوئے اسے اور اس کے منصوبوں میں اس کی شریک کار اس کی بیوی کے اہل جہنم ہونے کا خصوصیت سے ذکر کیا ہے۔

اسی طرح اس نے حضرت نوح اور حضرت لوط کی بیویوں کا ذکر کیا ہے جس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ اگر نبی کی بیوی بھی اس کے پیغام پر ایمان نہیں لاتی تو اس کا نبی کی بیوی ہونا اس کے کسی کام نہیں آسکتا۔ وہ بھی جہنم میں داخل ہوگی ۱۱/۴۴۔ میزان خداوندی میں وزن اعمال کا ہے۔ کسی کی رشتہ داری کا نہیں۔ نہ کسی کے ساتھ دوستداری کے تعلقات کا ۵۱۱-۱۳۴/۵۵۔

یہودیوں کا عقیدہ تھا کہ جنت بنی ہی بنی اسرائیل کے لئے ہے۔ یہ لوگ صرف ان چند دونوں کے لئے جہنم میں جائیں گے جن میں ان کے اسلاف سے سبت کے سلسلہ میں قانون شکنی ہو گئی تھی۔ قرآن کریم نے اس عقیدہ کی بھی تردید کی ہے اور کہا ہے کہ کسی کا کسی نسل یا قوم سے متعلق ہونا کچھ معنی رکھتا۔ جس سے بھی برائیاں سرزد ہوں گی اور خطائیں اسے گھیر لیں گی وہ جہنم میں جائیگا ۱۱/۲۸۔ خواہ وہ کسی نسل سے متعلق کیوں نہ ہو ۲۳۱/۱۳۔ خواہ اس کا تعلق مہذب (شہری) آبادی (انسان) سے ہو یا وہ صحرا کے خانہ بدوشوں (جن) میں سے ہو ۲۵۱/۴۱۔

جہنم میں لیڈروں اور ان کے متبعین کی باہمی گفتگو

یہ سوال کہ قوم کی تباہی کا باعث اس قوم کے لیڈر ہوتے ہیں یا عوام الناس جو لیڈروں کے پیچھے لگ کر ان کی تقویت کا سامان بنتے ہیں، عمرانی دنیا میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ قرآن کریم نے اس سوال کو جہنم میں لیڈروں اور ان کے متبعین کی باہمی گفتگو کے انداز میں بڑے دلچسپ پیرایہ میں پیش کیا ہے۔ اسے ضمناً سولہویں باب میں بھی بیان کیا گیا ہے۔ اس کی مزید تصریح اس مقام پر

ضروری سمجھی گئی ہے)۔ سورۃ ابراہیم میں یہ کہا گیا ہے کہ قوم کے لیڈر جو نعمائے خداوندی کی ناسپاس گزاری کرتے ہیں کاروانِ امت کو اس منڈی میں جا بٹھراتے ہیں جہاں اس جنس کا سد کا کوئی خریدار نہیں ہوتا۔ اور یہ عذابِ جہنم ہے (۲۸-۱۴/۲۹)۔ لیکن وہ اس سے قوم کے عوام کو بری لذمہ قرار نہیں دیتا۔ وہ کہتا ہے کہ تم سے کس نے کہا تھا کہ تم آنکھیں بند کر کے دوسروں کے پیچھے چلتے جاؤ۔ تم اپنی عقل و بصیرت سے کام لیتے اور تباہی کے راستے پر ان کے پیچھے نہ ہو لیتے۔ ان لیڈروں کی اپنی قوت کچھ نہیں تھی۔ تم ان کی تقویت کا سامان بنے تو انہوں نے اس قدر تباہیاں مچائیں۔ اس لئے یہ اور تم، دونوں مستحقِ جہنم ہو۔ جب کسی قوم پر تباہی آتی ہے تو عوام اس سے محفوظ نہیں رہتے۔ یہی نکتہ ان مکالمات کا محور ہے جنہیں شہان نے اپنے تمثیلی انداز میں پیش کیا ہے۔ ان لیڈروں میں سیاسی لیڈر اور مذہبی راہ نما اور پیشوا سب شامل ہیں۔

سورۃ سبأ میں ہے۔

اگر تو اس منظر کو سامنے لائے جب یہ لوگ جنہوں نے ظلم کی راہ اختیار کی تھی خدا کے حضور کھڑے ہوں گے اور اپنی غلط روی کا ایک دوسرے پر الزام دھر رہے ہوں گے عوام اپنے لیڈروں سے کہیں گے کہ اگر تم ہمیں گمراہ نہ کرتے تو ہم یقیناً قوانینِ خداوندی پر ایمان لے آتے۔

لیڈر کہیں گے کہ ہمیں کیوں مطعون کرتے ہو؟ جب سیدھا راستہ تمہارے سامنے آگیا تھا تو کیا ہم نے تمہیں روکا تھا کہ اس راستے کو اختیار نہ کرنا۔ تم خود ہی جہنم کا ارتکاب کرنا چاہتے تھے۔ اب مفت میں الزام ہم پر دھرتے ہو؟

ان کے متبعین کہیں گے کہ تم دن رات اس قسم کی چالیں چلتے اور سازشوں کا جال بچھاتے تھے جس سے ہم سیدھے راستے کی طرف آہی نہ سکیں۔ کیا اس کے بعد بھی تم یہ کہنے کی ہزرت کر سکتے ہو کہ تم نے ہمیں نہیں بہکایا تھا؟ (۳۱-۳۴/۳۳)۔

لیکن ان کا یہ عذر قابلِ پذیرائی نہیں سمجھا جاتا اور ان سب کو داخلِ جہنم کر دیا جاتا ہے۔

سورۃ صافات میں ہے کہ جہنم میں جانے والے

ایک دوسرے کو مطعون کریں گے۔ عوام اپنے لیڈروں سے کہیں گے کہ تم یورٹیں کر کے

ہماری طرف آیا کرتے تھے اور اس طرح ہمیں غلط راستے پر ڈال دیتے تھے۔ وہ ان سے کہیں گے کہ ہمارا تم پر کیا اختیار و اقتدار تھا۔ تم خود ہی صحیح راستے پر چلنا نہیں چاہتے تھے، تم صحیح راستے پر چلنا چاہتے تو ہمارے پاس کون سی قوت تھی جس سے ہم تمہیں مجبور کر کے غلط راستے پر ڈال سکتے تھے؟ ہم خود غلط راستے پر چل رہے تھے۔ تم نے ہمارا اتباع شروع کر دیا اور اس راستے پر چل نکلے۔ اب اس عذاب میں برابر کے شریک ہیں (۲۴/۲۳-۲۴)۔

اگلی آیت میں قرآن کریم نے ان سب کو برابر کا مجرم قرار دیا ہے۔

سورۃ مؤمن میں ہے۔

جہنم میں متبعین اپنے لیڈروں سے کہیں گے کہ ہم تمہارے پیچھے چلا کرتے تھے (اور تم ہمیں بڑے سبز باغ دکھایا کرتے تھے) اب ذرا اس عذاب سے تو ہمیں چھڑا دو۔ وہ ان سے کہیں گے کہ ہم خود اسی عذاب میں مبتلا ہیں۔ (اگر ہم میں تمہیں عذاب سے نجات دلانے کی قدرت ہوتی تو پہلے ہم خود ہی اس عذاب سے نہ نکل جاتے!) اب تو ہم سب کو یہ عذاب بھگتنا پڑے گا (۲۴/۴۸-۴۹)۔

سورۃ شعراء میں لیڈروں کو ابلیس اور ان کے متبعین کو "ابلیس کے شکر" کہہ کر پکارا گیا ہے اور جہنم میں ان کی باہمی گفتگو کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔

ابلیس کے شکر! ابلیس سے کہیں گے کہ ہم نے بڑی غلطی کی جو خدائے رب العالمین کا درجہ تجھے دے دیا۔ اصل میں ہمیں قوم کے مجرم طبقہ نے غلط راستے پر ڈال دیا۔ اب نہ ہمارا کوئی دوست اور مددگار ہے نہ حمایتی اور سفارشی۔ اگر ہم کسی طرح ایک بار وہیں دنیا میں جاسکیں تو پھر ہم خدا پر ایمان لا کر بتائیں۔ (۲۴/۱۰۲-۹۵)

سورۃ بقرہ میں ہے کہ

اس عذاب کو دیکھ کر مذہبی پیشوا جن کا اتباع لوگ کرتے تھے ان سے فوراً بری الذمہ ہو جائیں گے (اور ان سے آنکھیں پھیر لیں گے)۔ اس پر ان کے متبعین (پیچھے چلنے والے) باصد حسرت کہیں گے کہ اس وقت تو ہمارا بس نہیں چلتا۔ اگر ایک بار کہیں دنیا میں پھر سے جانا ہو جائے تو ہم تمہیں بتائیں کہ آنکھیں کس طرح پھیری جاتی ہیں۔

۱) قرآن کہتا ہے کہ ایوں ان لوگوں کے اعمال حسرت بن کر ان کے دلوں کو اندوہناک بنا

دیں گے لیکن جہنم سے ان کا نکلنا نہیں ہو سکے گا۔ (۱۶۶ - ۱۶۷/۲)

دوسرے مقام پر ہے کہ جب ان عوام کو جہنم کا فیصلہ سنایا جائے گا تو وہ کہیں گے کہ "اے ہمارے نشوونما دینے والے! وہ ہمارے (شہری اور دیہاتی) لیڈر اور مذہبی راہنما جنہوں نے ہمیں تباہ کیا ہے! انہیں ایک دفعہ ہمیں دکھا دے تاکہ انہیں ہم اپنے پاؤں تلے روند کر دل کا غبار تو نکالیں" (۱۶۱/۲۹)۔

ان مقامات میں لیڈروں اور ان کے متبعین کی باہمی گفتگو کا ذکر ہے۔ لیکن قرآن کریم یہ بھی بتاتا ہے کہ دنیا میں قومیں بھی دوسری قوموں کی دیکھا دیکھی غلط راستے اختیار کر لیتی ہیں۔ ان کے سلسلہ میں سورۃ اعراف میں ہے کہ

جہنم میں داخلے کے وقت ہر قوم اپنی ہم رنگ قوم پر لعنت بھیجے گی حتیٰ کہ جب وہ سب اس میں اکٹھی ہو جائیں گی تو وہ قوم جو بعد میں آئے گی اس قوم کے متعلق جو اس سے پہلے آچکی ہوگی 'خدا سے کہے گی کہ اے ہمارے نشوونما دینے والے! یہ ہے وہ قوم جس نے ہمیں غلط راستے پر ڈالا تھا، اسے دوہرا عذاب دے۔ (ایک ان کے اپنے جرائم کے بدلے میں اور دوسرا اس لئے کہ انہوں نے ہمیں گمراہ کیا)۔ جواب ملے گا کہ تم میں سے ہر ایک کو دوہرا عذاب ملے گا۔ اس لئے کہ کوئی قوم بھی یہ کہہ کر پھپھا نہیں چھڑا سکتی کہ اے دوسری قوم نے گمراہ کر دیا تھا۔ ہر قوم کو اپنا راستہ آپ منتخب کرنا چاہیے تھا۔ اور دوسرے یہ کہ اگر تمہاری پیشہ و قوم کا اثر تم پر پڑا تھا تو تمہارا اثر تمہارے بعد آنے والی قوم پر پڑا تھا۔ اس لئے ہر قوم دوہرے عذاب کی مستحق ہوتی ہے)۔

یہ سنکر پہلی قوم بعد والی قوم سے کہے گی کہ تمہیں ہم پر کیا فضیلت حاصل ہے جو ہمیں تو دوہرا عذاب ملے اور تمہیں اکہرا ہی ملے۔

اور خدا کہے گا کہ تم سب اپنے اپنے اعمال کے بدلے میں عذاب کا مزہ چکھو۔

(۳۸ - ۴۶/۲۹)

دوسری جگہ ہے کہ "جہنم میں جانے والی قوموں میں سے کوئی قوم دوسری قوم کو دیکھ کر خوش نہیں ہوگی۔

اس لئے کہ ہر قوم دوسری قوم سے کہے گی کہ اس نے ان کے لئے یہ عذاب تیار کر دیا ہے اور اس طرح ہر قوم خدا سے کہے گی کہ اے ہمارے نشوونما دینے والے! جس قوم نے ہمارے لئے جہنم کی یہ آگ بھڑکائی ہے اسے دوہرا عذاب دے (۵۹-۳۸/۶۱)۔

آپ نے غور فرمایا کہ قرآن کریم نے غلط کاروں کا کس قدر عبرت آموز نقشہ کھینچا ہے!

اہل جنت اور اہل جہنم کی باہمی گفتگو

قرآن کریم میں دو ایک مقامات پر اہل جنت اور اہل جہنم کے مکالمات کا بھی ذکر آیا ہے۔ سورۃ اعراف میں ہے۔

اہل جنت، اہل جہنم سے کہیں گے کہ ہم سے جو وعدے ہمارے رب نے کئے تھے ہم نے وہ تمام سچے پائے۔ (وہ سب کچھ مل گیا جس کا ہم سے وعدہ کیا جاتا تھا)۔ جن باتوں سے خدا نے تمہیں آگاہ کیا تھا، کیا وہ کبھی سچ ہو کر تمہارے سامنے آگئی ہیں یا نہیں؟ وہ کہیں گے کہ ہاں! ان میں کی ایک ایک بات حقیقت بن کر ہمارے سامنے آگئی ہے۔ ان میں ایک پکارنے والا پکار کر کہے گا کہ ظالمین، خدا کی عطا کردہ نعمتوں سے محروم ہیں۔ یعنی وہ لوگ جو خدا کی طرف لے جانے والے راستے میں سنگ گراں بن کر حائل تھے اور چاہتے تھے کہ وہ سیدھا نہ رہے۔ اس میں پہنچ دھم پیدا ہو جائیں۔ یہ لوگ حیاتِ آخری کے قائل نہیں تھے۔

اور اہل جہنم، اہل جنت سے پکار کر کہیں گے کہ خدا نے جو سامانِ زینت تمہیں مرحمت فرمایا ہے اس میں سے کچھ ہمیں بھی عنایت کر دیا پانی کا ایک چھینٹا ہی ادھر بھینک دو۔ (تاکہ اس آگ کی تپش کچھ کم ہو) وہ کہیں گے کہ یہ چیزیں ان پر حرام ہیں جنہوں نے توہینِ خداوندی کی صداقت کا انکار کیا۔ جنہوں نے اپنے دین کو مذاق بنالیا۔ جنہیں دنیا کی زندگی نے فریب میں الجھائے رکھا (۴۱-۴/۵۱)۔

سورۃ حدید میں ہے کہ منافقین اہل جنت سے پکار کر کہیں گے کہ
 ذرا ہمارا انتظار کرو۔ ذرا رُک جاؤ تاکہ تمہارے چراغوں سے ہم تھوڑی سی روشنی مستعار

لے لیں (تو اس طرح ہمارا راستہ بھی کسی حد تک روشن ہو جائے)۔ وہ کہیں گے کہ یہ روشنی
کہیں سے مستعار نہیں ملا کرتیں۔ (یہ چراغ اپنے ہی اعمال کے تیل سے روشن ہوتے ہیں
اور اعمال کا مقام سابقہ دنیا کی زندگی تھی۔ اس لئے تمہیں اس روشنی کے حصول کے لئے
واپس دنیا میں جانا ہوگا) جہاں اب تم جا نہیں سکتے۔ اس لئے تمہارے راستے کس طرح
روشن ہو سکتے ہیں!۔

پھر ان کے درمیان ایک دیوار حائل کر دی جائے گی۔ وہ دیوار جس کے اندر کی طرف
رحمت ہوگی اور باہر کی طرف عذاب۔

وہ (منافقین) اہل جنت سے کہیں گے کہ کیا ہم تمہارے ساتھ نہیں ہوا کرتے تھے۔
(پھر تم ہم سے اس طرح بے رخی کیوں برت رہے ہو!) وہ کہیں گے کہ (ذرا اپنے گریبان
میں منہ ڈال کر دیکھو کہ کیا تم واقعی ہمارے ساتھ تھے؟ تمہاری حالت یہ تھی کہ بظاہر
ہمارے ساتھ شامل تھے لیکن درحقیقت تمہاری ذاتی مفاد پرستیاں تمہیں دھوکے
میں رکھتی تھیں۔ تمہیں اس نظام کی صداقت پر شبہ تھا اس لئے تم (کنارے پر
کھڑے) انتظار کرتے رہتے تھے کہ دیکھیں کس کا پلڑا بھاری ہوتا ہے تاکہ اس کے ساتھ
جا ملیں۔ اس لئے تمہاری خواہشات نفس نے تمہیں دھوکا دے رکھا تھا۔ اور
یہ بہت بڑا دھوکا تھا جس میں تم مبتلا تھے۔ تمہاری یہی حالت رہی تا آنکہ خدا کا
فیصلہ آپہنچا) لہذا اب یہ کہنا کہ تم ہمارے ساتھ تھے خود فریبی ہے اب تم اس
عذاب میں مانوذر ہو۔ اب تمہاری راہیں روشن نہیں ہو سکتیں)۔

(۱۳-۱۴/۵۷)

دوہی گروہ

شَدَّانِ کریم نے انسانوں کے دوہی گروہ بتاتے ہیں۔ فَرِیقٌ رِی الْجَنَّةِ وَ فَرِیقٌ
فِی السَّعِیرِ (۳۲/۷) ایک گروہ جنت میں اور ایک گروہ دوزخ میں۔ اور یہ دونوں گروہ کبھی ایک جیسے
نہیں ہو سکتے (۱۳-۱۵/۴۷)۔ اَصْحَابُ الْجَنَّةِ بڑے کامیاب اور فائز المرام ہوں گے (۵۹/۲۰) اور

اہل جہنم بڑے ہی بدنصیب (۱۱-۱۲/۸۷)۔

اہل اعراف

ہم نے اوپر کہا ہے کہ قرآن کریم نے انسانوں کے دو ہی گروہ بتائے ہیں۔ ایک اہل جنت کا گروہ اور دوسرا گروہ اہل جہنم کا۔ لیکن سورۃ اعراف میں ”اہل اعراف“ کا بھی ذکر آتا ہے۔ ان کے متعلق عام طور پر کہا جاتا ہے کہ یہ وہ لوگ ہوں گے جن کے متعلق ہنوز فیصلہ نہیں ہوا ہوگا کہ وہ جنت میں بھیجے جائیں یا جہنم میں۔ یعنی ان کا کیس (PENDING) ہوگا۔ قرآن کریم کی رو سے یہ تصور صحیح نہیں۔ عدالت خداوندی (قانون مکافات عمل) کی یہ کیفیت نہیں ہوتی کہ وہاں مقدمہ کا فیصلہ نہ ہو سکے اور ملزم کو (SUSPENSION) میں رکھا جائے۔

اعراف کے معنی بلند مقام کے ہیں۔ اس لئے اہل اعراف وہ ہیں جو اہل جنت میں سے بھی (باقیوں کے مقابلہ میں زیادہ بلند مدارج کے حامل ہوں گے۔ یہ اہل جنت کا گروہ ہے جسے الشاہقون اور المقربون کہہ کر پکارا گیا ہے (۱۰-۱۱/۵۶)۔ یہ لوگ اپنی اپنی جماعت پر بطور شاہد سامنے آئیں گے (۴/۴۱)۔ اسی لئے کہا ہے کہ یہ لوگ انہیں ان کی پیشانیوں سے پہچان لیں گے (۴۷-۴۹/۷)۔ جن لوگوں کے متعلق (۷/۴۶) میں کہا گیا ہے کہ وہ ہنوز جنت میں داخل نہیں ہوئے ہوں گے لیکن اس میں جانے کی آرزو رکھیں گے تو یہ اس دنیا کے جتنی معاشرہ کے ضمن میں ان لوگوں کا ذکر معلوم ہوتا ہے جو جماعت مومنین اور نظام خداوندی میں شمولیت کے متعلق اپنے دل میں سوچ رہے ہوں گے (تفصیل ان امور کی جنت کے عنوان میں ملے گی)۔

عذاب جہنم ابدی ہے

جہنم کے متعلق ہمارے ہاں عام طور پر تصور یہ ہے کہ وہ ایک جیل خانہ ہے جس میں قیدی (مجرمین) اپنی سزا بھگتنے کے لئے بھیجے جاتے ہیں۔ جب وہ اپنی قید کی مدت ختم کر لیں گے تو پھر انہیں وہاں سے نکال کر جنت میں بھیج دیا جائے گا۔ جو لوگ جیل خانہ کی مثال کو موزوں نہیں سمجھتے، وہ کہتے ہیں کہ جہنم ایک ہسپتال ہے جس میں (گناہوں کے) مریض بھیجے جاتے ہیں۔ جب وہ شفا یاب

ہو جاتے ہیں تو انہیں جہنم میں بھیج دیا جاتا ہے۔ ایک مثال یوں دی جاتی ہے کہ جہنم دھوبی کی بھٹی ہے جس میں میلے کچیلے کپڑے چڑھائے جاتے ہیں۔ جب ان کی میل کٹ جاتی ہے اور وہ صاف ستھرے ہو جاتے ہیں تو انہیں جنت میں بھیج دیا جاتا ہے۔

مثال کوئی بھی ہو، شُرآنِ کریم کی رو سے یہ تصور ہی غلط ہے کہ جہنم والے کسی وقت بھی وہاں سے نکل کر جنت میں چلے جائیں گے۔ شُرآن کی تعلیم کے مطابق اس دنیا کی زندگی میں انسان کو اس بات کا موقع دیا جاتا ہے کہ وہ حسنِ عمل سے اپنی ذات کی اس قدر نشوونما کر لے کہ وہ زندگی کے اگلے ارتقائی مراحل طے کرنے کے قابل ہو جائے۔ جس انسانی ذات میں اس قدر نشوونما پیدا ہو چکی ہوگی وہ مرنے کے بعد زندگی کی اگلی (بلند) منزل میں پہنچ جائے گی۔ اسے جنت کی زندگی سے تعبیر کیا گیا ہے جس ذات میں اس قدر نشوونما (DEVELOPMENT) پیدا نہیں ہوگی اسے آگے بڑھنے سے روک دیا جائے گا۔ اسے جہنم کی زندگی کہا جاتا ہے۔ جنت میں 'مزید عمل سے' اور آگے بڑھنے کا امکان ہوگا، لیکن جہنم میں عمل کا امکان ہی نہیں اس لئے اس میں اپنی کمی پوری کر کے آگے بڑھ جانے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ (مثال کے طور پر) یوں سمجھئے کہ زندگی کی یونیورسٹی میں جو طالب علم ایک دفعہ امتحان میں فیل ہو جائے اسے امتحان میں بیٹھنے کا دوبارہ چانس (موقعہ) نہیں دیا جاتا۔ اور ظاہر ہے کہ اس طرح فیل شدہ طالب علم ہمیشہ کے لئے اسی طرح فیل شدہ رہ جاتا ہے۔ وہ اگلی کلاس میں جا ہی نہیں سکتا۔ یہی قانون ارتقا ہے۔ اس قانون کی رو سے جو نوع، اپنی صلاحیتوں کو نشوونما دے کر آگے نہیں بڑھ سکی، وہ ہمیشہ کے لئے زندگی کی اُسی منزل میں رہ گئی۔ یہی قانون انسانی زندگی پر بھی منطبق ہوتا ہے۔ اس لئے جہنم نہ جیل خانہ ہے نہ ہسپتال۔ وہ سلسلہ ارتقا میں ایک مقام پر رک جانے کا نام ہے اسی لئے اسے جحیم کہا گیا ہے جس کے معنی روک دینے کے ہیں (۵۶/۹۴)۔ اس سے بھی اس کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ لہذا 'جہنم' رک جانے کا نام ہے اور یہ رک جانا ہمیشہ کے لئے ہوتا ہے۔ شُرآنِ کریم میں اس حقیقت کو مختلف انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ (مثلاً) سورۃ نسا میں جہنم کے متعلق ہے۔ خَالِدِیْنِ فِیْہَا اَبَدًا (۴/۱۴۹) وہ اس میں ابدی طور پر رہیں گے (۴۲/۲۳)۔ دوسری جگہ "جَحَیْمٌ" کے بجائے "سَعِیْرًا" کہہ کر کہا ہے کہ خَالِدِیْنِ فِیْہَا اَبَدًا (۳۳/۶۵-۶۴)۔ ایک مقام پر اسے اَزْاٰلُ الْخُلْدِ کہا گیا

ہے (۴۱/۲۸) یعنی ہمیشگی کا گھر۔ سورۃ فرقان میں ہے۔ اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا (۲۵/۷۵) جہنم کا عذاب ایسا ہے جو چمٹ کر رہ جائے۔ الگ ہی نہ ہو۔ بعض جگہ اسے عَذَابٍ مَّقِیْمٌ کہا گیا ہے (۳۹/۷) یعنی ہمیشہ رہنے والا عذاب اور عذاب الخلد بھی (۳۲/۱۳)۔ اہل جہنم اپنی خطا کاریوں کا اعتراف کریں گے اور کہیں گے کہ فَهَلْ اِلٰی خُرُوجٍ مِّنْ سَبِیْلِ (۴۰/۱۱) کیا یہاں سے نکلنے کی کوئی سبیل ہے؟ وہ پکار پکار کر کہیں گے کہ اے ہمارے نشوونما دینے والے! ہمیں ایک دفعہ یہاں سے نکل کر کام کرنے کا موقع دیا جائے پھر آپ دیکھئے گا کہ ہم کیسے اچھے کام کرتے ہیں۔ قَالَ اَنْخَسُوا فِیْهَا وَ لَا تُكَلِّمُوْنَ (۲۳/۱۰۸) نیز (۳۵/۳۷) جواب ملے گا کہ اب زیادہ باتیں نہ کرو عمل کا وقت گزر گیا۔ اب تمہیں یہیں ذلت کی زندگی گذارنی ہوگی۔ لَا یَجِدُوْنَ عَنْهَا مَغْنَصًا (۴۱/۳۱) اس طرح وہ وہاں سے نکلنے کی کوئی راہ نہیں پائیں گے۔ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّخْرُجُوْا مِنَ النَّارِ وَ مَا هُمْ بِمَخْرَجِیْنَ مِنْهَا (۵/۳۷) وہ ہزار چاہیں گے کہ اس عذاب سے نکل جائیں لیکن وہ وہاں سے نکل نہیں سکیں گے۔ اس لئے کہ وہ عذاب ہمیشہ رہنے والا ہے۔ سورۃ حج میں ہے کہ کَلَّمَا اَرَادُوْا اَنْ یَّخْرُجُوْا مِنْهَا مِنْ غَیْرِ اَعِیْنِ ذٰلِکَ فِیْهَا ق (۲۲/۲۲) جب کبھی وہ اس سے نکلنے کا ارادہ کریں گے انہیں اس میں دھکیل دیا جائے گا۔ (نیز ۳۲/۲۰)۔ وَ مَا هُمْ بِمَخْرَجِیْنَ مِنَ النَّارِ (۲/۱۶) وہاں سے کوئی بھی نکل نہیں سکے گا۔

جہنم سے نکلنا تو ایک طرف اس کے عذاب میں تخفیف نہیں ہوگی۔ لَا یُفَنِّرُوْا عَنْهُمْ وَ هُمْ فِیْہِ مُبْلِسُوْنَ (۴۳/۷۵)؛ (نیز ۴۰/۴۹) وہ عذاب ہلکا نہیں ہوگا اور اس طرح ان پر ابدی مایوسی چھا جائے گی۔ ”اہل مایوسی“ یہ ہے شدید ترین عذاب — اور جوں جوں مایوسی بڑھتی جائیگی اس عذاب کی تلخی میں اضافہ ہوتا جائے گا (۷۰/۳۰)۔ اس مایوسی سے تنگ آکر وہ چیخیں گے اور کہیں گے کہ ہمارا خاتمہ ہی کر دیا جائے۔

وَ نَادَوْا یٰمَلِکَ لِنَقِضْ عَلَیْنَا رَبَّنَا قَالَ اِنَّکُمْ مَّا کَثُرُوْنَ (۴۳/۷۷)۔

وہ جہنم کے داروغہ سے کہیں گے کہ خدا سے کہو کہ وہ ہمارا خاتمہ ہی کر دے۔ وہ کہے گا کہ یہاں

کسی کا خاتمہ بھی نہیں ہو سکتا اس لئے تمہیں اسی حالت میں رہنا ہوگا۔

عذاب جہنم تو ایک طرف وہ اپنے اعمال نامہ کو دیکھ کر کہیں گے کہ اے کاش! موت ہمارا خاتمہ کر دیتی

تو ہمیں یہ دن دیکھنے نصیب نہ ہوتے (۹۹/۲۷)۔ اس طرح وہ وہاں ہلاکت کو بار بار پکاریں گے لیکن وہ ہلاک نہیں ہوں گے (۱۳۱-۱۳۲/۲۵)۔ **وَيَأْتِيهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَمَا هُوَ بِمَيِّتٍ** (۱۳/۱۷) آج چاروں طرف سے موت آتی دکھائی دے گی لیکن وہ مر بھی نہیں سکے گا۔

اس ابدیت کیا مراد ہے؟

ان تصریحات سے واضح ہے کہ جہنم کا عذاب ابدی ہے۔ (اسی طرح جنت کی زندگی کو بھی ابدی کہا گیا ہے۔ تفصیل آئندہ باب میں سامنے آئے گی)۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ابدیت سے مراد کیا ہے؟ ایک ابدیت خدا کی ہے جس کی انتہا کوئی نہیں۔ زمان (TIME) کے اس تصور کو (جس میں انتہا کہیں نہ ہو یا جس میں ابتدا کہیں سے نہ ہو) ہم سمجھ ہی نہیں سکتے۔ ہمارا محدود ذہن اسی زمان کا تصور کر سکتا ہے جو ابتدا اور انتہا کے دو نقطوں کے درمیان واقع ہو۔ ”لا ابتدا“ اور ”لا انتہا“ کا زمان ہمارے خیالے اور اک سے باہر کی شے ہے۔ اس قسم کی ابدیت (اور ازلیت) صرف خدا کے لئے مختص ہے۔ صرف ایک خدا کے لئے۔ اس میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہو سکتا۔ غیر خدا کی ابدیت بہر حال کسی نقطہ پر جا کر ختم ہو جائے گی۔ خدا اور غیر خدا کی ابدیت کے اس لطیف (لیکن نہایت اہم) فرق کو سامنے لانے کے لئے ہمارے ہاں ”سردیت“ کی اصطلاح وضع کی گئی۔ خدا کی ابدیت کو سردیت کہا جاتا ہے اور سردیت میں کوئی اور شریک نہیں ہوتا۔ اس لئے جہنم کے عذاب کا خلود یا ابدیت، غیر متغیر نہیں۔ عربی زبان (اور خود قرآن کریم) میں ”أَبَدًا“ کا لفظ عرصہ دراز کے لئے بولا جاتا ہے اور خلود کے معنی غیر متغیر رہنے کے ہیں۔ جنت کی زندگی کا خلود یہ ہے کہ وہ متغیر ہو کر جہنم میں تبدیل نہیں ہو سکتی اور جہنم کی زندگی کا خلود یہ ہے کہ وہ متغیر ہو کر جنت میں بدل نہیں سکتی۔

عذاب جہنم کے لئے خلود، ابد، مقیم وغیرہ الفاظ کے ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا گیا ہے کہ **لِبَدِشْنٍ فِيهَا أَحْقَابًا** (۷۸/۲۳)۔ احقَاب (حقب کی جمع) کے معنی ”قرنہا قرن“ یا زمانہ دراز ہوتے ہیں یعنی وہ اس میں زمانہ دراز تک رہیں گے۔ یہاں سے ابدیت کا مفہوم واضح ہو گیا۔ لیکن اس سے بھی زیادہ وضاحت سورہ ہود کے ان الفاظ میں کی گئی ہے کہ

خُلِدِينَ فِيهَا دَامَتِ السَّمُوتُ وَ الْأَرْضُ إِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ إِنَّ

رَبِّكَ فَقَالُ لَمَّا يُرِيدُ ۝ (۱۱/۱۰۷)

اہل جہنم اس میں اس وقت تک رہیں گے جب تک زمین و آسمان کا سلسلہ قائم ہے۔ یہ حتمی اور یقینی بات ہے اور مشیتِ خداوندی (خدا کے ارادے) نے ایسا طے کیا ہے۔
 ”مَا دَامَتِ السَّمُوتُ وَ الْأَرْضُ“ (جب تک نظامِ کائنات قائم ہے) کائناتیں کچھ بھی کیوں نہ کر لیا جائے اس سے اتنا واضح ہو جاتا ہے کہ جہنم کا خلود اور ابدیتِ خدا کی طرح لا انتہی نہیں۔ اس کائنات کا انجام کیا ہوگا۔ اہل جہنم کا مال کیا ہوگا۔ (بلکہ یہ بھی کہ اہل جنت کی آخری منزل کیا ہوگی، کیونکہ اس کے لئے بھی مَا دَامَتِ السَّمُوتُ وَ الْأَرْضُ کے الفاظ آئے ہیں ۱۱/۱۰۸)۔ یہ وہ سوالات ہیں جن کا جواب ہم اپنے شعور کی موجودہ سطح پر نہ دے سکتے ہیں (اور نہ ہی سمجھ سکتے ہیں)۔ اس سے بتانا یہ مقصود ہے کہ یہ ابدیتِ خدا جیسی ابدیت نہیں۔

لیکن ”جہنم کے زمانہ دراز تک رہنے“ سے مفہوم یہ نہیں کہ اہل جہنم ایک مدت کے بعد وہاں سے نکل کر جنت کی طرف منتقل ہو جائیں گے۔ جب تک جہنم رہے گا اہل جہنم اس میں رہیں گے۔

ایک عظیم حقیقت

ہم نے دیکھ لیا کہ جس شخص نے اس دنیا میں ایسے کام نہیں کئے ہوں گے جن سے اس کی ذات کی نشوونما ہو گئی ہو، وہ جہنم کی زندگی بسر کرے گا اور جہنم میں اس کا امکان ہی نہیں ہوگا کہ انسان اپنی حالت بدل لے۔ اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ انسان کے مستقبل کے لئے موجودہ زندگی کی اہمیت کس قدر ہے۔ یوں سمجھئے کہ ایک طالب علم کے مستقبل کا سارا دار و مدار امتحان پاس کرنے پر ہے اور امتحان میں شامل ہونے کا آخری چانس ہے۔ اب سوچئے کہ اگر وہ طالب علم تیاری کے اس سال کا ایک لمحہ بھی ضائع کر دیتا ہے تو وہ اپنا کس قدر ”ابدی نقصان“ کرتا ہے یعنی ایسا نقصان جس کی تلافی ممکن ہی نہیں۔

اور یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے حیاتِ آخرت کے مقابلہ میں اس دنیا کی زندگی کی ہر متاع کو قلیل اور یہاں کی ہر جاؤیت کو کھیل تماشا قرار دیا ہے۔ اگر مستقبل سنوارنے کے لئے صرف ہو رہا ہے، تو ایک ایک سانس، عمر جاوداں سے زیادہ گراں بہا ہے اور اگر مستقبل بگڑتا ہے تو یہاں کی سب سے زیادہ گراں بہا متاع بھی خرافہ ریزوں سے زیادہ حقیر ہے۔

پھر سُن رکھئے کہ مستقبل سنوارنے کا موقع صرف اس دنیا کی زندگی میں ہے۔ اس کے بعد نہیں۔ اور اگر کسی نے اس موقع کو ضائع کر دیا تو پھر وہ ہمیشہ کے لئے جہنم کے عذاب میں ماخوذ ہو گا جہاں سے چھٹکارے کی کوئی صورت نہیں ہوگی۔

اور اس کے ساتھ ہی اسے بھی ذہن میں رکھئے کہ کسی شخص کو اس کا علم و یقین نہیں ہو سکتا کہ اس کی دنیاوی زندگی کتنی باقی ہے۔ لہذا وہ یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ اس کے پاس مستقبل سنوارنے کا عرصہ کافی ہے۔ اس میں سے اگر وہ کچھ حصہ ضائع بھی کر دیتا ہے تو ہرج کی بات نہیں۔

چانس آخری اور یہ معلوم نہیں کہ امتحان کا اعلان کس دن ہو جائے۔ اس لئے

وَسَارِعُوا إِلَىٰ مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمُوتُ وَالْأَرْضُ
أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِينَ ۝ (۳/۱۳۲)

(تاخیر مت کرو اور) لپک کر جاؤ خدا کی طرف سے تیار کردہ اس پناہ گاہ کی طرف جو تمہیں عذابِ جہنم سے بچا دے گی اور اس جنت کی طرف لے جائے گی جس کی وسعت ارض و سماں کی پیمائی ہوئی ہے اور جو ان لوگوں کے لئے تیار کی گئی ہے جو زندگی کی خطرناک گھاٹیوں سے بچ کر چلتے ہیں۔

آئیے۔ اس سفر میں ہم بھی اس جنت کی طرف چلیں۔



بیسواں باب

جنت

تعارف

قرآن کریم نے جس طرح 'کرب و اضطراب اور تباہی و بربادی کی زندگی کو "آگ کے عذاب" سے تشبیہ دے کر اسے جہنم کی زندگی قرار دیا ہے' اسی طرح (اس کے برعکس) سکون و اطمینان، خوش حالی و سرفرازی اور عروج و اقبال کی زندگی کو جنت سے تشبیہ دی ہے۔ لفظ جنت کا مادہ (ج. ن. ن) ہے۔ جَنِّ کے معنی ہیں چھپا لینا۔ نگاہوں سے اوجھل کر دینا۔ عربوں کے ہاں جنت اس باغ کو کہتے تھے جس کی زمین درختوں کی کثرت کی وجہ سے نظر نہ آئے۔ یعنی گھنا باغ۔ چونکہ عرب کی بے برگ و گیہا، ریگستانی زمین میں، جہاں دُور دُور تک پانی اور سبزہ کا نام و نشان تک نہ ہو، جنت (باغ) — یعنی پانی، سبزہ، درخت، ان کا سایہ اور پھل — بے بہا نعمت تھی، اس لئے ان کے ہاں زندگی کی انتہائی کامرانیوں اور کامیابیوں، شگفتگیوں اور شادابیوں، راحتوں اور شادمانیوں کو اسی اصطلاح سے تعبیر کرتے تھے۔ اور ایک عرب سی پر کیا موقوف ہے؟ دنیا کی ہر قوم، ہر ملک اور ہر زمانے میں، باغ کو سکون و راحت اور تازگی و شادابی کا مظہر قرار دیا گیا ہے۔ قرآن کریم نے اسی لئے کامیاب زندگی کو باغ (جنت) سے تشبیہ دی ہے۔

اس سلسلہ میں قرآن کریم نے انسانی زندگی کے تین گوشوں یا تین مراحل کا ذکر کیا ہے۔ مرحلہ اول انسان کی اُس زندگی سے متعلق ہے جب ہنوز اس کی تمدنی زندگی کا آغاز نہیں ہوا تھا۔ اُس وقت سامانِ رزق کی فراوانی تھی اور انسان "میری اور تیری" کی تمیز سے نا آشنا تھا۔ یہ وہ دور تھا جس میں انسانی لغت میں "ملکیت" کا لفظ نہیں آیا تھا۔ تمتع (استعمال یا فائدہ اٹھانے) کا تصور تھا۔ قرآن کریم نے

اسے "جنتِ آدم" کے تمثیلی انداز میں بیان کیا ہے۔

اس کے بعد اس کی تمدنی زندگی شروع ہوئی تو انسانوں کے مفادات میں باہمی تصادم واقع ہوا جس سے پہلی زندگی کا دور ختم ہو گیا۔ اس کے لئے اسے خدا کی طرف سے (بوساطت حضراتِ انبیائے کرامؑ) راہ نمائی دی گئی تاکہ یہ اپنی تمدنی کو بھی جنتِ ارضی بنالے۔ یہ جنتِ ارضی، قرآنی معاشرہ کا دوسرا نام ہے جس میں نہ صرف سامانِ زیست کی فراوانی ہوگی بلکہ انسانی ذات کی نشوونما بھی ہوتی چلی جاتے گی۔ موت کے بعد طبعی زندگی کا ساز و سامان تو یہاں رہ جائے گا اور انسانی ذات آگے جائے گی جس ذات کی نشوونما ہو چکی ہوگی وہ زندگی کی بلند ارتقائی منزل میں داخل ہو جائے گی۔ قرآنِ کریم نے اسے بھی جنت کی زندگی کہہ کر پکار لیا ہے۔

قرآنِ کریم میں "جنتِ آدم" کا ذکر تو الگ آتا ہے لیکن اس کے بعد صحیح انسانی معاشرہ اور آخرت کی کامیاب زندگی (یعنی جنتِ ارضی اور جنتِ اخروی) کا ذکر مخلوط طور پر کیا گیا ہے۔ لیکن غور و تدبر سے ان دونوں کا فرق بھی سامنے آ جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ جن نعماتے جنت کی تفصیل قرآنِ کریم میں آئی ہے جنتِ ارضی میں ان سے (وہی یا انہی جیسی کیفیت پیدا کرنے والی) مادی اشیاء مراد ہیں، لیکن جنتِ اخروی کے سلسلہ میں ان کے مجازی معنی لینے چاہئیں۔ یعنی سمجھنا یہ چاہیئے کہ یہ ایک کیفیت کا نام ہے جس کا ہم اپنے شعور کی موجودہ سطح پر احساس و ادراک نہیں کر سکتے، اس لئے اسے تشبیہات و استعارات کی زبان میں بیان کیا گیا ہے۔ وہ زندگی اس دنیا کی زندگی کی سی مادی زندگی نہیں ہوگی اس لئے اس سے متعلق تفصیل کو مادی پیکروں میں نہیں دیکھنا چاہیئے۔ انہیں کیفیات سمجھنا چاہیئے۔ (جہنم کی طرح) اخروی جنت بھی کسی مقام کا نام نہیں کیفیت کا نام ہے۔



جنت کا بیان تمثیلی ہے

سورۃ رعد میں ہے۔

مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِي دُعِيَ الْمُتَّقُونَ فِي نَجْوَىٰ مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ
أُكُلُهَا دَائِمٌ وَظُلُّهَا دَائِمٌ ۚ تِلْكَ عُقْبَى الَّذِينَ اتَّقَوْا ۖ وَعُقْبَى
الْكَافِرِينَ النَّارُ (۱۳/۲۵)

جس جنت کا وعدہ متقیوں سے کیا جاتا ہے اس کی مثال یوں سمجھو کہ ایک باغ ہے
جسے آبِ رواں سیراب کرتا ہے۔ اس کی وجہ سے وہ کبھی پژمردہ اور خشک نہیں ہوتا۔ اس
کے درختوں کا سایہ بھی دائمی ہے اور پھل بھی۔ یہ متقیوں کے انجام کی بات ہے۔ باقی رہے
کفار، سوان کا انجام، آگ کا عذاب ہے۔

اسی طرح سورۃ محمد میں بھی کہا گیا ہے کہ مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِي دُعِيَ الْمُتَّقُونَ (۲۴/۱۵) جس
جنت کا وعدہ متقیوں سے کیا جاتا ہے اس کی مثال یوں سمجھو کہ اس کا پانی رواں رہتا ہے جس کی وجہ
سے اس میں سڑاند پیدا نہیں ہوتی۔ (وہاں کے رزق پر لوگ بند لگا کر نہیں بیٹھ جاتے) اور دودھ کی ندیاں
جس کا ذائقہ بگڑتا نہیں اور خمر کی ندیاں جس کی لذت بڑی ہی خوشگوار ہے اور نہایت صاف و شفاف
شہد کی ندیاں اور ہر قسم کے پھل اور سامانِ حفاظت (خمر کے متعلق دوسرے مقامات میں ہے کہ اس
سے نشہ اور شراب مراد نہیں)۔

سورۃ آل عمران میں ہے۔ جَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمُوتُ وَالْأَرْضُ (۳/۱۳۲) ایسا باغ جس کی

وسعت ارض و سموت (جملہ کائنات) کو محیط ہے۔ دوسری جگہ ہے۔ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَاءِ وَ الْأَرْضِ (۵۷/۲۱) اس کا عرض 'زمین اور آسمان کے عرض کی مثل ہے۔ ان تصریحات سے واضح ہے کہ جنت کسی خاص مقام کا نام نہیں۔ اس کے چشموں کے متعلق کہا کہ عَيْنًا يَشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللَّهِ يُفَجِّرُونَهَا تَفْجِيرًا (۷۴/۴) اللہ کے بندے پیتے ہیں اس چشمے سے جسے وہ خود پھار کر نکالتے ہیں یعنی وہ چشمہ ان کے اپنے قلب کی گہرائیوں سے پھوٹتا ہے، کہیں خارج میں واقع نہیں ہوتا۔ اس چشمے کو سبیل کہتے ہیں (۷۴/۱۸)۔ سبیل (سل + سبیل) کے معنی ہیں جو راستہ پوچھتے ہوئے خود بخود آگے بڑھتا چلا جائے۔

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُمْ مِنْ قُرَّةِ أَعْيُنٍ ۖ جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝ (۳۲/۱۷)

کوئی شخص (اپنے شعور کی موجودہ سطح پر) نہیں جان سکتا کہ اس کی آنکھوں کی ٹھنڈک کا وہ سامان جو اس وقت ال کی نگاہوں سے پوشیدہ ہے کیا ہے؟ وہ اس کے اعمال کا فطری نتیجہ ہوگا۔

اس سے واضح ہے کہ جنت اخروی کی کئی حقیقت اور مابیت و کیفیت کو ہم اس زندگی میں سمجھ نہیں سکتے۔ ہم اس کے تمثیلی بیان سے بس کچھ اندازہ سا کر سکتے ہیں۔ اس حقیقت کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیے کہ ان تشبیہات و استعارات کے الفاظ تو ہماری (عربی زبان کے ہیں لیکن ان کا مفہوم مجازی ہے۔ شکوک و شبہات کے تمام کانٹے اس بنیادی حقیقت کو نظر انداز کر دینے سے ابھرتے ہیں۔



جنتِ آدم

قرآن کریم میں بیان کردہ قصۂ آدمؑ کسی ایک فرد (یا ایک جوڑے) کا قصہ نہیں، وہ نوعِ انسان کی تمثیلی داستان ہے جس میں آدمؑ مردوں کی نمائندگی کرتا ہے اور اس کی رفیقہ حیات (قرآن میں حوا کا نام نہیں آیا) عورتوں کی نمائندہ ہے۔ قرآن نے کہا ہے: انسانیت کے ابتدائی دور کی زندگی بڑی سادہ اور جگرپاش مشقتوں سے دور تھی۔ سامانِ رزق کی فراوانی تھی۔ ”میری اور تیری“ کا کوئی جھگڑا نہیں تھا۔ جیسے بھوک لگے، وہ جہاں سے جی چاہے پیٹ بھر کر کھا لے۔ ”اس میں“ جہاں سے جی چاہے ”کی عمومیت بڑی اہم ہے۔ خوراک، لباس، مکان۔ یعنی بنیادی ضروریاتِ زندگی۔ ہر ایک کو بلا مشقت اور بغیر کسی پریشانی کے میسر تھیں۔ باہمی جھگڑے نہیں تھے۔ مفادات کا تصادم نہیں تھا۔ اس کے بعد انسان کے دل میں، انفرادی مفاد پرستی کا جذبہ ابھرا، اس کا بنیادی محرک اولاد کے مستقبل کا تصور تھا۔ یعنی اب ”بنی آدم“ (نوعِ انسان) کی جگہ ہر ایک کو اپنی اپنی اولاد کی فکر دا منیگر ہوئی۔ اس لئے ہر ایک نے اپنے لئے سمیٹنا شروع کر دیا۔ اسے قرآن نے ”فسونِ ابلیسی“ سے تعبیر کیا ہے۔ قرآنی تصور کے مطابق شیطان یا ابلیس انسان

لے بائبل میں کہا گیا ہے کہ خدا نے پیدا تو آدمؑ ہی کو کیا تھا لیکن جب وہ اکیلا اس ہونے لگا تو اس کی پسلی سے عورت کو پیدا کر دیا تاکہ وہ اس کے بہلاوے کا سامان بنے۔ پھر شیطان نے عورت (حوا) کو بہکایا اور عورت مرد کی لغزش کا باعث بنی۔ اس لئے دنیا میں تمام گناہوں کا سرچشمہ عورت ہے۔ قرآن کریم نے ان دونوں باتوں کی تردید کی ہے۔ اس نے مرد اور عورت دونوں کی یکساں پیدائش کا ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ ان دونوں کا اپنا اپنا مقام ہے اور دونوں لغزش کھا سکتے ہیں۔ اس لئے گناہوں کا سرچشمہ عورت نہیں۔

کے ان جذبات کا تشبیہی نام ہے جو وحی کی راہ نمائی سے بیباک ہو کر اپنی تسکین چاہتے ہیں۔ اس سے انسان کی اخوت و اشتراک کی زندگی، انفرادیت اور عداوت میں بدل گئی اور یوں وہ جنت اس سے چھین گئی۔ اب اس جنت کو دوبارہ حاصل کرنے کا طریق یہ ہے کہ انسان خدا کی عطا کردہ مستقل اقدار کی روشنی میں اپنے معاشرہ کو متشکل کرے۔ اس سے پھر پوری نوع انسانی، ایک عالمگیر برادری بن جائے گی جس میں اخوت و اشتراک کی زندگی ہوگی۔ چونکہ اب یہ زندگی انسان کی اپنی متشکل کردہ ہوگی اس لئے اس سے اس کی طبعی ضروریات پوری ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی ذات کی نشوونما بھی ہوتی جائے گی اور جب یہ نشوونما یافتہ ذات (مرنے کے بعد) آگے جائے گی تو وہاں بھی اس کی زندگی جنت کی ہوگی۔ یہ ہے قرآن کریم کی رُوسے قصہ آدم کا مثیلی بیان جس کی تفصیل اس میں متعدد مقامات پر آئی ہیں۔ چونکہ اس وقت موضوع ”قصہ آدم“ نہیں بلکہ صرف ”جنت آدم“ ہے اس لئے ہم ان تفصیل کی انہی شقوں کو سامنے لائیں گے جن میں اس جنت کا ذکر ہے:

سورہ بقرہ میں ہے۔

اور ہم نے آدم سے کہا کہ تُو اور تیری بیوی الجنة میں رہو اور اس میں جہاں سے جی چاہے سیر ہو کر کھاؤ۔ (یہ باہمی اشتراک کی زندگی ہے۔ اس لئے دیکھنا!) کہیں الگ الگ ہو جانے (مشاجرت) کا تصور تمہارے دل میں پیدا نہ ہو جلتے

-(۲/۳۵)

اس کے بعد ہے کہ شیطان نے ان دونوں کو بہکا دیا جس سے مختلف افسردہ میں ذاتی مفادات کی (WEDGES) حائل ہو گئیں اور یوں وہ جنت کی زندگی آدم سے چھین گئی (۲/۳۶)۔ اس پر آدم بہت افسردہ اور نادام ہوا تو خدا نے کہا کہ تم سے لغزش تو ضرور ہوئی ہے لیکن یہ لغزش ایسی نہیں جس کا مداوانہ ہو سکے۔ ہماری طرف سے تمہیں راہ نمائی ملتی رہے گی۔ تم میں سے جو لوگ اس کی روشنی میں اپنا معاشرہ متشکل کریں گے وہ خوف و حزن سے مامون ہو جائیں گے (۲/۳۸-۳۷)۔

سورہ اعراف میں بھی یہی تفصیل ہے اس اضافہ کے ساتھ کہ وہاں مرد اور عورت کے جنسی تعلق کا

لے قصہ آدم کی تفصیل میری کتاب ”ابلیس و آدم“ میں ملے گی۔

کا ذکر کرتے ہوئے اس امر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ انسان اس فریب میں آگیا کہ اسے حیات دوام اولاد کی شکل میں مل سکتی ہے اس لئے وہ "بنی آدم" کی جگہ اپنی اپنی اولاد کے مفاد کے تحفظ کے پیچھے پڑ گیا جس سے وہ جنت باقی نہ رہی (۱۹ - ۷/۲۵)۔ واضح رہے کہ شہر آن کریم بیوی بچوں کو مذہب و موم قرار نہیں دیتا۔ وہ انہیں وجہ جاذبیت بتاتا ہے۔ وہ کہتا صرف یہ ہے کہ تمہارے معاشرہ کا نظام ایسا ہونا چاہیے جس میں ہر ایک کو ہر ایک کی پرورش کی فکر ہو، اپنے یا اپنی اولاد کے لئے سب کچھ سمیٹ لینے کا جذبہ غالب نہ آجائے۔

سورۃ طہ میں جنت کے سلسلہ میں آدم سے کہا گیا کہ

إِنَّ لَكَ أَلًا تَجُوعُ فِيهَا وَلَا تَقْرَىٰ ۚ وَ أَنتَ لَا تَنظُرُ فِيهَا وَلَا تَصْطَلِي ۝ (۱۱۸ - ۲۰/۱۱۹)

اس میں تمہیں اس بات کی ضمانت حاصل ہے کہ تمہیں نہ بھوک ستائے گی نہ باس کی فکر پریشان کرے گی، نہ پیاس وجہ اضطراب ہوگی نہ دھوپ سے محفوظ رہنے کے سامان اگھر اسے محرومی ہوگی۔ اس میں تمہاری تمام بنیادی ضروریات پوری ہوتی رہیں گی۔

اگر تم انفرادی مفاد پرستی کے اہلیت کے فریب میں آگئے تو وہ ایسی حالت پیدا کر دے گا جس میں تم ان چیزوں سے محروم رہ جاؤ گے اور انہیں حاصل کرنے کے لئے تمہیں بڑی جگر پاشش مشقتیں اٹھانی پڑیں گی (۲۰/۱۱۷)۔

اس کے بعد بتایا کہ آدم کس طرح فریب میں آگیا اور وہ جنتی زندگی اس سے چھین گئی۔ اسے بتایا گیا کہ اس سے بازیابی کی صورت یہی ہے کہ خدا کی راہ نمائی کے مطابق معاشرہ کی تشکیل کی جائے۔ اس سلسلہ میں کہا کہ اس حقیقت کو ہمیشہ پیش نظر رکھو کہ

مَنْ أَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنْكًا وَ عَشْرًا يَوْمَ
الْقِيَامَةِ ۝ (۲۰/۱۳۳)

جو شخص ہمارے ان قوانین سے اعراض برتے گا اس کی روزی تنگ ہو جائے گی اور قیامت کے دن بھی ہم اسے اندھا اٹھائیں گے۔

اس سے ظاہر ہے کہ

- (۱) اتباعِ قوانینِ خداوندی سے 'انسان کو پھر سے وہی جنتِ ارضی حاصل ہو سکتی ہے۔
 - (۲) جو لوگ ان قوانین سے اعراض برتیں گے ان کی روزی تنگ ہو جائے گی۔ اور
 - (۳) جس کی اس دنیا میں روزی تنگ ہوگی اس کی عاقبت بھی خراب ہوگی۔
- (اس نکتہ کی مزید وضاحت آگے چل کر ملے گی)۔



جنتِ ارضی

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ عربوں کے نزدیک، باغات اور پانی (آبِ رواں) انتہائی خوشحالی اور شادابی کی زندگی کی علامات تھیں۔ ان کے نزدیک اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ مخالفین رسول اللہ سے کہتے تھے کہ اگر آپ واقعی خدا کے رسول ہیں تو ٹکڑوں لٹ جنتہٗ من غنیلٍ و عنبٍ فتَجَرَّ الْوَنُفُورُ خَلَلَهَا قَفْیُذًا ۝ (۱۷/۹۱) تمہارے پاس کھجوروں اور انگوروں کا ایک ایسا باغ ہونا چاہیے جس میں پانی کی ندیاں رواں ہوں۔ اس کے جواب میں وحی نے کہا کہ یہ ایک باغ کہتے ہیں! خدا تمہیں اپنے قانونِ شیت کے مطابق کئی باغات (جنت) عطا کرے گا۔ ان کے نیچے جاری پانی کی ندیاں بھی ہوں گی۔ وَ یَجْعَلَنَّ لَّكَ قُصُوفًا ۝ (۲۵/۱۰) اور علاوہ ازیں ان میں تمہارے لئے محلات بھی ہوں گے۔ یہ ہے وہ جنت جو صحیح نظامِ معاشرہ (ایمان و اعمالِ صالح) کے نتیجہ میں اس دنیا میں حاصل ہوتی ہے۔

اس جنت کے حصول کے لئے حضور نبی اکرم اور آپ کے رفقاء کی جماعت کو جس قدر جہد مسلسل اور سعی پیہم کی زندگی بسر کرنی پڑی قرآن کے صفحات اس پر شاہد ہیں۔ یہی تھا وہ سودا (تجارت) جس کے متعلق کہا گیا تھا کہ

اے جماعتِ مومنین! کیا میں تمہارے لئے ایک ایسی تجارت کی نشاندہی کروں جو تمہیں غلط زندگی کے پیدا کردہ عذابِ الیم سے نجات دلا دے۔

وہ تجارت یہ ہے کہ تم خدا اور اس کے رسول پر ایمان لا کر اپنی جان اور مال سے اس کے راستے میں جہاد کرو۔ تم آخر الامر دیکھو گے کہ یہ مجاہدانہ لگ و تاز تمہارے لئے کس قدر نفع بخش ثابت ہوتی ہے۔ اس سے تمہاری چھوٹی موٹی کوتاہیوں کے نقصان رساں نتائج

سے تمہیں حفاظت مل جائے گی اور وہ تمہیں ایسے باغات اجنت میں داخل کرے گا جن کے نیچے پانی جاری ہوگا اور یہ تمہارے لئے بڑے ہی خوشگوار مسکن (رہنے کی جگہیں) ہوں گے۔ یہ زندگی کی بہت بڑی کامرانی ہے (جسے حاصل ہو جائے)۔ (۱۰-۱۱/۶۱)

سورہ توبہ میں ایمان، ہجرت اور جہاد کے نتیجے میں کہا کہ یُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَجَنَّتِ لَهُمْ فِيهَا نَعِيمٌ مُّقِيمٌ ۝ (۹/۲۱)۔

اس جہاد (مسلحہ تار) کے نتیجے میں 'انہیں' ان کے محبوں کی زمینوں، ان کی بستیوں اور ان کے مال و دولت کا مالک بنا دیا گیا (۳۳/۲۷)۔ چنانچہ جب انہیں ایک نئی فتح حاصل ہوتی تھی تو وہ بارگاہِ خداوندی میں اپنا سر نیزہ جھکا دیتے تھے۔

وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ صَدَقْنَا وَعَدَا ۚ وَ اَوْسَرْنَا الْاَرْضَ مَنۢ تَقْبُوۡا
مِّنَ الْجَنَّةِ حَیۡثُ نَشَآءُ ۚ فَنُفَعُّہُمْ اَجۡرُ الْعَمَلِیۡنَ ۝ (۳۹/۷۴)۔

اور کہتے تھے کہ کس قدر درخوردہ و ستارشیں ہے خدا کی وہ ذات جس نے ان وعدوں کو جو اس نے ہمارے ساتھ کئے تھے اس طرح پورا کیا اور ہمیں اس طرح ملک کا وارث بنا دیا کہ ہمیں اس "جنت" میں پورا پورا اختیار و اقتدار حاصل ہے۔ کام کرنے والوں کا یہ اجر کیسا عمدہ ہے؟

خدا کا یہ وعدہ وہ تھا جس کا ذکر سورہ نور میں ان الفاظ میں آیا ہے کہ "جو لوگ ایمان لا کر اعمالِ صالح کرتے ہیں ان سے خدا کا وعدہ ہے کہ وہ انہیں اس طرح حکومت عطا کرے گا جس طرح اس نے ان شرائط کو پورا کرنے والی اقوام سابقہ کو حکومت عطا کی تھی (۲۴/۵۵)۔ اور یہی تھیں خدا کی وہ وعدہ ایفائیاں جن کی یاد اس جماعت کو بعد میں دلائی جاتی تھی (۵/۱۱؛ ۸/۲۶)۔

لیکن یہ جنت ایک دن میں حاصل نہیں ہو جاتی۔ اس کے لئے عملِ سیہم اور سعی مسلسل کی ضرورت ہوتی ہے۔ سورہ حمہ میں ہے:-

وہ لوگ جنہوں نے (دل کے پورے عزم کے ساتھ) کہہ دیا کہ ہمارا نشوونما دینے والا اللہ ہے اور پھر اس عزم پر جم کر کھڑے ہو گئے، تو ان پر ملائکہ اترتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں کہ تم نہ کسی سے خوف کھاؤ اور نہ ہی افسردہ خاطر ہو۔ تم اس جنت کی بشارت لو جس

کاتم سے وعدہ کیا گیا ہے۔ ہم دنیا کی زندگی میں بھی تمہارے رفیق اور یاد رہیں اور آخرت کی زندگی میں بھی جس جنت کی ہم تمہیں خوشخبری دے رہے ہیں اس میں تمہیں وہ سب کچھ ملے گا جو تم چاہو گے اور جس کے لئے تمہارے دل میں آرزو تیں بیدار ہوتی ہیں اور کچھ ایسی عزت و تکریم کے ساتھ ملے گا جس طرح بہان کی خاطر تواضع کی جاتی ہے (۳۱/۳۲-۳۱)۔

دوسرے مقام پر جنت کا وعدہ دیتے ہوئے کہا کہ ”خدا اپنے رسول اور اس کے مومن رفقاء کو ذلیل و خوار نہیں ہونے دے گا“ (۷۶/۸)۔ سورۃ یونس میں ہے کہ ”جنت میں ذلت اور روسیاء ہی نہیں ہوگی (۱۰/۲۶)۔

صلح حدیبیہ جو فتح مکہ کا پیش خیمہ تھی، کے ضمن میں جو سورۃ نازل ہوئی تھی اس کا نام ہی سورۃ الفتح ہے۔ اس میں جماعت مومنین کو اطمینان دلایا گیا تھا کہ تم اس (بظاہر) دبا کر صلح کرنے سے دل برداشتہ نہ ہو، خدا عنقریب تمہیں فتح عطا کرے گا۔ لِيَدْخُلَ الْمُؤْمِنِينَ دَ الْمُؤْمِنَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ... (۲۸/۵) تاکہ وہ مومن مردوں اور عورتوں کو ان باغات (جنت) میں داخل کرے جن کے نیچے آبِ رواں رقصاں ہے۔ اور تاکہ ان کے مخالفین کو شکست کا عذاب ملے (۲۸/۶)۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ ایمان و اعمالِ صالح کے نتیجے میں اس دنیا میں بھی جنت حاصل ہو جاتی ہے اور جو لوگ اس طرح جنت حاصل کرتے ہیں، چونکہ ان کی ذات کی نشوونما بھی ہو جاتی ہے اس لئے انہیں آخرت میں بھی جنت مل جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے ”دو جنتوں“ کا ذکر کیا ہے۔ وَلَمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ جَنَّاتٍ (۵۵/۴۶) جسے اس بات کا احساس رہتا ہے کہ مجھے عدالتِ خداوندی میں کھڑے ہو کر اپنے اعمال و کردار کا حساب دینا ہے اس کے لئے ”دو جنتیں ہیں۔۔۔ ایک اس دنیا کی جنت۔ ایک اخروی زندگی کی جنت۔ یہ بلند ترین مقام ہیں۔ اس سے دوسرے درجے پر اور جنتیں ہیں اور وہ بھی دو ہی ہیں (۵۵/۴۲)۔

ان تفصیل کے بعد وہ ہمارے جیسوں سے مخاطب ہوتا ہے جو خالی وعائیں مانگ مانگ کر جنت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ

کیا تم سمجھتے ہو کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی تم ان جاں گداز مراحل سے گزر رہے ہو جن سے وہ لوگ گزرے تھے جنہوں نے تم سے پہلے جنت حاصل کی تھی۔ حالت ان کی یہ تھی کہ مخالفت کے جھوم میں سختیاں اور معیبتیں انہیں چاروں طرف سے گھیر لیں۔

ان کی شدت کے دل کے دل دہل جاتے یہاں تک کہ وہ اور ان کا رسول پکار اٹھتے کہ بار الہا! ہماری کوششوں کے بار آور ہونے کا وقت کب آئے گا۔ ایسے ہمت شکن اور صبر آزما مراحل کے بعد کہیں جا کر ان کی کوششیں کامیاب ہوں گی اور تائیدِ خداوندی ان کی سعی و عمل کو ثمر بارہ کرتی۔ سو تمہیں بھی اپنی مراحل سے گزرنا ہو گا، تب کہیں جا کر جنت ملے گی (۲/۲۱۲)۔

یہ تو اجتماعی زندگی کی جنتِ ارضی کا ذکر ہے۔ قرآنِ کریم اس گھر کو جس میں میاں بیوی کے خیالات، نظریات عقائد اور مستقل اقدارِ خداوندی کی صداقت پر ایمان کی بنا پر ہم آہنگی اور یک نغمی ہو، جنت قرار دیتا ہے اور جس گھر میں باہمی تصادم ہو، اسے جہنم بتاتا ہے (۲/۲۲۱)۔

۱۰

آگے بڑھنے سے پیشتر ایک نکتہ کی وضاحت ضروری ہے۔ ہم نے (پہلے) قرآنِ کریم کی وہ آیت درج کی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ جو خدا کے قوانین سے اعراض برتے گا اس کی روزی تنگ ہو جائے گی اور جس کی یہاں روزی تنگ ہوگی وہ قیامت میں بھی اندھا اٹھایا جائے گا۔ اس سے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ ایک قوم مفلوک الحال ہے، تو کیا اس کے افراد محض مفلوک الحال ہونے کی وجہ سے جہنم میں چلے جائیں گے؟ صورت یوں نہیں بلکہ یوں ہے کہ

(۱) اگر کوئی قوم کسی وجہ سے قعرِ نذلت میں گر گئی ہے (یا غلط نظام کے تابع زندگی بسر کر رہی ہے) تو اگر وہ قوم اپنی اس حالت پر قانع ہو چکی ہے، تو وہ اس دنیا میں بھی جہنم کی زندگی بسر کرتی ہے اور آخرت میں بھی جہنم میں جائے گی۔

(۲) لیکن اگر وہ قوم (یا اس کے چند افراد) اس زندگی پر مطمئن نہیں اور اسے بدلنے کے لئے جدوجہد کرتے ہیں، تو وہ اگرچہ اپنی زندگی میں اس غلط نظام کو الٹ کر اپنی حالت میں تبدیلی پیدا کر سکیں، لیکن ان کی اُخروی زندگی سنور جائے گی۔ خود نبی اکرمؐ کے زمانے میں جو حضرات اسلامی نظام کے قشطل ہونے سے قبل اس جدوجہد میں مصروف رہتے ہوئے اس دنیا سے تشریف لے گئے، ان کی اس دنیا کی زندگی بیشک عسرت میں گذری، لیکن ان کے وارث جنتِ اُخروی ہونے میں اسے کلام ہو سکتا ہے؟

(۳) اس کے برعکس، ایک قوم فطرت کی قوتوں کو مستحضر کر کے، دنیاوی زندگی میں دولت و ثروت، حکومت و سطوت حاصل کر لیتی ہے، لیکن اگر وہ مستقل اقدارِ خداوندی کا اتباع نہیں کرتی تو اس کی اس دنیا

کی زندگی مرفہ الحالی کی ہوگی لیکن اخروی زندگی جہنم کی ہوگی۔ حقیقت یہاں کی مرفہ الحالی بھی پائیدار نہیں ہوگی کیونکہ غلط نظام معاشرہ کی بنیاد میں تباہی مضمحل ہوتی ہے۔

(۴) جو قوم اس دنیا میں مستقل اقدار خداوندی کے مطابق معاشرہ متشکل کر لیتی ہے اس کی یہ زندگی بھی جنت کی ہوگی اور اخروی زندگی بھی جنت کی۔ اس زندگی کی تمام شاد کامیاں اس وقت تک ان کے حصے میں آتی رہیں گی جب تک وہ اس نظام پر قائم رہے گی۔

ادھر (شق ۲۱ میں) جو کچھ کہا گیا ہے اس کی مثال میں قرآن کریم نے اقوام سابقہ کی سرگرمشتیں پیش کی ہیں۔ مثلاً قوم عاد کے متعلق ہے کہ وہ جنت و عیون میں زندگی بسر کرتی تھی (۱۲۶/۱۴۶)۔ یہی الفاظ متقین کی کی جنتی زندگی کے لئے بھی آتے ہیں (۱۵/۲۶)۔ لیکن انہوں نے قوانین خداوندی سے سرکشی برتی تو ان پر تباہی آگئی (۲۶/۱۵۸)۔ اسی طرح قوم فرعون کے متعلق کہا کہ وہ بھی ”جنت و عیون“ کی زندگی بسر کرتے تھے (۲۶/۵۶)۔ لیکن جب انہوں نے سرکشی برتی تو انہیں وہاں سے افسطین سے نکال دیا گیا اور ان کی جگہ انہی جنت و عیون کے وارث بنی اسرائیل ہو گئے (۲۶/۵۹)؛ (۲۵/۲۸-۲۸/۲۸)۔

اس حقیقت کو قرآن کریم نے دو ایک مقامات پر مثالوں کے ذریعے بھی واضح کیا ہے۔ سورۃ القلم میں ان باغ و اموں کی مثال ہے جن کے درخت پھلوں سے لدے ہوئے تھے اور وہ انہیں توڑنے جا رہے تھے لیکن اس کی سخت احتیاط برت رہے تھے کہ کوئی محتاج اس میں سے کچھ نہ لینے پائے تو قانونِ مکافاتِ عمل کی، ایسی بادِ سموم مچی کہ وہ سب باغ اکٹھی ہوئی کھیتی کی طرح ہو گیا (۱۳-۱۴/۶۸)۔

اسی قسم کی مثال سورۃ کہف میں بھی دی گئی ہے (۲۲-۲۴/۱۸)۔ سورۃ بقرہ میں کہا گیا ہے کہ کیا تم میں سے کوئی بھی اسے پسند کرے گا کہ اس کے پاس ہلہلہا تا باغ ہو جس کے درخت پھلوں سے لدے ہوں وہ خود بوڑھا ہو جائے اور اس کے بچے چھوٹے چھوٹے ہوں اور اس باغ پر ایسی تباہی آجائے کہ اس کے درخت جل کر راکھ ہو جائیں۔ اور یوں نہ بڑھاپے میں اس کے لئے کوئی رزق کا ذریعہ رہے اور نہ ہی اس کے بچوں کے لئے سامانِ زیست! (۲/۲۶۶)۔

ان مثالوں سے بھی واضح ہے کہ جنتِ ارضی کی شادابیاں بھی صحیح نظام کے ساتھ وابستہ ہیں۔ غلط نظام سے یہ کچھ وقت کے لئے مل جاتی ہیں لیکن اس کے بعد اس نظام پر تباہی آجاتی ہے۔ بقا و مخلوق اسی جنت کے لئے ہے جو حسنِ عمل اور نظامِ صالح کے چشموں سے سیراب ہو۔

جنت کی تفصیل

اب ہم قرآن کریم میں بیان کردہ جنت کی تفصیل کی طرف آتے ہیں۔ لیکن ان تفصیل تک پہنچنے سے پہلے چند ایک تمہیدی نکات کا سمجھ لینا ضروری ہے۔

(۱) ان تفصیل کا تعلق اس دنیا کی جنت سے کبھی ہے۔ جہاں تک اُخروی زندگی کا تعلق ہے، اس کے ضمن میں ان تفصیل کو صرف تشبیہات و استعارات سمجھنا چاہیئے اور ان الفاظ کے معنی لغوی یا حقیقی نہیں بلکہ مجازی لینے چاہئیں۔

(۲) جہاں تک اس دنیا کی جنتی زندگی کا تعلق ہے، ان الفاظ کے لغوی اور حقیقی معانی بھی لئے جا سکتے ہیں لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ تہذیب و تمدن کے ہر دور میں آسائش و زیبائش اور ثروت و سطوت کی تمام اشیاء بعینہ وہی رہیں گی۔ نزول قرآن کریم کے زمانے میں عربوں کے گرد و پیش 'و قدیم تہذیبیں عروج پر تھیں۔ یعنی ایران کی تہذیب اور روم کی تہذیب۔ عرب تاجران ممالک میں جاتے تھے اس لئے وہ ان کے ہاں کے سامان آسائش وغیرہ سے بخوبی واقف تھے۔ قرآن کریم نے انہی اشیاء کا ذکر عربوں کے لئے کیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ "جنت کی یہ تمام نعمات" انہیں خود تھوڑے ہی عرصہ کے بعد حاصل ہو گئی تھیں، لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر دور کی "جنت ارضی" کی اشیاء بعینہ اسی قسم کی ہوں۔ جوں جوں زمانہ آگے بڑھتا جائے گا، یہ اشیاء مختلف ہوتی جائیں گی۔ لہذا ان کا بیان بھی تشبیہی سمجھا جائے گا۔ سورہ بقرہ میں ہے کہ ایمان و عمل صالح کے نتیجے میں مشکل شدہ جنت "تو وہی ہوگی لیکن ہر دور میں سامانِ رزق بعینہ وہی نہیں ہوگا بلکہ اُتوا بہ مُتَشَابِهًا (۲/۲۵۱) ملتا جلتا سا ہوگا۔

(۳) جنت کی ایک خصوصیت ایسی ہے جس نے اسے فی الحقیقت "جنت" بنا دیا ہے اور وہ یہ

کہ اس کی تمام نعمتیں ہر ایک کو یکساں طور پر ملیں گی۔ یہ نہیں کہ اس میں ایک طبقہ کو تو یہ تمام آسائشیں میسر ہوں اور باقی لوگ بھوکے مر رہے ہوں۔ اس میں طبقات کی تقسیم نہیں ہوگی۔ اس میں صلاحیتوں کے اعتبار سے اختلاف مدارج تو ہوگا لیکن آسائشوں کے اعتبار سے طبقات کی تقسیم نہیں ہوگی۔ یہی وہ جنت ہے جسے مشرانی نظام اس دنیا میں متشکل کرنا چاہتا ہے۔ یہاں کی جنت، جنتِ اخروی ہی کا عکس ہوتی ہے۔

۰۰

ان تمہیدی نکات کے بعد دو ایک اصطلاحات کا سمجھ لینا بھی ضروری ہے۔
 (۱) ازواج۔ ہمارے ہاں ازواج کے معنی بیویاں ہی لیا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ زوجہ بیوی کو کہا جاتا ہے لیکن زوجہ خاوند کو نہیں کہا جاتا۔ لیکن عربی زبان اور مشرانِ کریم کی رو سے اس کے معنی وسیع ہیں۔ جب دو چیزیں ایسی ہوں کہ ان میں سے ایک کے بغیر دوسری کی تکمیل نہ ہو سکے تو ان میں سے ہر ایک کو دوسری کا زوج کہتے ہیں۔ مثلاً گاڑی کے دو پہیے، ایک دوسرے کے زوج کہلائیے گے کیونکہ اگر ایک پہیہ نہ ہو (یا خراب ہو) تو دوسرا پہیہ بیکار رہ جاتا ہے۔ اس اعتبار سے ازواج کے معنی ہوتے ہیں ہم فکر و ہم رنگ رفقاء کار۔ اس میں مرد اور عورتیں دونوں شامل ہوتے ہیں اور چونکہ قرآنِ کریم کے معیار کے مطابق میاں بیوی کو سب سے زیادہ ہم آہنگ و یک رنگ ہونا چاہیئے۔ اس لئے میاں بیوی کا زوج ہوتا ہے اور بیوی میاں کی زوج۔ اس لفظ نگاہ سے دیکھئے تو جنتِ ارضی میں ازواج سے مراد ہم فکر و یک رنگ رفقاء بھی ہوں گے اور ہم مزاج و یک رنگ میاں بیوی بھی۔ لیکن جنتِ اخروی کا تصور چونکہ مادی نہیں اس لئے اس میں ازواج سے مراد ہم آہنگ رفقاء کے ہوں گے جن میں مرد اور عورتیں سب شامل ہوں گے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس زندگی میں مرد اور عورت کی موجودہ (فطری) تخصیص علیٰ حالہ رہے گی یا اس کا انداز بھی کچھ اور ہوگا۔ بہر حال اس زندگی میں ازواج سے ذہن جنسی تعلقات کی طرف منتقل نہیں ہونا چاہیئے۔ جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے۔ وہاں کی زندگی کی کیفیات کا ہم آج اندازہ و احساس نہیں کر سکتے۔

خوَر عین

جنت کے سلسلہ میں حور اور حور عین کا ذکر بھی آتا ہے اور اس سے بھی ہمارا ذہن اخروی جنت

میں مرد اور عورت کے تعلقات کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ واضح رہے کہ مرد اور عورت کے جنسی تعلقات کوئی ایسی معیوب بات نہیں کہ اگر وہاں کی جنت میں بھی یہ سلسلہ باقی رہے تو ہمیں اس سے جھجک محسوس ہو لیکن جب وہاں کی زندگی کی کیفیات کا ہم اس وقت اندازہ ہی نہیں کر سکتے تو اس کی تفصیل کو مادی پیکروں میں سامنے لانا ہی نہیں چاہیئے۔ البتہ یہاں کی جنت کی زندگی 'مادی پیکروں میں سامنے آئے گی۔

حورِ یہ لفظ جمع ہے اور مذکر کے لئے بھی بولا جاتا ہے اور مؤنث کے لئے بھی۔ اس کے ایک معنی ہوتے ہیں 'ایسے لوگ (مرد یا عورتیں) جن کی آنکھ کی سفیدی نہایت صاف اور اس کی سیاہی نہایت گہری ہو۔ عربوں کے ہاں ایسی آنکھ بڑی خوبصورت سمجھی جاتی تھی۔ لیکن اس کے بعد ان کے ہاں یہ لفظ ان لوگوں کے لئے بولا جانے لگا جن کی سیرت بڑی پاکیزہ اور نگاہ بہت بلند ہو۔ چنانچہ کتب لغت میں 'أَحْوَدٌ' (جس کی جمع حور ہے) کے معنی (PURE AND CLEAN INTELLECT) کے لکھے ہیں۔ یعنی عقل جلدہ جو اور فریب کار نہیں، بلکہ نہایت پاکیزہ اور شفاف عقل جو کسی کو دھوکا دینا نہ سکھائے۔

عین 'اسی طرح 'أَعْيُنٌ' کا لفظ (جس کی جمع عین ہے) خوبصورت آنکھ والے کے لئے بولا جاتا ہے اور اس کا استعمال بھی مذکر و مؤنث دونوں کے لئے ہوتا ہے۔

لہذا "جنت کی حوروں" سے مراد خوبصورت عورتیں نہیں بلکہ نہایت پاکیزہ فطرت انسان ہیں جن کی عقل تیز تو ہو لیکن مکار نہ ہو۔ ان میں مرد اور عورتیں دونوں شامل ہیں۔ جہاں تک جسمانی خوبصورتی کا تعلق ہے اس کے معنی خوبصورت، شفاف آنکھوں والے ہوں گے۔

اساؤرہ۔ اس لفظ کا ترجمہ سوتے کے جڑاؤ کنگن کیا جاتا ہے۔ جس طرح اکبر کے نورتن تھے، اسی طرح ایرانی شاہنشاہوں کے مقربین کا ایک خاص طبقہ ہوتا تھا جن کا مرتبہ بہت بلند سمجھا جاتا تھا۔ انہیں امتیازی نشان کے طور پر 'بادشاہ کی طرف سے ایک خاص سونے کا کنگن ملتا تھا جسے سرداری کا نشان سمجھا جاتا تھا۔ شہانِ کریم نے جنت کی زندگی میں سرفرازی و بلند مرتبگی کی علامت کے طور پر اس اصطلاح کا استعمال کیا ہے۔

نہویں۔ قرآن کریم میں 'نہد' اور 'شہد' وغیرہ کی نہروں (انہار) کا ذکر آیا ہے۔ اس سے مراد کثرت اور فراوانی ہے۔ نہ کہ نہروں میں بہنے والا دودھ یا شہد۔ (یہ بھی عربی زبان میں آب رواں کے لئے نہر کا لفظ آتا ہے جو ضروری نہیں کہ ہمارے ہاں کی مصطلحہ (CANAL) جی ہو)۔

مشروب۔ ہمارے ہاں تو یہ لفظ (WINE) یا (LIQUOR) کے لئے مخصوص ہو گیا ہے۔ لیکن عربوں کے ہاں اس سے مراد ہر پینے والی شے (مشروب) ہوتی ہے اور جنت کے مشروبات کے متعلق اس کی تصریح کر دی گئی ہے کہ ان میں نہ نشہ ہوگا نہ اضمحلال پیدا کرنے کی خاصیت۔ اصولاً اسے پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ جنت، مومنین کے معاشرہ کا نام ہے۔ اس لئے ہر وہ شے جو قرآن کریم کی رو سے حرام یا ممنوع ہے، وہ جنت میں جائز نہیں ہو سکتی اور نہ ہی وہ چیزیں جن کا استعمال جنت میں جائز ہوگا، اب حرام یا ناجائز ہو سکتی ہیں۔



اب آپ جنت کی تفصیلات کی طرف آئیے اور اس حقیقت کو ایک مرتبہ پھر سامنے لے آئیے کہ یہ تمثیلی بیان ہے نہایت پُر آسائش اور عزت و اکرام کی زندگی کا اور اس کے اولین مخاطب تھے تیرہ سو سال پہلے کے بادوہ نشین عرب۔

۱۔ عالم منظر

موسم نہ زیادہ سرد نہ زیادہ گرم، صاف اور شفاف پانی کی ندیاں رواں، چاروں طرف سبزہ گھنیرے سایوں کے سرسبز و شاداب درخت جن کی شاخیں پھلوں سے جھکی ہوئی اور پھولوں سے لدی ہوں۔ ان درختوں کے سائے میں 'ندی کے کنارے' اعلیٰ درجے کے قالین اور صوفے بچھے ہوئے ہمہ رنگ ہم رنگ ویک آہنگ احباب کی پاکیزہ محفلیں، پرندوں کا گوشت کھانے کو، نہایت خوش ذائقہ مشروبات جنت نگاہ دہندہ دوس گوش سامان نشاط جس کا آل اضمحلال و افسردگی نہ ہو بلکہ اس سے انسانی صلاحیتوں کی برومندی ہو۔ دوسری طرف، عالیشان محلات جن میں حریر و اطلس کے پردے آویزاں، اعلیٰ درجے کے قالین، میزیں کرسیاں، بلوریں آفتابے، چاندی سونے کے ظروف، ہر قسم کا سامان راحت و سکون — اور یہ ان کی اپنی محنت کا حاصل جس میں تمام افراد معاشرہ "میری اور تیری" کے امتیازات سے بلند سب یکساں طور پر شریک۔

اس اجمال کی تفصیل قرآن کریم کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیے۔



(۱) لباس. ظروف. سامان آرائش. رزق

سونے کے کنگن دبیز ریشم کے ملبوسات۔ اعلیٰ درجہ کے تختوں پر متمکن (۱۱۸/۳۱)۔ گراں بہا موتی پہننے کو (۳۵/۳۳)۔ زرنگار مرتع تختوں پر تکیے لگائے ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھے کسی کی طرف کسی دوسرے کی طرف پشت نہ ہو۔ ان کے بچے زیورات سے مزین ان کے ارد گرد پھرتے ہوں گے۔ وہ عند الضرورت آنچورے اور صراحیاں اور پیالے پیش کریں گے جو اعلیٰ درجہ کے مشروبات سے بھرے ہوتے ہوں گے۔ ان مشروبات کے پینے سے نہ سرگرائی ہوگی نہ نشہ اور نہ ہی ان کی لذت دوسروں میں کمی ہوگی۔ کھانے کے لئے منتخب پھل اور حسبِ پسند پرندوں کا گوشت (۱۵-۵۶/۲۱) (۴۲-۳۶/۴۶)۔ وہ سب بھائیوں کی طرح ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے ہوں گے اور کسی کے دل میں دوسروں کے متعلق کوئی ایسی بات نہیں ہوگی جسے وہ ان سے چھپا کر رکھنا چاہے۔ نہ حسد نہ کدورت نہ کینہ نہ بغض نہ اس میں مشقت ہوگی نہ تکلیف (۱۵/۴۹-۴۶)۔ باغات۔ چشے۔ پھل (۵۲-۴۴/۵۵)۔ موسم ایسا جس میں نہ سخت گرمی نہ سخت سردی۔ درختوں کی شاخیں جھکی ہوئیں اور پھل اتنے قریب کہ ہر ایک کا ہاتھ ان تک پہنچ سکے۔ چاندی کے ظروف۔ شیشے کے پیالے۔ ریشمیں ملبوسات۔ سرفرازوں کے کنگن (۱۳-۶۶/۲۲) (۶۹/۲۳)۔

باغوں کے بلند تختے۔ ان میں مرتع تخت۔ خوبصورت پینے کے برتن قرینے سے چنے ہوئے۔ نرم و نازک تکیے۔ اعلیٰ درجہ کے قالین (۱۰-۸۸/۱۶)۔ آپ رواں کے کنارے درختوں کے سائے تلے ہم ذوق احباب کی "پکنک پارٹیاں" ہر ایک کے ذوق کے مطابق لذت کام دوہن کا سامان (۵۵-۳۶/۵۶) سونے کے جڑاؤ کنگن اور ریشم کے ملبوسات (۲۲/۲۳)۔ ایسے فرش جن کے ابرے تو ایک طرف استر بھی ریشم کے ہوں گے پھلوں میں اعلیٰ قسم کی کھجوریں اور انار شیریں گراں بہا اور نادر قالین (۵۳-۵۵/۴۵)۔ انگوروں کے باغات (تاکستان) (۶۸/۳۲)۔

لے یہی تو جنت کی سب سے بڑی خصوصیت ہے کہ اس کے پھل ہر ایک کی دسترس کے اندر ہوں گے۔ ہر ایک کی ان تک رسائی ہوگی۔ بلکہ یوں کہیے کہ وہ ہر ایک کی جھولی میں خود آگریں گے۔ ہر ایک کی خصوصیت قابلِ غور ہے۔ یہ ہے جنتی معاشہ کی خصوصیت!

ایسے کھل دار درخت جن میں کانٹے نہ ہوں۔ لمبے لمبے سائے چشموں کا پانی جسے مشقت سے کھود کر نہ نکالنا پڑے۔ بڑی کثرت سے کھل جو سال بھر ملتے رہیں اور ہر ایک کے لئے یکساں طور پر موجود ہوں۔ کوئی ان کے راستے میں حائل نہ ہو۔ کوئی روکنے والا اور منع کرنے والا نہ ہو (۲۸-۳۳/۵۶)؛ (۲۱-۳۳/۷۷)۔

بلند صوفوں کی نشست ان پر بیٹھنے والوں کے چہرے شکفتہ و شاداب تر و تازہ۔ پاکیزہ مشروبات جن پر مہریں لگی ہوں (یعنی جن میں خارجی آمیزش نہ ہو) اور وہ مہریں (SEALS) بھی مشک (دعبر) کی (۲۸-۲۳/۷۳)۔

سامانِ زیست مسلسل و متواتر متاثر ہے گا (۱۹/۶۲) اور بڑی کثرت سے (۳۸/۵۱) اور اس کا ہر ایک کو علم ہوگا۔ یعنی اس میں رزق کے ذخائر چھپا کر نہیں رکھے جائیں گے اور ہر ایک کو یہ رزق نہایت عزت کے ساتھ ملے گا (۲۱-۲۲/۳۷)؛ (۱۹/۵۲)۔

(۲) مشروبات

(۱) صاف پانی کی نہریں جس کا مزہ نہیں بگڑے گا۔ دودھ کی نہریں جس کا ذائقہ تک خراب نہیں ہوگا۔ خمر کی نہریں جو بہت لذیذ ہوں گی۔ صاف کردہ شہد کی نہریں (۱۵/۳۷)۔

(۲) پاکیزہ پیالے (۲۲/۷۸)۔

(۳) سر بہر قراروں میں بھرے ہوئے مشروب جن کی مہریں بھی مشک کی ہوں گی (۲۵-۲۶/۸۳)۔

(۴) ان مجلسوں میں ایسے پیالوں کا دور چلے گا جن میں ٹھنڈے اور جاری چشموں کا نہایت خوشگوار پانی ہوگا۔ ایسا مشروب جو دیکھنے میں برف کا سا سفید اور پینے میں بے حد لذیذ اور تاثیر ایسی لذیذ کہ نہ تو اس سے ہلاکت و سرگرائی ہو اور نہ ہی بدہوشی و بدستی۔ نہ ہی اس کے کیف و سرور میں کمی ہوگی (۴۵-۴۷/۳۷)۔ (۲۳/۵۲)؛ (۱۹/۵۶)۔

اب ان مشروبات کی کیفیات و خصوصیات دیکھئے۔ سورۃ التھہ میں ہے کہ

خدا کے آزاد بندے اس پیالے سے پئیں گے جس کا مزاج کافوری ہوگا۔ یہ اس چشنے سے حاصل کیا جائے گا جسے یہ لوگ (خود اپنے قلب کی گہرائیوں سے) نکال کر لائیں گے (۵-۶/۷۷)۔

اس سے فوراً آگے ہے۔

وہ اس پیالے سے پتیں گے جس کا مزاج ”زنجبیلی“ ہوگا۔ یہ اس چشمے سے حاصل کیا جائیگا

جسے سلسبیل کہتے ہیں (۱۶-۱۷/۱۶)۔

”کافور“ کی تاثیر یہ ہوتی ہے کہ وہ جسم انسانی کی بڑھی ہوئی حدت کو کم کرتا ہے اور ”زنجبیل“ کا خاصہ یہ ہوتا ہے کہ وہ حدت کی کمی کو دور کر کے، جسم میں حرارت پیدا کر دیتی ہے۔ لہذا جنت کے مشروب کی خاصیت یہ ہوگی کہ انسانی صلاحیتوں میں اعتدال پیدا کر دے گا۔ جہاں حدت کی زیادتی ہوگی اسے کم کر دے گا جہاں کمی ہوگی اس میں اضافہ کر دے گا اور اس طرح (BALANCED PERSONALITY) وجود میں آجائے گی۔

پھر اس چشمے کو جو اس مشروب کا منبع ہے، سلسبیل کہا گیا ہے۔ ”سلسبیل“ کے معنی ہیں راستہ پوچھتا ہوا آگے بڑھتا چلا گیا۔ ”جیسا کہ ذرا آگے چل کر بتایا جائے گا، جنت ارتقائی سفر کا آخری مقام نہیں۔ وہ ان منازل میں سے ایک منزل ہے جہاں سے سفیر حیات میں اور آگے بڑھنا ہے۔ اس لئے جنت کے پانی کو آبِ رواں کہا گیا ہے اور اس میں جاری چشموں کا ذکر ہے (۱۸۸/۱۲)۔ اسی کو سلسبیل کہہ کر پکارا گیا ہے۔ یعنی آگے بڑھتے چلے جانا۔ بڑھتے چلے جانا۔

ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا

حیاتِ فدویٰ سفر کے سوا کچھ اور نہیں

ذرا آگے چل کر اس مشروب کو مشرابِ طہوسیٰ کہا گیا ہے (۱۶۶/۲۱)۔ یعنی تمام آمیزشوں سے منزہ و پاکیزہ، خالص شرفِ انسانیت کا حامل اور احترامِ آدمیت کا ضامن۔

سورۃ تطفیف میں کہا گیا ہے کہ ذَٰمِزَاجُہُ مِنْ تَسْنِیْمٍ (۸۳/۲۴)۔ ”تسنیم“ بلندیوں کو کہا جاتا ہے۔ یعنی جنتی زندگی کے چشموں کا منبع بڑی بلندیوں پر ہوگا۔ ظاہر ہے کہ جس چشمے کا منبع بلندی پر ہو وہ اپنے زورِ دروں سے آگے بڑھتا چلا جائے گا۔

ان تشبیہات سے واضح ہے کہ جنتی زندگی میں انسانی ذات میں صحیح صحیح اعتدال اور توازن ہوگا اور اس کی صلاحیتوں کا سرچشمہ اتنی بلندی پر ہوگا جس سے وہ کسی خارجی سہارے کے بغیر صرف اپنے زورِ دروں سے آگے بڑھتا چلا جائے گا۔ آگے بڑھنے کا جذبہ انسان کے اندر ہے۔ کہا کہ ذَٰلِکَ ذَٰیئِنَّا فَسِ الْمُنْتَا فَسُونُہُ (۸۳/۲۵) جو آگے بڑھنا چاہے اسے چاہیے کہ اس میدان میں آگے

بڑھے۔ اپنی ذات کی نشوونما کرے کہ وہ 'اعتدال و توازن کو ساتھ لئے ہوئے' اپنے زور و دروں سے آگے بڑھتی چلی جائے۔ زندگی کی تلک دناز سے تو مقصود ہی یہ ہے کہ لَمَنْ شَاءَ مِنْكُمْ أَنْ يَتَّقَ مَا أَوْ يَتَأَخَّرَ (۴۱/۳۷) جس کا جی چاہے آگے بڑھ جائے جس کا جی چاہے پیچھے رہ جائے۔

"ایک دوسرے سے آگے بڑھنے" کے جذبہ سے دلوں میں 'ایک دوسرے کے غلاتِ حسد پیدا ہوتا ہے' لیکن جنتی زندگی میں مسابقت (ایک دوسرے سے آگے نکل جانے) کا جذبہ محض کہ حسد و رقابت نہیں ہو گا وہاں کیفیت یہ ہوگی کہ وَ نَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِمْ مِنْ غَلٍّ (۴۱/۳۳) اِنْ كُنْتُمْ كَاذِبِينَ (۱۵/۴۷) ان کے دلوں میں کوئی ایسا جذبہ موجزن نہیں ہو گا۔

ازواجِ مطہرات

"ازواج" کے متعلق پہلے بتایا جا چکا ہے کہ اس کے معنی ہم آہنگ و یک رنگ رفقاء کے ہیں۔ ان رفقاء میں 'میاں بیوی بھی شامل ہیں' کیونکہ مُشْرَآنِ کریم کی رُو سے 'میاں بیوی کا رشتہ رفاقت کا ہوتا ہے۔ جنتِ ارضی میں ازواج اور حورِ عین میں بیوی اور خاوند بھی شامل ہوں گے۔ جنتِ اُخروی کے تمثیلی بیان کی رو سے ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہاں کی رفاقت کی کتنی حقیقت کیا ہوگی۔ یہی وہ ازواجِ مطہرات (پاکیزہ رفقاء) ہیں جن کا ذکر قرآن میں آیا ہے۔

سب سے پہلے تو یہ دیکھئے کہ جنت کی زندگی کے متعلق کہا یہ ہے کہ اس میں یہ لوگ ہوں گے اور مَنْ صَلَحَ مِنْ آبَائِهِمْ وَ أَنْثَى وَ أَحِبَّهُمْ وَ ذُرِّيَّتِهِمْ (۱۳/۲۳) ان کے آباء اور ازواج اور اولاد میں سے بھی جو صالح ہوں گے (یعنی اپنی صلاحیتوں کی بنا پر جنت کے مستحق قرار پائیں گے) ان کے ساتھ ہوں گے۔ (نیز ۴۰/۸، ۵۲/۲۱)۔ انہی کو "ازواجِ مطہرات" کہا گیا ہے (۲/۵۷، ۲۵/۲۱، ۲۴/۵۴)۔ کہیں صرف ازواج ہی کہا ہے (۴۳/۷۰) اور کہیں حورِ عین۔ وَ ذَوَّجْنَاهُمْ بِمَحْوَِرٍ عَيْنٍ (۵۴/۲۰) ہم انہیں حورِ عین کا رفیق بنا دیں گے۔

عہدِ جاہلیت (زمانہ قبل از اسلام) میں عورت کی حالت یہ تھی کہ اسے سوسائٹی میں کوئی مقام حاصل نہیں تھا اور اسے اس قدر جاہل رکھا جاتا تھا کہ (مُشْرَآن کے الفاظ میں) وہ خود اپنا مقدمہ (کیس) بھی وضاحت سے بیان نہیں کر سکتی تھی (۴۳/۱۸)۔ قرآنِ کریم نے عورت کو معاشرہ میں شرف و مجد کا بلند مقام عطا کر دیا۔

اور تعلیم و تربیت سے اس میں ایسا تغیر پیدا ہو گیا کہ وہ فصیح البیان ہو گئی۔ جنتی معاشرہ میں عورتوں کی یہی وہ خصوصیات ہیں جن کے متعلق کہا کہ **ذَٰ فَرُشٍ مَّرْقُوعَةٍ** ۵ وہ بلند مرتبہ بیگمات ہیں۔ **اِذَا اُنْشَاْنَهُنَّ اِنْشَاءً فَجَعَلْنَهُنَّ اَبْكَارًا**۔ ہم نے ان کی ایسی تعلیم و تربیت اور پرورش کی جس سے وہ گویا ایک نئی مخلوق میں تبدیل ہو گئی **عُرِمًا اَمْثَرَا بَاہ** (۳۲-۳۴/۵۶) وہ سب ایسی ہو گئیں گویا ان کا خمیر ایک ہی مٹی سے اٹھا ہے اور وہ ایک ہی سانچے میں ڈھلی ہیں۔ (نیز ۳۲/۱۷۸)۔ ہم گل، ہم مزاج، تربیت یافتہ، فصیح البیان، شرف و بھد کی حامل خواتین **قَصِيْرَتُ الطَّرْفِ** (۳۸/۵۱) شرم و حیا کی بختہ۔ ایسی جنہوں نے کبھی اپنی نگاہوں کو ہیاک نہیں ہونے دیا۔ (نیز ۳۷/۴۸)۔ **سُوْرَةُ الرَّحْمٰنِ** میں ہے۔ **قَصِيْرَتُ الطَّرْفِ لَمْ يَطْمِئِنَّ رَاْسُ قَبْلَهُمْ** ۵ **لَا جَانَّ** ۵ (۵۵/۵۶) ایسی پاکیزہ سیرت کہ شادی سے قبل اپنوں اور بیگانوں میں سے کسی نے انہیں چھو آہک نہیں۔ گہر تابدار جیسی پاکیزہ و شفاف (۵۵/۵۸)۔ سیرت صوْر دو نوں اعتبار پاکیزہ و شاداب (۴۰-۴۲/۵۵)۔ ایسی پاکیزہ جیسے صدف میں موتی (۴۸-۴۹/۳۷)۔

آگے بڑھنے سے پہلے ذرا اس حقیقت کو ایک مرتبہ پھر سامنے لائے کہ جس معاشرہ میں شادی کے وقت ہر نوجوان (لڑکے اور لڑکی) کو اس کا پورا پورا اطمینان ہو کہ اس کے ہونے والے رفیق نے اس سے قبل کسی کو غلط نگاہ سے دیکھا تک نہیں اور پھر یہ اطمینان اور یقین ساری عمر بدستور قائم رہے اس معاشرہ کے جنتی ہونے میں شبہ کیا ہو سکتا ہے!

ذَوَاتَا اَفْنَانٍ

سورة الرحمن میں اس دنیا اور آخرت، دونوں کی جنتوں کے متعلق ہے کہ وہ **ذَوَاتَا اَفْنَانٍ** ہیں۔ **وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ جَنَّاتٌ ۵ ذَوَاتَا اَفْنَانٍ ۵** (۴۶-۵۵/۵۵) یعنی یہ جنتیں مختلف فنون پر مشتمل ہوں گی۔ انسانی زندگی تنوع چاہتی ہے اور اس کی صلاحیتوں کی نشوونما اور ان کے اظہار اور استعمال کے متعدد گوشے ہیں۔ ان گوشوں کے لئے **مُتَدَانٍ** کریم نے جنت کو **ذَوَاتَا اَفْنَانٍ** کہا ہے۔ (اس کے بعد اس سورۃ میں جنتی زندگی کی آرائش و آسائش کے متعدد گوشے سامنے لائے گئے ہیں)۔ اس لئے جنت کی زندگی ایسی نہیں کہ اس میں ”کھایا پیا اور سو گئے“ کی کیفیت ہو۔ وہ زندگی شاخ و در شاخ علوم و فنون کی حامل ہوگی۔ چنانچہ اس زندگی کو **فَرُوْحٌ ۵ رِيْحَانٌ ۵ وَ جَنَّاتٌ نَّعِيْمٌ** ۵ (۵۶/۸۹) کی زندگی

کہا گیا ہے۔ ہر قسم کی آسائش و مسرت کا سامان۔ ہر قسم کی شاد کامیاں اور کامرانیاں۔ حتیٰ کہ فہم رنی رُذْضَةُ الْمُخْبِرُونَ (۳۲/۵۵) انہیں اس میں جو چاہیں گے ملے گا۔ (نیر ۱۶/۲۵) ۲۱/۱۰۲ ۲۲/۲۲۔ جو کچھ چاہیں گے وہ ہوگا اور جو کچھ مانگیں گے وہ ملے گا۔ اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی (۳۱/۳۱)۔ مَا تَشْتَهِيهِ الْأَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْأَعْيُنُ (۳۲/۷۱) ہر وہ چیز جسے وہ چاہیں اور جس سے ان کی نگاہیں لذت یاب ہوں۔

لَهُمْ فِيهَا مَا يَشَاءُونَ

جنتی زندگی کی ان تمام تفصیل کو قرآن کریم نے اس حین اجمال میں سمٹا دیا ہے کہ لَهُمْ فِيهَا مَا يَشَاءُونَ (۱۶/۳۱) انہیں اس میں جو چاہیں گے ملے گا۔ (نیر ۱۶/۲۵) ۲۱/۱۰۲ ۲۲/۲۲۔ جو کچھ چاہیں گے وہ ہوگا اور جو کچھ مانگیں گے وہ ملے گا۔ اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی (۳۱/۳۱)۔ مَا تَشْتَهِيهِ الْأَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْأَعْيُنُ (۳۲/۷۱) ہر وہ چیز جسے وہ چاہیں اور جس سے ان کی نگاہیں لذت یاب ہوں۔

ایک مقام پر بات اس سے بھی آگے چلی گئی ہے جہاں کہا ہے کہ لَهُمْ مَا يَشَاءُونَ فِيهَا وَ لَدَيْنَا مَزِيدٌ (۵۰/۳۵) وہ جو کچھ چاہیں گے وہ ملے گا۔ بلکہ ہمارے پاس ان کے لئے اس سے بھی زیادہ ہے۔ اس میں ایک عظیم حقیقت پوشیدہ ہے۔ زندگی کی موجودہ سطح پر انسان کی آرزوئیں کتنی ہی وسیع اور بزرگم خویش لانا تھا کیوں نہ ہوں، وہ بہر کیف اسی دنیا کے تصور تک محدود رہیں گی۔ لیکن اخروی زندگی تو اس سے کہیں بلند ہوگی۔ اس زندگی میں انسان کی آرزوئیں کیا ہوں گی، ان کا ہم آج احساس و تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اسی لئے کہا کہ وہ جو کچھ چاہیں گے انہیں ملے گا اور اس سے بھی کہیں زیادہ! یعنی وہ کچھ بھی جس کی یہ لوگ آج آرزو تک نہیں کر سکتے۔ اسی لئے کہا کہ اخذِينَ مَا أَتَاهُمْ رَبُّهُمْ (۵۱/۱۶) ۵۲/۱۸ جو کچھ ان کا نشوونما دینے والا انہیں دے گا وہ اسے لے نہیں گے۔

فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ

جنتی زندگی میں نہ کسی قسم کا خوف ہوگا نہ حزن (۳۸/۴۶) ۴۹/۷۰ ۳۰/۳۱ ۴۸/۴۳ ۴۹/۱۳)۔

خوف خارجی خطرات سے ہوتا ہے اور حزن دل کی افسردگی کا نام ہے۔ لہذا جنتی معاشرہ میں نہ خارجی خطرات وجہ اندیشہ ہوں گے نہ دل میں حزن و ملال ہوگا۔ حتیٰ کہ بڑے سے بڑا جائز گاہ حادثہ (فزع اکبر) بھی ان کے دل میں کسی قسم کا اندیشہ پیدا نہیں کر سکے گا (۲۱/۱۰۳)۔ ان کے چہرے نہ زہمت و نطافت سے معمور (۸۳/۲۴) اور اپنی محنت و مساعی کا حاصل اپنے سامنے دیکھ کر شاداب و مسرور ہوں گے (۸۸/۸ : ۸۴/۹)۔ حزن و ملال سے محفوظ و مامون ہونے کی وجہ سے قلبی طمانیت حاصل ہوگی جس کے لئے وہ بارگاہِ خداوندی میں سجدہ شکرانہ بجالائیں گے (۳۵/۳۴)۔

اس میں نہ جگر پاش مشقتیں ہوں گی نہ تھکا دینے والی زحماتیں (۱۵/۴۸ : ۳۵/۳۵)۔ نہ افسردگی نہ پژمردگی (۳۴/۴۷)۔ فَهَوَ فِي عَيْشَةِ الرِّاضِيَةِ (۶۹/۳۱) زندگی کامیابیوں سے ہم کنار اور شاد کامیوں سے ہمدوش (۱۱۰/۷۱)۔ ایک عظیم مملکت جس میں آسائشوں اور راحتوں کے ساتھ ہر قسم کی سربلندیاں اور سرفرازیاں بھی حاصل ہوں (۷۶/۲۰)۔

امن و سلامتی کا معاشرہ

ان تمام آسائشوں اور توانائیوں کے باوجود معاشرہ ایسا جس میں کوئی لغویات کہیں سے سنائی نہ دے۔ لَا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْوًا إِلَّا سَلَامًا (۱۹/۶۲) نیز (۲۵۱ - ۵۶/۲۴)۔ اس میں ہر طرف سے امن و سلامتی کی آوازیں فردوس گوش ہوں گی۔ کہیں سے کوئی لغویات کان میں نہیں پڑے گی۔ (نیز ۸۸/۱۱ : ۷۸/۳۵)۔ ملائکہ سلامتی کی تہنیت آمیز دعاؤں سے ان کا استقبال کریں گے (۱۳/۲۴ : ۱۶/۳۲ : ۳۹/۷۳)۔ ان میں سے ہر ایک ایک دوسرے کی سلامتی کا آرزو مند اور خدا کے نظام ربوبیت عالمینی کو وجہ حمد و ستائش بنانے کا داعی ہوگا (۲۰/۱۰)۔ سلامتی اور اس کے ساتھ امن (۱۵/۴۵)۔ جنت ہے ہی مقام امین (۵۱ - ۴۴/۵۵) اور دارالسلام (۶/۱۲۸)۔ جس میں ہر ایک کے لئے سلامتی کی حیات بخش آرزوئیں وجہ شادابی قلب و دماغ ہوں گی (۱۴/۲۳ : ۲۵/۷۵)۔

رِضْوَانُ مِنَ اللَّهِ

ان تمام نعماء کے ساتھ اور ان سب سے بڑھ کر رِضْوَانُ مِنَ اللَّهِ ط (۳/۱۴) یعنی زندگی قوانین خداوندی کے ساتھ یکسر ہم آہنگ اور (حدود بشریت کے اندر) صفات خداوندی کی ہم رنگ۔ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوا عَنْهُ ط (۵/۱۱۹) و ۹/۱۰۰ و ۵۸/۲۲ اور یہ سب سے بڑی کامیابی و کامرانی۔ قَوْضُ الْعَظِيمِ۔ ہے جسے نصیب ہو جائے (۱۹/۷۲)۔ یہ ہے وہ جنت جو ارض و سما میں پھیلی ہوئی ہے (۵۴/۲۱ و ۳/۱۳۲) اور جو بہترین مستقر اور جاتے قیام ہے (۲۵/۲۲ و ۲۵/۷۷)۔

جزائے اعمال

و نُودُوا۔ آواز آئے گی۔

أَنْ تَلْکُمْ الْجَنَّةُ أَوْ رِثْتُمْوهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ (۲۳/۷۳)

یہ ہے وہ جنت جس کے تم خود اپنے اعمال کے بدلے میں مالک بنائے گئے ہو۔ یہ جنت نہ مانگے سے ملتی ہے نہ بطور بخشش۔ نہ کسی کی سفارش سے ملتی ہے نہ بطور انعام۔ یہ انسان کے اپنے اعمال کا فطری نتیجہ ہوتی ہے۔ یہ اس کے اپنے خونِ جگر میں پوشیدہ ہوتی ہے۔

وَحَسَنَتْ مُرْتَفَقًا

آسائشوں اور راحتوں کی زندگی سے انسان تساہل پسند اور کم کوشش ہو جاتا ہے۔ اس لئے تقدیر اہم یہ ہے کہ

شمشیرِ سنابل اولِ طاؤسِ ربابِ آخر

لیکن جنت کی زندگی کے سلسلہ میں تشرانِ کریم ایک ایسی حقیقت سامنے لایا ہے جس سے اس کی آسائشوں اور راحتوں کی نوعیت ہی بدل جاتی ہے۔ سورۃ کہف میں پہلے جہنم کی زندگی کے متعلق کہا ہے کہ سَاءَتْ مُرْتَفَقًا (۱۸/۲۹)۔ مرتفق اس شے کو کہتے ہیں جس کے سہارے کوئی اوپر کو اٹھے۔ تشرانِ کریم نے بتایا ہے کہ غیر قرآنی معاشرہ (جہنم) میں جو آسائشیں میسر ہوتی ہیں ان سے

انسانیت اوپر کو نہیں اٹھ سکتی، اس کے برعکس جنت کے متعلق کہا کہ حَسُنَتْ مُرْتَفَقًاہ (۱۸/۳۱) یہ خوشگواریاں، انسانوں کے اوپر اٹھنے کا نہایت متوازن سہارا بنیں گی۔ یعنی ان سے ان لوگوں کی زندگی حیوانی پستیوں کی طرف نہیں جائے گی بلکہ مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے لئے مائل ہو جائے گی۔

کس قدر مبارک و مسعود ہیں وہ آسائشیں جو انسانی زندگی کو بند یوں کی طرف لے جائیں! یہ جنتی معاشہ کی خصوصیت ہے۔ اس دنیا میں بھی اور اُخروی زندگی میں بھی۔



جنت کس کیلئے ہے

ایک شخص ہر روز صبح کے وقت سیر کرتا ہے۔ رفتہ رفتہ اس کی صحت اچھی ہوتی چلی جاتی ہے۔ اس کی یہ صحت کس بات کا نتیجہ ہے؟ اس کے عمل مسلسل کا۔ یہی صورت جنت کی ہے۔ جب ایک جماعت خدا کے ابدی قوانین کی صداقت پر یقین رکھتے ہوئے کہ جسے ایمان کہا جاتا ہے، ان کے مطابق معاشرہ تشکیل کرنے کی کوشش کرتی ہے تو اس سے اس دنیا میں جنت کی نمود ہو جاتی ہے اور اس کوشش سے ہر فرد کی ذات پر جو صلاحیت بخش اثر مرتب ہوتا ہے اس کے مجموعی اثر سے اخروی جنت ظہور پذیر ہو جاتی ہے۔ لہذا جنت نام ہے صحیح خطوط پر عمل پیہم کے نتائج کا۔ قرآن کریم نے اس حقیقت کو مختلف انداز سے بیان کیا ہے۔

جنت تمہارے اعمال کا نتیجہ ہے

سورہ نحل میں ہے کہ ملائکہ مومنین سے کہیں گے کہ اَدْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ (۱۶/۳۲) ”تم اپنے اعمال کے بدلے جنت میں داخل ہو جاؤ“ دوسری جگہ ہے کہ جنت جزاء عَزَّوَجَلَّ کَانَوْا يَعْمَلُوْنَ (۵۶/۲۴) ان کے اپنے کاموں کا نتیجہ یا بدلہ۔ سورہ زخرف میں ہے کہ اِہْلِ جَنَّتٍ سے کہا جائے گا کہ

وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِي اُورِثْتُمُوهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ (۴۲/۳۳) (۴۲/۳۳) یہ ہے وہ جنت جس کا تمہیں تمہارے اعمال کے عوض وارث بنایا گیا ہے۔

لَوْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ یا اسی انداز کے اور الفاظ متعدد مقامات پر آئے ہیں۔ مثلاً (۵۲/۱۹) (۴۹/۱۳) (۱۲۸/۹) (۴۳/۴۴)۔

ایک مقام پر جنت کا ذکر کرنے کے بعد کہا کہ لِيُثَلِّ هَذَا فَلْيَعْمَلِ الْعَمَلُونَ (۲۷/۶۱) کام کرنے والوں کو چاہیے کہ ایسی چیز کے لئے کام کریں۔ سورۃ آل عمران میں ہے۔ وَ نِعْمَ أَجْرُ الْعَمَلِينَ ۝ (۳/۱۳۵) کام کرنے والوں کا یہ اجر کس قدر عمدہ ہے؟ (نیز ۲۹/۵۸)۔ ایک جگہ اہل جنت کے متعلق کہا گیا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کے حسنِ عمل کو مشرفِ پذیرائی حاصل ہو گیا (۲۶/۱۶)۔ دوسرے مقام پر ہے۔ مَا أَسْلَفْتُمْ فِي الْأَيَّامِ الْخَالِيَةِ ۝ (۶۹/۲۳) جو کچھ تم نے ایامِ سابقہ میں کیا تھا یہ اس کا نتیجہ ہے۔ کہیں کہا کہ كَانَ سَعْيُكُمْ مَشْكُورًا (۷۹/۲۲) تمہاری کوششیں یوں نتیجہ خیز ہوئیں۔ اور کہیں یہ کہ لَسَعْيَهَا رَاضِيَةً (۸۸/۹) اہل جنت اپنی کوششوں کے نتائج دیکھ کر خوش ہوں گے۔

ایمان و اعمالِ صالح کا نتیجہ

قرآن کریم کو شروع سے آخر تک دیکھ جائیے۔ ”ایمان و اعمالِ صالح“ مومن کی بنیادی خصوصیت بتائی گئی ہے اور اس کا لازمی نتیجہ جنت۔ اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوْا الصّٰلِحٰتِ جَنَّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهَارُ ۝ (۳۲/۱۳) یہ حقیقت ہے کہ خدا ان لوگوں کو جو ایمان اور اعمالِ صالح کے حامل ہوں گے جنت میں داخل کرے گا۔ اکثر مقامات پر مومنین کی خصوصیات بتا کر کہا ہے کہ اٰدْلٰیكَ هُمُ الْوَارِثُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفَرٰدِیْسَ ۝ (۱۰-۱۱-۱۲) یہ لوگ جنت الفردوس کے وارث ہیں۔ یہ مقامات (جن میں جنت کو ایمان و عملِ صالح کا نتیجہ بتایا گیا ہے) اتنے کثیر التعداد ہیں کہ ان سب کا درج کرنا مشکل ہے۔

مُتَّقِیْنَ کے لئے جنت

قرآن کریم کی ایک اصطلاح ”مُتَّقِیْنَ“ ہے۔ اس سے مراد ہیں وہ لوگ جو زندگی کی خطرناک گھاٹیوں سے بچ کر چلنے کے لئے قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کریں۔ انہیں بھی جنت کا وارث قرار دیا گیا ہے۔ اِنَّ لِلْمُتَّقِیْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنَّٰتِ النَّعِیْمِ ۝ (۶۸/۲۳) یہ حقیقت ہے کہ متقیوں کے لئے خدا کے ہاں خوشگوار یوں کے باغات (جنت) ہیں۔ کہیں ان کی خصوصیات بتا کر کہا گیا ہے کہ ان کا مقام جنت ہے ۱۵۱-۱۵۱/۱۹۔ اس قسم کی آیات بھی کثیر التعداد ہیں اس لئے ہم انہیں

بالاستیعاب بیان نہیں کرتے۔

مُحْسِنِينَ کے لئے جنت

کہیں انہیں مُحْسِنِينَ کہا گیا ہے۔ یعنی قوانین خداوندی کے مطابق، حُسن کارنامہ انداز سے زندگی بسر کرنے والے۔ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُّحْسِنِيْنَ ۝۵ (۵۱/۱۶)۔ کہیں انہیں لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا کہا گیا ہے (۱۱/۲۶)۔ یعنی وہ لوگ جو حسنِ عمل کے حامل ہیں۔ سورۃ مرسلت میں متقین اور محسنین دونوں کے لئے جنت کا ذکر ہے (۴۱-۴۴/۲۲)۔ یہ سب مومنین ہی کی مختلف صفات ہیں۔ یعنی خدا کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے والے (۴/۳۳)۔ انہی کو بعض مقامات پر ابرار بھی کہا گیا ہے۔ یعنی حسنِ عمل سے جن کی ذات میں وسعت اور کشادگی پیدا ہو گئی ہو۔ اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ (۸۲/۱۳ : ۱۸-۸۳/۲۲)۔

اہل جنت کو اَصْحٰبُ الْيَمِيْنِ بھی کہا گیا ہے۔ یعنی یمن و سعادت کے مالک (۴۲/۳۹ : ۴۹/۱۹ : ۲۷-۳۸-۵۶/۹۰)۔ ظاہر ہے کہ اس سے بڑھ کر یمن و سعادت اور کیا ہوگی کہ انسان کی اس دنیا کی زندگی بھی خوشگوار یوں اور سر بلند یوں کی ہو اور اخروی زندگی بھی شادابیوں اور سرفرازیوں کی۔

جنت جہادِ مسل سے حاصل ہوتی ہے

جو شخص اسلام لاتا ہے (یعنی مسلمان ہوتا ہے) وہ ایک معاہدہ پر دستخط کرتا ہے جس میں وہ اقرار کرتا ہے کہ اس نے اپنا مال اور جان سب خدا کے ہاتھ بیچ دیئے ہیں بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (۹/۱۱۱) اور خدا اس کے عوض انہیں جنت عطا کر لے گا وعدہ کرتا ہے۔ اس معاہدہ کی رو سے ان لوگوں کی کیفیت یہ ہوتی ہے۔ يَفْعَلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ تَف (۹/۱۱۱) وہ عند الضرورت خدا کی راہ میں لڑنے کے لئے میدانِ جنگ میں اتر آتے ہیں، پھر یا تو فاتح و منصور لوٹتے ہیں یا اپنی جان دے دیتے ہیں۔ اس طرح انہیں جنت حاصل ہوتی ہے۔ اسی کو اس سے ذرا پہلے جَاهِدْ ذَا بَاْمُوْا لَهُمْ وَاَنْفُسُهُمْ سے تعبیر کیا گیا ہے (۹/۸۸)۔ یعنی اپنے مال اور جان سے، اس مقصد کے حصول کے لئے مصروفِ سعی و عمل رہنے والے (نیز ۱۱-۶۱/۱۲)۔ اسی لئے ان لوگوں سے جو اپنے معیاروں کے مطابق جنت کے دعویدار بنتے ہیں، واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ جنت یوں پیٹھے بٹھائے نہیں مل جایا کرتی۔ اس کے لئے

بڑے بڑے صبر آزما اور ہمت شکن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے (۳/۱۴۱: ۲/۲۱۴)۔ جو ان جانکاہ مراحل میں ثابت قدم رہے وہ نجات جنت سے ہمکنار ہوتا ہے (۴-۱۴۶/۶)۔ اس کے لئے وہ سب کچھ چھوڑنا پڑتا ہے جسے چھوڑ دینے کی ضرورت لاحق ہو، حتیٰ کہ اپنا گھر بار تک بھی۔ اور ہر قسم کی اذیت کو خندہ پیشانی سے برداشت کرنا ہوتا ہے (۳/۱۹۴)۔ ایمان اور اس کے ساتھ استقامت، یہ حصول جنت کے لئے لازمی شرائط ہیں۔ اس دنیا کی جنت کے لئے بھی اور آخروی جنت کے لئے بھی (۳۱/۳۰: ۱۳-۱۴/۱۴)۔ اس کا عملی طریق یہ ہے کہ اس نظام کی اطاعت کی جائے جسے قوانین خداوندی کے مطابق سب سے پہلے حضور نبی اکرمؐ نے قائم فرمایا اور آپ کے بعد آپ کے متبعین نے اسے جاری رکھا (اور جو اسے بار دیگر متشکل کریں) اسے "خدا و رسول" کی اطاعت کہا جاتا ہے جو حصول جنت کے لئے بنیادی شرط ہے (۴۸/۱۷: ۴/۱۳)۔ لہذا، حصول جنت، انفرادی چیز نہیں، یہ ایک اجتماعی پروگرام ہے جس کے لئے ایک جماعت کی تشکیل ضروری ہے۔ اسی لئے کہا گیا کہ فَادْخُلْنِيْ رَفِیْ عَبْدِیْ مَیْ ذٰ ذَا دْخُلْنِيْ جَنَّتِیْ (۲۹۱-۸۹/۳۰) میرے بندوں میں شامل ہو جاؤ اور (یوں) جنت میں داخل ہو جاؤ۔ "اس کے بندوں میں شامل ہونے" کے لئے ضروری ہے کہ انسان ذاتی مفادات سے بلند ہو جائے اور اپنے جذبات کو قوانین خداوندی کے تابع رکھے (۴۰-۶۹/۴۱)۔ اس راہ میں اگر کہیں غلط قدم اٹھ جائے تو اس سے فوراً پیچھے ہٹ کر صحیح راستہ پر آجائے۔ اسے توبہ کہتے ہیں (۶۶/۸)۔ یہ ہیں وہ لوگ جو اپنے دعوئے ایمان میں پتے ہوتے ہیں اور یہی جنت کے مستحق قرار پاتے ہیں (۵۵/۱۱۹)۔ اس لئے کہ اس پروگرام سے ان کی ذات اس قدر نشوونما حاصل کر لیتی ہے جس سے وہ اس زندگی سے اگلی زندگی کے ارتقائی مراحل طے کرنے کے قابل ہو جاتی ہے۔ تزکیہ نفس سے یہی مراد ہے۔ یہ خالق ہوں میں حاصل نہیں ہوتا، جتنی معاشرہ میں حاصل ہوتا ہے (۲۶/۷۶)۔ یہی وہ معاشرہ تھا جسے نبی اکرمؐ اور آپ کے رفقاء نے جہد مسلسل سے قائم کیا تھا (۹/۱۰۰)۔ یہ لوگ ان لوگوں کو دوست نہیں رکھتے تھے جو نظام خداوندی کی مخالفت کرتے تھے (۵۸/۲۲)۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے اصحاب رسولؐ (مہاجرین و انصار اور ان کا اتباع کرنے والوں) کے متعلق خصوصیت سے کہا کہ اہل البخت ہیں (۹/۱۰۰)۔

عالمگیر انسانیت کے لئے جنت

اس جنت کے دروازے تمام انسانوں کے لئے یکساں طور پر کھلے ہیں جو کبھی اس جماعت مؤمنین

کے زمرے میں شامل ہو گیا، جنت کا مستحق بن گیا خواہ وہ پیدائش یا سابقہ مذہب کے اعتبار سے کوئی بھی ہو۔ سورہ بقرہ میں ہے وَ قَالُوا لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَن كَانَ هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ تِلْكَ أَمَانِيُّهُمْ (۲/۱۱۱) یہ کہتے ہیں کہ جنت میں صرف یہودی اور نصاریٰ داخل ہو سکیں گے، یہ ان کی خوش فہمی ہے جس کی ان کے پاس کوئی سند و دلیل نہیں۔ بلی، بات یوں نہیں جس طرح یہ کہتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ مَن أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَ هُوَ مُّحْسِنٌ فَلَهُ أَجْرُهُ عِنْدَ رَبِّهِ وَ لَا تَخَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُونَ (۲/۱۱۲) جو شخص بھی اپنے آپ کو قوانین خداوندی کے سامنے جھکا دے اور حسن کارنامہ انداز کے (قرآن کے مطابق) زندگی بسر کرے اس کا اجر اس کے رب کے ہاں سے ضرور ملے گا۔ ان لوگوں پر نہ خوف ہوگا نہ حزن۔ یہ دعوتِ اہل کتاب اور غیر اہل کتاب سب کے لئے عام تھی (اور عام ہے) (۵/۸۵ : ۵/۶۵)۔

مردوں اور عورتوں سب کے لئے جنت

اور اس میں مردوں اور عورتوں کی بھی کوئی تخصیص نہیں، جنت کے دروازے ان سب کے لئے یکساں طور پر کھلے ہیں۔ وَ مَن يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ مِن ذَكَرٍ أَوْ اُنْثَىٰ وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا يَخَافُ يُدْخَلُونَ الْجَنَّةَ وَ لَا يُظْلَمُونَ نَقِيرًا (۴/۱۲۳) (۴/۱۲۳) جو بھی عملِ صالح کرے اور وہ مومن ہو۔ خواہ مرد ہو یا عورت۔ وہ جنت میں داخل ہوں گے اور ان کے اعمال کے نتائج میں ذرہ برابر بھی کمی نہیں کی جائے گی۔ جنت کا وعدہ مومنین اور مومنات دونوں سے ہے (۴۸/۵ : ۹/۷۲)۔ دونوں کے لئے ارتقاء کی راہیں یکساں طور پر کشادہ اور روشن ہیں (۵۴/۱۲)۔

یہی وہ جنت ہے جس کی آرزو ہر مومن کے دل میں پھلتی ہے۔ حتیٰ کہ حضراتِ انبیائے کرام کے قلبِ مطہر میں بھی (۲۶/۸۵) اور غلط ماحول میں گھرے ہوئے اربابِ ایمان کے دل میں بھی (۶۶/۱۱)۔

متفرقات

(۱) جو شرک کرتا ہے۔ یعنی خدا کے ساتھ اور قوتوں کو بھی صاحبِ اقتدار مانتا اور ان کے قوانین کی اطاعت کرتا ہے۔ (اور اس حالت میں دنیا سے چلا جاتا ہے) اس پر جنت حرام ہو جاتی ہے (۵/۷۲)۔

(۲) جو لوگ زبان سے قوانینِ خداوندی کی صداقت کا اقرار کرتے ہیں لیکن عملاً ان کی تکذیب کرتے ہیں۔ نیز وہ جو ان سے سرکشی برتتے ہیں، جنت میں نہیں جاسکتے (۴/۴۰)۔

(۳) انسان دو ہی گروہوں میں تقسیم ہوتے ہیں۔ ایک جنت کا مستحق، دوسرا مستوجبِ جہنم (۴۲/۴۱) اور یہ دونوں گروہ کبھی ایک جیسے نہیں ہو سکتے (۵۹/۲۰)۔ اہل جنت کی زندگی کامیاب و کامران ہوتی ہے (۵۹/۲۰)؛ یہ بہت بڑی (ACHIEVEMENT) ہے۔ یعنی جنت صرف عذاب سے محفوظ رہنے کا نام نہیں جسے نجات کہتے ہیں یہ تو ایک منفی خصوصیت ہوتی ہے۔ جنت، مثبت طور پر بہترین نتائج حاصل کرنے کا نام ہے۔ یہ موجودہ زندگی سے بہتر زندگی گزارنا اور جو کچھ انسان اس وقت ہے، اس سے بہتر بن جانا ہے۔ یہ موجودہ سطح زندگی سے بلند سطح پر پہنچ جانا ہے۔

(۴) اہل جنت اور اہل جہنم کے درمیان بس ایک پردہ ساحل ہوتا ہے۔ یعنی قلبی کیفیت اور انسانی ذات کی تفریق کا پردہ۔ (۴/۴۶)۔ یہ ایک ایسی دیوار ہوتی ہے جس کے اندر کی طرف رحمت ہوتی ہے اور باہر عذاب (۵۴/۱۳)۔

(۵) قرآن کریم میں اہل جنت اور اہل جہنم کے باہمی مکالمات کا بھی ذکر آیا ہے اس کی تفصیل ”جہنم“ کے عنوان میں گذر چکی ہے۔ (دیکھئے ۴۴/۵۰، ۵۰/۵۱، ۵۱/۵۲، ۵۲/۵۳، ۵۳/۵۴، ۵۴/۵۵، ۵۵/۵۶، ۵۶/۵۷، ۵۷/۵۸، ۵۸/۵۹، ۵۹/۶۰، ۶۰/۶۱، ۶۱/۶۲، ۶۲/۶۳، ۶۳/۶۴، ۶۴/۶۵، ۶۵/۶۶، ۶۶/۶۷، ۶۷/۶۸، ۶۸/۶۹، ۶۹/۷۰، ۷۰/۷۱، ۷۱/۷۲، ۷۲/۷۳، ۷۳/۷۴، ۷۴/۷۵، ۷۵/۷۶، ۷۶/۷۷، ۷۷/۷۸، ۷۸/۷۹، ۷۹/۸۰، ۸۰/۸۱، ۸۱/۸۲، ۸۲/۸۳، ۸۳/۸۴، ۸۴/۸۵، ۸۵/۸۶، ۸۶/۸۷، ۸۷/۸۸، ۸۸/۸۹، ۸۹/۹۰، ۹۰/۹۱، ۹۱/۹۲، ۹۲/۹۳، ۹۳/۹۴، ۹۴/۹۵، ۹۵/۹۶، ۹۶/۹۷، ۹۷/۹۸، ۹۸/۹۹، ۹۹/۱۰۰)۔



اَبَدی جَنّت

ایک جنت ”آدم“ کی تھی جو اس کے اپنے کاموں (اعمال) کا نتیجہ نہیں تھی۔ محض فطرت کی بخشش تھی۔ نتیجہ یہ کہ آدم سے ایک لغزش ہوئی اور وہ وہاں سے نکال دیا گیا۔ اور ایک جنت وہ ہے جسے ابن آدم اپنے خونِ جگر کے عوض خریدتا ہے (یعنی وہ اس کے اپنے حسنِ عمل کا فطری نتیجہ ہوتی ہے)۔ اس سے اُسے کوئی نہیں نکال سکتا۔ وَمَا هُمْ بِمُخْرِجِينَ ۝ (۱۵/۳۸) وہ وہاں سے نکالے نہیں جائیں گے۔ یہ فرق ہے ”بخشش کے طور پر ملی ہوئی جنت“ اور اپنی محنت سے حاصل کردہ جنت میں۔ اقبالؔ کے (شوخی) الفاظ میں:

آں بہشتے کہ خدائے بتو بخشد ہمہ بیچ

تاجزائے عمل تست جنان چیزے بہشت

کوئی شخص انسان کی صحت، قابلیت، صلاحیت کو اس سے چھین نہیں سکتا۔ وہ خود ہی اسے ضائع کر دے تو اور بات ہے۔ جو کچھ ”انسان کا ہے“ اسے دوسرا چھین سکتا یا نقصان پہنچا سکتا ہے۔ جو کچھ انسان خود ہے اسے نہ کوئی دوسرا نقصان پہنچا سکتا ہے نہ اس سے چھین سکتا ہے۔ انسان جو کچھ خود ہے اس کا نام جسم اور جنت ہے۔ اس لئے اس طرح حاصل کردہ جنت سے انسان کو کوئی نکال نہیں سکتا۔ اسی لئے کہا کہ ابنِ جنت اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ خَالِدِينَ فِيهَا اَبَدًا ۝ (۹۸/۸) وَعَدَ اللّٰهُ حَقًّا ۚ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيلًا ۝ (۳/۱۲۲) یہ خدا کا پکا اور سچا وعدہ ہے اور خدا سے زیادہ بات کا سچا کون ہو سکتا ہے؟ وہ اَجْرٌ غَيْرُ مَسْنُونٍ ہے (۱۴۱/۸ : ۸۴/۲۵ : ۹۵/۶)۔ یعنی جو کبھی منقطع نہ ہو۔ نہ وہ خود وہاں سے لکنا چاہیں گے۔

اور نہ ہی وہاں کسی کو موت آئے گی (۵۸ - ۵۹/۵۹ : ۶۴/۵۹)۔

یہ تو اہل جنت کے متعلق ہے کہ وہ وہاں سے نکالے نہیں جائیں گے۔ خود جنت کے متعلق بھی کہا گیا کہ اس کی بہاریں ابدیت و رکنا رہیں۔ قرآن کریم میں جنت کی ادلیں خصوصیت یہ بتائی ہے کہ تَجْرِی مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ (۲/۲۵) 'باغ' پانی نہ ملنے کی وجہ سے خشک ہوتا ہے۔ جس باغ کے درختوں کے نیچے آبِ رواں ہر وقت موجود رہے اس کی تازگی اور شادابی میں کبھی فرق نہیں آسکتا۔ یہ تو وہاں کے درختوں کی سد بہار و تازگی کا عالم ہوگا۔ ان درختوں کے پھلوں کے متعلق کہا کہ اُكْلُهَا ذَائِمٌ وَ ظِلُّهَا (۱۳/۳۵) وہ موسموں کی تبدیلی کے اثرات سے نا آشنا ہوں گے اس لئے ہر موسم میں پھل دیتے چلے جائیں گے۔ (نیز ۱۳/۳۵)۔ اعمالِ انسانی کے یہ وہ بلند و بالا اشجارِ طیب ہیں جن کی جڑیں پائال میں ہیں اور ان کی شاخیں آسمان کو چھو رہی ہیں (۱۴/۲۴)۔ اس لئے اہل جنت کے رزق میں نہ کبھی تاغ ہوگا نہ اس میں کمی واقع ہوگی (۱۹/۶۲ : ۲۸/۵۴)۔ فَالْكَفَىٰ كَثِيرٌ ۚ لَا مَقْطُوعَةٍ وَلَا مَمْنُوعَةٍ ۚ الْكَثْرَتُ لَكُمْ ۚ (۵۶/۳۳ - ۳۲) بکثرت پھل جن میں نہ تو خود انقطاع ہو اور نہ ہی ان سے کوئی رد کے۔

ابدیتِ جنت کے مراد

لیکن جیسا کہ سابقہ عنوان میں وضاحت سے بتایا گیا ہے 'آخری زندگی کی ابدیت' خدا کی ابدیت جیسی لامنتہی نہیں۔ لامتناہیت تو صرف ذاتِ باری تعالیٰ کے لئے ہے کہ هُوَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرَةُ اسی لئے جنت کے متعلق بھی کہا کہ

خَالِدِينَ فِيهَا مَا دَامَتِ السَّمُوتُ وَالْأَرْضُ إِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ ۗ عَطَاءٌ غَيْرٌ مَجْذُوذٍ ۝ (۱۱/۱۰۸)

اہل جنت اس میں رہیں گے جب تک ارض و سما کا سلسلہ قائم ہے۔ بالضرور ایسا ہی ہوگا۔ یہ خدا کا عطیہ ایسا ہے جو کبھی ختم نہ ہوگا۔

یہی الفاظ جہنم کے متعلق بھی آئے ہیں (۱۱/۱۰۶)۔ لیکن آخری الفاظ (عَطَاءٌ غَيْرٌ مَجْذُوذٍ) اُس سلسلہ میں نہیں کہے گئے۔ اس سے ایک اور حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے اور وہ یہ کہ

لہ قرآن کریم میں یہ الفاظ بے شمار مقامات پر آتے ہیں۔

جنت بھی مقامِ راہ ہے۔ منتہی نہیں

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، زندگی اپنے ارتقائی مراحل طے کرتی، پیکرِ انسانیت تک پہنچی ہے۔ اس کے بعد اس نے مزید ارتقائی مراحل طے کرنے ہیں۔ اب یہ ارتقاء انسانی ذات کا ہوگا۔ جس شخص کی ذات اس قدر نشوونما حاصل کر چکی ہوگی کہ وہ اس زندگی سے اگلی منزل میں پہنچنے کے قابل قرار پا جائے اس کے متعلق کہا جائے گا کہ وہ جنت میں داخل ہو گیا (جس میں آگے بڑھنے کی صلاحیت نہیں ہوگی وہ رک جائے گا۔ اسے جہنم کی زندگی کہہ کر پکارا گیا ہے)۔ رُکنے والے تو ایک مقام پر رک جاتے ہیں، لیکن آگے بڑھنے والوں کے لئے میدان وسیع ہوگا۔ اس لئے اہل جنت کے لئے مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے مواقع ہوں گے۔ یہ وجہ ہے کہ اہل جنت کے مختلف مدارج بتائے گئے ہیں۔ وَالشَّيْقُونَ الشَّيْقُونَ ۝ اُولَٰئِكَ الْمُقَرَّبُونَ (۱۰۱-۵۶/۱۱) سب سے آگے سب سے زیادہ مقرب۔ ان کے بعد اصْطَبُ الْيَمِينِ (۵۶/۲۷) اربابِ یمن و سعادت صفا دوم میں۔

پھر اہل جنت کے متعلق کہا گیا کہ نُورُهُمْ يَسْعَىٰ بَيْنَ اَيْدِيهِمْ وَ بَايَمَانِهِمْ يُقَوُّوْنَ رَبَّنَا اَتِمِّمْ لَنَا نُورَنَا وَ اغْفِرْ لَنَا ۝ (۶۶/۸) (۵۷/۱۹) ان (کی پیشانی) کا نور ان کے آگے آگے اور دائیں (بائیں) ان کے راستے روشن کئے جا رہا ہوگا اور ان کی آرزو یہ ہوگی کہ ان کا نور تکمیل تک پہنچ جائے۔ انہیں خدا کی طرف سے جنات کی خوشخبری دی جائے گی (۵۷/۱۲)۔ یہاں جنت (واحد) کی جگہ جنات (جمع) کا لفظ آیا ہے۔ اہل جنت کے حسنِ عمل کا نور ان کے راستے روشن کرتا جائے گا اور اس طرح وہ ایک جنت سے آگے بڑھ کر دوسری جنت میں پہنچ جائیں گے۔ سورۃ زمر میں ہے۔ لَهُمْ عُرُفٌ مِّنْ فَوْقِهَا عُرُفٌ مُّبْنِيَةٌ ۚ تَجْرِي مِّنْ تَحْتِهَا الْاَنْهَارُ وَ عَدَّ اللّٰهُ ۙ لَا يُغْنِي عَنْهُ اللّٰهُ اَلْمِيعَادَ ۝ (۳۹/۲۰) ان کے لئے عرف بالائے عرف ہوگا۔ عرف کا لفظ بڑا وسیع المعنی ہے۔ اس میں رفتار کی تیزی، ندی میں پانی کی کثرت اور روانی اور بالاخانہ کے اوپر بالاخانہ کی بلندی سب آجاتی ہے۔ لہذا اہل جنت کے متعلق کہا کہ ان کے لئے زندگی کی کشادگیاں اور فردانیاں، سر بلندیاں اور سرفرازیاں اور مدارج بالائے مدارج ہیں۔ وہ جوں جوں ارتقائی منازل طے کرتے جائیں گے ان کا مقام بند سے بلند تر ہوتا جائے گا۔ لہذا جنت کی زندگی جمود اور تعطل کی زندگی نہیں۔ وہ خود ایک میدانِ عمل ہے اس فرق کے ساتھ کہ اس دنیا کی (جہنم کی) زندگی میں انسان کی ساری

قوانین اور صلاحیتیں، جسم کے لئے سامانِ پرورش کے حصول کی تذر ہو جاتی ہیں۔ جنت کی زندگی میں انسان اس طرف سے یکسر مطمئن اور مومن ہوگا، اس لئے اس کی ساری صلاحیتیں، انسانی زندگی کے ارتقاء کی کوششوں میں صرف ہوں گی۔ کارگہ حیات کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے کہ

لَمَنْ شَاءَ مِنْكُمْ أَنْ يَتَّقِدَ مَا أَوْيَتَ آخِرَهُ (۴۷/۳۷)

یہ جہانِ عمل ہے جس میں انسان کو مختلف صلاحیتیں دے کر چھوڑ دیا گیا ہے کہ ”جس کا جی چاہے آگے بڑھ جائے، جس کا جی چاہے پیچھے رہ جائے“ اور جنتِ اخروی کے سلسلہ میں کہا گیا ہے کہ

وَفِي ذَلِكَ فَلَيْتَنَّ نَاسٍ الُمْتَنَّنَا فِئُؤَنَ ۙ (۸۳/۲۶)

جس کے دل میں آگے بڑھنے کا جذبہ ہے، وہ اس میں آگے بڑھے۔

یوں انسانی زندگی آگے بڑھتی — اور آگے بڑھتی — اور طبقاً طبقاً بلند ہوتی چلی جائے گی (۸۳/۱۹)۔ اس کا غتہی کیا ہوگا، ہم نہیں کہہ سکتے — نہ ہی شعور کی موجودہ سطح پر ہم اس کا ادراک ہی کر سکتے ہیں۔ لیکن اس کی ابتدا اسی موجودہ زندگی سے ہوگی۔ خوش بخت ہیں وہ جو اس نادر موقعہ کو غنیمت سمجھیں اور اپنے قصرِ جنت کی بنیاد کی اینٹ اپنے حسنِ عمل کے ہاتھوں، بلا توقف و بلا تاخیر رکھ دیں کہ یہ موقعہ دوبارہ ہاتھ نہیں آئے گا اور اس حقیقت کو کبھی فراموش نہ کریں کہ اُخروی زندگی اسی کی سنورے گی جس کی اس دنیا کی زندگی سنوری ہوئی ہوگی۔ وَ مَنْ كَانَ فِي هَذِهِ اَعْلٰی فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْلٰی وَ اَصْلٰی سَبِيْلًا ۙ (۱۷/۷۲) جو یہاں اندھا ہوگا وہ وہاں بھی اندھا ہی ہوگا، بلکہ اس سے بھی گیا گذرا۔

وہ کل کے غم و عیش پہ کچھ حق نہیں کہتا جو آج خود افروز و جگر سوز نہیں ہے
وہ قوم نہیں لائق ہنگامہ فردا جس قوم کی تقدیر میں امر و ز نہیں ہے